



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

**DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY**

JAMIA MILLIA ISLAMIA  
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

**CALL NO.**

**Accession No.**

Call No.....

Acc.No.....

1





قیمت ۸۰۰



# تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

<b>نگارستان</b> حضرت نیاز فتحپوری کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں ان کی زندگی و خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس کتاب میں ان کی شخصیت کا ایک خوبصورت خاکہ ملتا ہے۔	<b>گہوارہ تمدن</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>شہاب کی سرگزشت</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی زندگی کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>فرست الید</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>شاعر کا انجام</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>جذبات بھاشا</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔
--	---	--	---	---	---

<b>صحایات</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>انقلاب ٹھکانے بعد</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>مذاکرات نیاز</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>فلاسفہ قدیم</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>تاریخ الدولتین</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>المسئلۃ الشرعیہ</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔
--	---	--	---	--	---

<b>تذکرہ خندہ گل</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔	<b>فراسط الشعر مرکب</b> اس کتاب میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی بیان ہے۔ اس میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔
---	---	--

# نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے  
 رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ہر سالہ مفت نہ روانہ ہوگا  
 سالانہ قیمت پانچ روپیہ (دھڑ) سٹشٹا ہی تین روپیہ (سے)۔  
 بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

جلد ۲۵	فہرست مضامین فروری ۱۹۳۶ء	شمار
۲	ملاحظات	۲
۹	زبان اردو کے ارتقائی منازل	۹
۲۰	عبد المالك	۲۰
۲۰	حسن و عشق کی کشاکش	۲۰
۲۶	محمد اسحاق	۲۶
۲۶	انگریزوں کی آئینی آزادی	۲۶
۳۱	ڈاکٹر اس۔ ان جعفری بی۔ اے بیرسٹریٹ لا	۳۱
۳۱	تاریخ ہند کا ایک ورق	۳۱
۴۵	مشیر احمد علوی بی۔ اے	۴۵
۴۵	وحی کی حقیقت علمی نقطہ نظر سے	۴۵
۵۳	قاضی محمد عزیز عرفانی	۵۳
۵۳	کتوبات نیاز	۵۳
۵۹	باب الاستقار	۵۹
۵۹	باب المراسلہ والمناظرہ	۵۹
۶۱	باب الاستفسار	۶۱
۶۱	کسان دقلم	۶۱
۶۱	عملی اختر	۶۱
۶۸	معلومات	۶۸

## نگار

اڈیٹر:- نیتاز فتحپوری

جلد ۲۵	فروری ۱۹۳۲ء	شمار ۲
--------	-------------	--------

## ملاحظات

ما طفیل کم سواد و سبق فقہ ہائے دوست  
صد بار گفتہ و دگر از سر گرفتہ ایم

احتساب نفس —

جب غور کرتا ہوں کہ گزشتہ بارہ سال کے زمانہ میں جو نگار کی معیت میں بسر ہوا ہے، میں نے کیا کیا تو ایک طرف  
اپنی مساعی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

انچہ در مبد و فیاض بود آن من ست

لیکن جب دوسری طرف شاہرہ مقصود کا خیال آتا ہے تو بے اختیار بیدل کے یہ اشعار زبان پر آ جاتے ہیں :-

بحرِ چناب کہ آں گوہرِ نایاب کب است      چراغِ سرگشتہ کہ خورشیدِ جانا تاب کب است  
دیرِ زیں غصہ در آتشِ کچہ رنگِ ستِ صنم      کعبہ زیں در دسیہ پوشِ کعبہ کب است  
کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانی کوششوں کی حالت بالکل اُس خس و خاشاک کے اضطراب کی سی ہے جو طوفانی دریا کی بجز و شش  
موجوں پر بہلا چلا جا رہا ہو اور وہ کسی ایک جگہ ٹھہر کر سیلاب کی رفتار کا اندازہ کرنا چاہے۔ ہم سے سوال ہوتا ہے کہ کیا برت کا ڈھیلا جوہرِ آن  
گھلتا جا رہا ہے کوئی تعین اپنے وزن کی کر سکتا ہے۔ کیا بگولہ جو ریگستان میں ایک عفریت کی طرح دوڑتا نظر آتا ہے، اُن ذرات کے رقص  
کے علاوہ کچھ اور چیز ہے جو صرف پامالی و انتشار ہی کے لئے وضع ہوئے ہیں۔ یعنی  
اگر ایں ستِ گل تازہ کہ تو داری نیست  
بیلاں راز پر زبالی گراں تر قفسے

دورِ افق میں ایک سبز و شاداب پہاڑی کی رنگینیاں بے اختیار مل کر خنجر رہی ہیں، قدم بے مضطر بانہ اُٹھتے ہیں، لیکن شبِ رُو  
کی سہمی کے بعد جب ایک صبح وہاں ہم ٹھکے ہوئے پہنچے ہیں تو دفعۃً وہ پر وہ رنگین غائب ہو جاتا ہے اور بجائے ایک گلپوش قطعوں میں  
کے ایک بے آب و رنگ و میرِ تھوڑوں کا نظر آتا ہے۔ گرم ریگستان کی شدید گرمی میں حدِ نظر پر ایک حوضِ پانی سے لبریز دھوپ  
میں چمکتا ہوا نگاہوں کے سامنے آتا ہے، ہم اپنی تشنگی بجھانے کے لئے بیتابانہ اس طرف دوڑ پڑتے ہیں، لیکن جس دقت وہاں پہنچتے ہیں  
تو پانی کا چشمہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور ہم اسی جگہ ٹپ کر گر پڑتے ہیں۔

برسات کی تاریک، بھیاںک رات میں جبکہ نشانِ راہ معدوم ہو کر ہمارے لئے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی، دور ایک چراغ  
ٹٹماتا ہوا دکھائی دیتا ہے، ہم پانی سے شرابور کانپتے ہوئے وہاں پہنچتے ہیں، لیکن نہ وہاں کوئی چراغ موجود ہوتا ہے نہ کسی کسان کا  
جھوپڑا، دفعۃً بھلی کی چمک میں چاروں طرف پانی کی موجیں نظر آتی ہیں اور ہم مایوسانہ اسی جگہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔  
یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات و حوادث ہمارے سامنے پیش کر کے ہماری ہمتوں کو ضعیف اور ہماری کوششوں کو ناکارہ  
بنانے کی سہمی کی جاتی ہے، پھر ایک ایسا انسان جو ان ناکامیوں کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں ہوتا، یا تو فنا ہو جاتا ہے یا اگر اس میں تھوڑی  
سی کیفیتِ خودداری کی ہوتی ہے تو وہ ایک خاص نظریہ قائم کرتا ہے اور خطرات سے انتقام لینے کے لئے اس کے دُکھے ہوئے جی سے  
یہ صدا نکلتی ہے کہ

من از فریبِ عمارتِ گداشدم در نہ

ہزار گنجی بہ دیرانہ دل افتادست

در انجا ایک آج تک نہ کسی کے "دلِ ویراں" میں آج تک کوئی پنہاں خزانہ پایا گیا اور نہ اس سے کسی نے فائدہ اُٹھایا، جب تک  
پہلے کوئی شخص فریبِ عمارت میں مبتلا نہیں ہو گیا۔

اس لئے اگر میں اپنے مساعی کے مقابلہ میں نتائج پر غور کروں تو مجھے بھی یہی قشاقم پہلو اختیار کر کے ہمیشہ کے لئے گوشہ استزوا اختیار کر لینا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ جب میں اس حقیقت پر غور کرتا ہوں کہ کامیابی نام اس خیال کی تکمیل و انتہا کا نہیں ہے جو ایک شخص کی آرزو سے وابستہ ہوتا ہے، بلکہ وہ متعلق ہے نیز محض سے جو کسی فضا میں پیدا ہو جائے، تو مجھے سرور ہونا چاہئے کہ میں بڑی مددگار کامیاب ہوا اور مجھے اصولاً اپنے مساعی کو بدستور جاری رکھنا چاہئے، گو میں اسے فقدانِ ہمت، تقاضائے عمر یا دیگر افکار و حوادث کے وجہ سے جاری نہ رکھ سکوں۔

ہر چند نگار جس آواز کو لیکر منفعت شہود پر آیا وہ کوئی نئی آواز نہ تھی اور یقیناً دنیا میں کوئی صدائے نہیں ہوتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ حقیقت اس کی ابتدا ہوئی، وہ زمانہ تھا جب پچھلی آوازوں کی گونج بھی فضا میں باقی نہ تھی، اور ہندوستان کے مسلمان پھر اسی نیند میں مبتلا ہو گئے تھے جس سے انھیں بارہا جو بھکا یا جا چکا تھا اور چونک کر وہ پھر سو جاتے تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب سرزمین ہند میں نہضت و ارتقاء کا آثار رونما ہو رہے تھے، ایک خاص احساس کی ہر مختلف قوموں میں دوڑ چلی تھی اور غربت، فکر و ضمیر میں از سر نو جان پڑ رہی تھی۔ سوائے مسلمانوں کے قہنی قومیں تھیں وہ ملکی و وطنی آزادی کے ساتھ ساتھ ذہنی آزادی حاصل کرنے کے لئے بھی دوڑ پڑی تھیں اعداد ایک دور میں نکلا دیکھ سکتی تھی، ایک سوچنے والا دماغ سمجھ سکتا تھا کہ یہ سیلاب کہاں ختم ہو گا اور اس سے صرف وہی قوم جانبر ہو سکتی ہے جو خود بھی اپنے آپ کو اس طوفان میں ڈال کر ہاتھ پاؤں چلائے۔ لیکن مسلمان سو رہے تھے، اور صرف اس عقیدہ و یقین پر بے خیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے کہ ”دنیا مومنوں کے لئے قید خانہ ہے“ اور یہاں کی سرکات و برکات حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلا کر کون ”کافر“ بنے۔

مذہب کی غلط تعبیر نے اُن کے دل و دماغ پر نہر لگا دی تھی، اسلام کی صحیح تعلیم اور اسکی صحیح روح مفقود ہو جانے سے اُن پر جمود کی کیفیت طاری تھی، انسانیت و تمدن کے اصول کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا تھا، اخلاق و عمل کا حقیقی مفہوم وہ اور اود و ظالیف میں گم کر چکے تھے، خود اعتمادی کا کوسوں پتہ نہ تھا اور محض ”دُعائے گنج العرش“ کے سہارے وہ اپنا بیڑا پار کرنا چاہتے تھے جدید علوم و فنون کا اکتساب ان کے نزدیک گمراہی میں مبتلا ہونے کے مترادف تھا اور سائنس کا اعتراف گویا خدا کا انکار۔ اُن کے اعمال و حرکات، اُن کے اقوال و احوال، اُن کی تعلیم و تلقین، اُن کی تنگ و دو، الغرض اُن کی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں، صرف تقدیر کا فرما تھی اور تدبیر سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کی کتابیں، اُن کی تالیفات، اُن کے مدارس، اُن کے مواظبات و ارشادات سب اسی ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے، یہاں تک کہ جراید و رسائل جو علمی و ذہنی روشنی پھیلانے کے مدعی بلکہ رومنا ہو رہے تھے، وہ بھی اس باب میں خاموش تھے او سائیک افسانہ خواں سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت اس بزمِ خواب آلود میں نہ تھی۔

نگار نے گو ابتداً اجراء میں صراحتاً اس کا اعلان نہ کیا تھا کہ اس کا حقیقی مقصد کیا ہے، لیکن آخر کار یہ حقیقت لوگوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی کہ نگار نے ادب لطیف کے احیاء کے لئے ظہور میں آیا ہے اور نہ صرف ایسی باتیں کہنے کے لئے جسے عام لوگ پسند نہ کریں۔

اس نے علم و تحقیق اور تنقید و تنقیح کے لحاظ سے ہمیشہ وہ چیز پیش کی جو قدامت پرستی کو توڑنے والی تھی اور کبھی ایک لمحہ کے لئے اس کی پرواہ نہ کی کہ جمہور کے خیال و اعتقاد کا مقابلہ کوئی نفع کا سودا نہیں۔

نگار نے صرف دو دوس مسلمانوں کے سامنے پیش کئے ایک یہ کہ ان کو زمانہ کا ساتھ دینا چاہئے اور دوسرے یہ کہ مذہبی غلامی سے آزاد ہو کر عصبیت کی زنجیر کو توڑ کر ملک و وطن کی خدمت میں دوسری قوموں کے دوش بدوش ملکر کام کرنا چاہئے۔ پھر جو کچھ میں سمجھتا تھا کہ سب سے بڑا سنگ راہ جو ان کو دوسری قوموں سے ملنے نہیں دیتا، وہ مذہبی تعصب ہے اور اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین تھا اور ہے کہ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی وسعت نظر اور بلند اخلاق کے لحاظ سے تمام دنیا پر چھا جانے کا اہل ہے، اس لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ میں مسلمانوں کو بتاؤں ان کا صحیح مذہب کیا ہے اور جن باتوں کو وہ اصل دین و عین مذہب قرار دیتے ہیں، وہ صرف فروع میں داخل ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے کفر و اسلام، نبوت و رسالت، معجزہ و کرامات، بہشت و دوزخ، جزا و سزا سبھی سے بحث کرنا ضرور تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ میں کافر و مرتد بنایا جاتا، الحمد و دہر یہ کے لقب سے یاد کیا جاتا۔

پھر جو ہنگامہ اس سلسلہ میں میرے خلاف پیدا ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں لیکن جس چیز نے میری ہمت کو ضعیف نہیں ہونے دیا وہ صرف اس امر کا احساس ہے کہ باوجود اس تمام اختلافات کے نگار ایک جماعت کی ذہنیت بدلنے میں کامیاب ہو گیا ہو اور عصبیت کی گرفت ان پر بہت کچھ ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ ممکن ہے اس وقت یہ کامیابی غیر اہم سمجھی جائے، لیکن چونکہ آزادی کا تخم ایک بار بو دینے کے بعد بغیر بار آور ہوئے نہیں رہ سکتا، اس لئے مجھے مستقبل کی طرف سے اطمینان ہے اور پورا یقین رکھتا ہوں کہ ایک زمانہ آئے گا جب آج کی کہی ہوئی باتیں کل ایک ایک مسلمان کی زبان پر ہوں گی اور آخر کار وہ نقاب دور ہو کر رہیگا جو اسلام کے جمیل چہرہ پر مدعیان مذہب نے ڈال رکھا تھا۔

می گویم و بعد از من گویند بدستانہا

پھر جو زندگی میں مسلسل بارہ سال سے بسر کر رہا ہوں اور جس چیز کو میں اتنے زمانہ سے اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہوں، ظاہر ہے کہ اس کا چھوڑنا میرے بس کی بات نہیں، اس لئے میں ایک بار اور ہمیشہ کے لئے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو نگار کو صرف حکایات لطیف کے لئے وقت دیکھنا چاہتے ہیں، وہ مایوس ہو جائیں، وہ حضرات جو قصائد و نقوش کی رنگارنگی سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ نگار کو نہ دیکھیں اور وہ احباب جو عقل و ضمیر کی آزادی کو پسند نہیں کرتے وہ نگار کے مطالعہ کی تکلیف گوارا نہ کریں، کیونکہ نگار جب تک جاری ہے اسی اصول کے ساتھ جاری رہیگا جس کا اس وقت تک وہ پابند رہا ہے اور وہ ہمیشہ ہی یقین کرتا رہیگا کہ انسان کا اولین فرض ”انسانیت کی پرستش کرنا ہے اور اگر کوئی مذہب بنی نوع انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا، بلکہ صرف مراسم و ظواہر کو دین و ایمان قرار دیتا ہے تو وہ مذہب ہرگز پیروی کے قابل نہیں۔

اسی سلسلہ میں غالباً بعض کرنا بے محل نہ ہو گا کہ ہر چند نگار کی اشاعت کا تنہا مقصود وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا، لیکن اسی کے ساتھ جو عملی و ادبی خدمات اس نے گزشتہ بارہ سال میں انجام دی ہیں وہ بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں جتنی تاریخی، مباحث علمیہ، معلومات جدیدہ، تنقیدات عالیہ اور انشاء لطیف میں کوئی چیز ایسی تھی جو نگار نے بلند ترین معیار کیساتھ پیش نہیں کی۔ اس لئے وہ لوگ جو صرف ان چیزوں کے دلدادہ ہیں ان کو بھی نگار کی طرف سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ خصوصیات آئندہ بھی بہر حال قائم رہیں گی اور غالباً زیادہ تکمیل کے ساتھ۔

## زلزلہ کی تباہ کاریاں

حوادث طبیعی کے بعض مناظر اس درجہ عبرتناک ہوتے ہیں کہ انسان کی تمام حکمت فرمائیاں ان کے سامنے بچوں کا کھیل نظر آنے لگتی ہیں اور علم و عقل کی بیپارگی کا احساس ہم کو حیران و ششدر بنا دیتا ہے۔  
کلام مجید میں متعدد جگہ ایسے مناظر کے طرف توجہ دلائی گئی ہے۔  
درہ حج میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

فکاین من قریۃ اھلکناھا وھی ظالمۃ فی خاویۃ علیٰ عرشھا

یعنی بہت سی ایسی بستیاں ہیں جن کو ہم نے اُن کے ظلم کے وجہ سے ہلاک کر دیا اور وہ سرنگوں کر دی گئیں۔

سورہ نمل میں ایک جگہ اسی قسم کے منظر کا حال یوں بیان ہوتا ہے:-

فلک۔ بیوتہم خاویہ بما ظلمہم یعنی یہ کھنڈر ہیں اُن لوگوں کے جنہوں نے خود اپنے ظلم سے ان ویرانیوں کو دعوت دی۔

سورہ حاقہ میں قوم عاد کی ہلاکت کے متعلق فرمایا گیا ہے:-

واما عاد فاھلکوا بریح صرصۃ عاتیۃ..... فتوٰی القوم فیما صرعی کا نعمہ اعجاز نخل خاویۃ

یعنی جب قوم عاد کی ہلاکت کے لئے تیز و پر شور آندھی بھیجی گئی، تو لوگ اذدے منہ اس طرح مرے پڑے تھے گویا کہ کھوکھلے کھجوروں کے تنے پڑے ہوئے ہیں۔

سورہ کہف میں ایک جگہ پانی کے خشک ہو جانے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

یصبح ماءھا غورا

پھر مظہر پورا پختہ، جمال پورا اور مونگیر وغیرہ میں جو تباہیاں حال کے زلزلہ سے آئی ہیں کیا وہ کچھ اور تھیں۔ وہی ہیشمار

باتوں کی مساریاں، وہی ہزار ہا انسانوں کی تباہیاں اور وہی دربار گنگ کا زمیں کے اندر غائب ہو جانا۔ جنہوں نے ان

منظر کو دیکھا ہے اُن سے پوچھنے کہ کرب و بکا کا وہاں کیا عالم ہے اور انسانی لاشوں کو جیل کو کس طرح نوح نوح کر کھا رہے ہیں۔ لاکھوں کی دولت سمار شدہ مکانوں کے اندر وہی پڑی ہے، ہزاروں بچے یتیم، سیکڑوں عورتیں بیوہ اور نہ جانے کتنے مرد خاناں برباد ہو چکے ہیں۔

تو کیا یہ کوئی عذاب اتنی تھا جو صوبہ بہار پر نازل ہوا۔ کیا کوئی قہر خداوندی تھا جس نے اس صوبہ کے باشندوں کو تباہ کیا اور کیا تباہ شدہ بستیاں ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ گنہگار انسانوں کی آبادیاں تھیں جن کو الٹ کر معدوم کر دیا گیا؟

مرنے والوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی۔ جوان بھی تھے اور معصوم بچے بھی ضحیف مرد بھی تھے اور بہت سی نیک بیویاں بھی۔ پھر یہ کیسا انصاف ہے، کیسا عدل ہے، کس طرح کا انتقام ہے، کس نوع کا قہر و غضب ہے، کس انداز کی برہمی ہے۔۔۔۔۔ اہل مذاہب سے پوچھئے تو وہ اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہ دے سکیں گے کہ خدا افعال مطلق ہے، بے نیاز ہے، اور وہ کسی طرح مسئول نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ وہ لوگ جو ایسے مظاہر کو صرف حوادث طبعی سے منسوب کرتے ہیں، وہ بھی یہی کہیں گے لیکن فرق یہ ہے کہ مذہبی تاویل ہمارے اخلاق پر موثر ہوتی ہے اور ملکی توجیہ کوئی اثر اس قسم کا پیدا نہیں کرتی۔

اب غور کیجئے کہ ان واقعات فجاجی سے ہمارے اخلاق مذہبی پر کیا اثر پڑنا چاہئے؟ ہندوؤں نے ہون کر کے دیکھ لیا لیکن یہ مصیبت اُن کے سر سے نہ ٹپکی، مسلمانوں نے مسجدوں میں گر کر خدا سے التجائیں کیں، لیکن وہ تباہ ہونے سے نہ بچے۔ پھر اس سے بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ خدا کے نزدیک تفریق مذاہب کوئی معنی نہیں رکھتی اور اس کی نگاہ میں سب ایک ہیں، نہ اس کا رحم و کرم کسی مسلمان کی جستجو کرتا ہے اور نہ اس کا قہر و غضب غیر مسلموں کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی ذات تاثر و افعال سے بند، جذبہ تفریق و امتیاز سے ارفع اور اصول نیایش و عبادت کے احساس سے بے نیاز ہے۔

مسلمان لاکھ کہا کریں کہ خدا صرف انھیں کا ہے اور انھیں کی نجات اس کا مقصود ہے، ہندو ہزار کہیں کہ انھیں کا مذہب پوتر ہے اور باقی سب گمراہ ہیں، خدا ان مفعومات و مفروضات کا پابند نہیں ہے۔ اور یہ شرک و اسلام کے جھگڑے صرف ہماری خود غرضیوں کے مظاہر ہیں جن سے خدا کو کوئی تعلق نہیں۔

پس سوچو اور سمجھو کہ صحیح راستہ وہی ہے جو آپس میں محبت کرنا بتاتا ہے اور انسانوں میں صرف اس لئے پھوٹ نہیں ڈالتا کہ ایک کے گلے میں زنا رہے اور دوسرے کے ہاتھ میں سیسج۔

جو سخن کفر و ایمان کے ہاں

خود سخن در کفر و ایمان می رود



**گوالیار کی بزم ادب** | یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی نے شکر دگوہیار میں ایک بزم اُردو قائم کر رکھی ہے جو عرصہ سے زبان کی خاموش خدمت انجام دے رہی ہے۔

اسکی ماہانہ صحبتیں بھی برپا ہوتی ہیں اور سالانہ جلسے بھی ادا ہوا ملک کو بھی دعوت دی جاتی ہے اور فضلا و وطن کو بھی کسی نہ کسی طرح کھینچ کر بلایا جاتا ہے۔ الغرض ایک ادبی انجمن کے جتنے فرائض ہیں وہ بوجہ احسن انجام دے جاتے ہیں اور سال میں دو چار دن عجیب لطیف دلچسپی کی گھاٹتیں ہیں۔ اس سال بھی یہ احتفال سالانہ فردری کی ۲۶، ۲۷، ۲۸ کو گوالیار میں منعقد ہونے والا ہے اور وہ تمام قوتیں جو گزشتہ جلسوں کے کامیابی کیلئے علیحدہ علیحدہ صحت کی گئی تھیں اب یکجائی طور پر اس جلسہ کو کامیاب بنانے کے لئے وقت کر دی گئی ہیں اور اُس نظم و اہتمام کو دیکھتے ہوئے جو ڈاکٹر صاحب موصوف کے پیش نظر کو یکجا طور پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ شاید ہی ہندوستان میں کوئی ادبی جلسہ سدرجہ پر لطف و مکمل اس سے قبل منعقد ہوا ہو۔ ہندوستان کا کوئی ادیب و شاعر کوئی صاحب علم و فضل ایسا نہیں ہے دعوت نہ دی گئی ہو اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہو کہ ان میں سے اکثر نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس سے قبل بزم کے طرف سے ملک میں دعوت نامے شائع کئے گئے تھے لیکن بعض اسباب کی بنا پر تا بیچ ملتوی کرنا پڑی جسکی اطلاع تمام حضرات کو دید گئی۔ اب فردری کی یہ تاریخیں چونکہ یقینی طور پر متعین ہو چکی ہیں اسلئے بزم اُردو کے طرف سے پھر نوید شائع کئے جا رہے ہیں جو نگار کی اشاعت سے قبل غالباً تمام حضرات کے ہاتھوں میں ہوں گے۔

ڈاکٹر اقبال، سر تاجی بہادر سپرد، سر عبدالقادر سر اس مسعود، نواب نصیر حسین خیال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی وغیرہ تمام اکابر نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہے اور پنجاب دیوبند، بنگال و بہار سی بی و کن وغیرہ کے اکثر ارباب علم و ادب نے، اس میں عملی حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

علاوہ اس کے سب سے زیادہ خصوصیت جو اس سے قبل کسی انجمن کو حاصل نہیں ہوئی وہ یہ ہے کہ عالیجناب ہمارا کمر کشن بہادر باقاعظم صدر اعظم دولت آصفیہ کو صدارت کے لئے تجویز کیا گیا ہے اور ایک وفد میرزا باچارہ ہے تاکہ باقاعدہ دعوت نامے کو پیش کر کے شرکت منظور کی حاصل کرے۔ میں بھی اس وفد کے مصیبت میں ۲۷ جنوری کو گوالیار کو حیدر آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ صدارت کے لئے یہ انتخاب نہ صرف اس لحاظ سے موزوں و بر محل ہے کہ اس وقت دولت آصفیہ کن جامہ عثمانیہ کے قیام سے سب سے بڑی خدمت اُردو کی انجام دے رہی ہے، بلکہ خود سر ہمارا کمر کشن بہادر کی خدمات اُردو زبان کے متعلق اسد جگر انقدر اور اتنی اہم ہیں کہ ان کے اعزاز پر ہر شخص مجبور ہے۔ اس کے ساتھ یہ خبر بھی غالباً مسرت سے سنی جائے گی کہ استقبالیہ کمیٹی کی صدارت جناب کرنل کمر صاحب نے قبول فرمائی ہے جو بین الاقوامی شہرت رکھنے والے لوگوں میں سے ہیں اور جو خود اُردو زبان سے بہت شغف رکھتے ہیں جناب سر وادار آگرتے صاحب بھی جو گوالیار میں براؤنٹ سکرٹری کی اہم خدمت پر امور ہیں ذاتی طور پر اسقدر دلچسپی لے رہے ہیں کہ بعض دعوت نامے خود ان کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ الغرض بزم اُردو کا یہ جلسہ کوئی معمولی جلسہ نہیں ہے جسے صرف ارکان بزم ہی مدعو کرنا چاہتے ہیں بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ غیر سرکاری طور پر خود ریاست گوالیار دعوت دے رہی ہے اور اس لئے ہی خواہاں اُردو کو غور کرنا چاہئے کہ ان حالات میں اُن کی شرکت ضرورت و مصلحت کے لحاظ سے قدرتنا کمزور ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اکابر بن کو کسی فرد کو اشت کے بنا پر دعوت نامہ نہ پہنچے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بزم اُردو ان کی شرکت آدرسی کی منتہی نہیں اس لئے آپ خود بغیر رسمی رقعہ کا انتظار کئے ہوئے براہ راست سکرٹری بزم اُردو و لشکر کو اطلاع دیجئے کہ آپ کس وقت دہلی پہنچیں گے تاکہ آپ کا استقبال کیا جائے۔ ممکن ہے کہ بعض ایسے حضرات جو مدعو کئے گئے ہوں اپنی اقتصادی حیثیت کی وجہ سے شرکت نہ فرما سکیں، اس لئے یہاں یہ ظاہر کر دینا ہے محل نہ ہو گا کہ ایسے احباب کے لئے "بزم اُردو" کے طرف سے ان کے مصارف اُردو کا حقیرانہ پیش کر دیا جائے گا اور اُمید ہے کہ وہ اسے قبول فرمائیں گے۔ اب آخر میں مجھے ایک مشورہ بھی دینا ہے اور وہ یہ کہ جو حضرات تشریف لائیں وہ بیچ کر آئیں کہ اُردو کی خدمت ان کو انجام دینا ہے اور اس لئے کوئی نہ کوئی "پیام" مٹانا ان کے لئے ضروری ہے کہ کوشش کی جا رہی ہے کہ صدر کے جلوس استقبال اور جلسہ کے مختلف نشستوں کا نظم بھی طیار کیا جائے۔ امید ہے کہ میرے احباب اور نگار کے جملہ علمی و ادبیین شرکت کی زحمت کو افرامیں گے اور مجھے موقع دیں گے کہ میں گوالیار میں ان کا خیر مقدم کروں۔

# زبان اردو کے ارتقائی منازل

آج ہمیں اس اہم مسئلہ پر بحث کرنی ہے کہ آیا اردو مسلمانوں کی زبان ہے یا عام ہندوستانیوں کی، اور اس کی تخلیق و تدوین میں صرف اہل اسلام نے حصہ لیا ہے، یا براہِ ران وطن نے بھی، مگر قبل اس کے کہ اصل موضوع پر روشنی ڈالی جائے، یہ بتادینا ضروری ہے کہ کسی زبان کے وجود میں آنے کے اسباب و علل کیا ہیں؟ معمولی غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ تجارت و حکومت سیر و سیاحت، نقل مکان، و مذہبی تحریک نے زبان کی تخلیق میں بڑی مدد دی ہے، چنانچہ سامی اور آریہ زبانوں کی مختلف شاخیں انھیں اسباب و علل کے تحت وجود میں آئیں، اب آئے اردو کے منازل ارتقاء پر غور کریں، یہ تو ظاہر ہے کہ اردو نہ خالص سامی زبان ہے نہ خالص اندو جرمانی (Indo German) بلکہ سامی اور اندو جرمانی قوموں کے اختلاط و امتزاج سے اس کا وجود ہوا ہے، کیونکہ اس کے لغات و قواعد میں سامی لغات کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں اور آریہ لغات کے بھی، اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو زبان پر سامی اور آریہ لغات نے کیونکر اثر ڈالا؟ اس کے لئے کسی قدر تحقیق و کاوش غور و مطالعہ سے کام لینا ہوگا،

اردو زبان ہندوستانیوں اور اہل اسلام کے خلط و ربط سے وجود میں آئی، مذہب اسلام ایک ایسی سامی تحریک تھا، جس نے دنیا کے تمام شعبوں میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا چنانچہ مصر کا ایک ماہر لسانیات اسرائیل ولفسون لکھتا ہے،

کانت الھجرۃ الاسلامیہ الی خار ج الجن بیکہ آخر حادثہ سامی عظیم وقع فی جزیرۃ العربیہ فاھتزت لہ ارجاع العالم احترازا غنیفا وصددت عنہ تموجات فکریہ ونفسیۃ عظیمۃ شملت اصقاع آسیا و افریقیہ واور با واثرت فی ہذا البلاد واثبات ذات نتائج خطیرۃ جعلت تاریح البشری فی کل ہذا اللمحات نتیجۃ ابحاھا	جزیرہ عرب سے باہر اسلام کا شروع سامی قوم کا وہ آخری واقعہ عظیم تھا، جو عرب میں واقع ہوا، جس نے دنیا کے کناروں میں سخت ہل پیدا کر دی اس سے بڑی بڑی ذہنی اور فنی موجیں نکلیں جس میں افریقہ اور یورپ کے ممالک نال ہوئے، اور ان شہروں میں اہم نتیجہ خیز اثرات پیدا ہوئے۔ جس نے ان تمام اطراف میں انسانی تاریخ کے اندر ایک تبدیروں کا رجحان پیدا کر دیا
---	--

چونکہ اسلام کی تبلیغی زبان عربی تھی اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے، کہ عربی زبان سے ہندوستانی زبان کو کوئی علاوہ رہا ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں مفصل ذیل تاریخی شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں،

بعثت اسلامیہ سے قبل ہندوستان کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے اور ساحل الہاب میں تجارت عرب ہاجروں کی بود و باش تھی، چنانچہ عربی اور ہندوستانی نسل کے اختلاط سے ایک قوم یہاں پائی جاتی ہے جس کو "موہلا" کہتے ہیں ان کی زبان "ملیالم" ہے،

عرب اپنی حکومت سے قبل بھی یہاں قیام رکھتے تھے، اور مکہ میں ہندو کی بھی آمد و رفت تھی کیونکہ یہاں بہت بڑا منجنا تھا، عربوں اور ہندوستانیوں کا پہلا اختلاط تجارتی اغراض اور مائت عقائد پر مبنی تھا۔ اس لئے اندازہ ہوتا ہے، کہ عربی اور سنسکرت زبانیں بعثت اسلامیہ کے قبل محذوج ہو چکی تھیں،

اسلام عالم وجود میں آیا تو سب سے پہلے مہلب بن ابی صفہ نے پہلی نصف صدی ہجری میں ہندوستان پر حملہ کیا اس زمانہ میں جستہ جستہ بہت سے لوگ مسلمان ہوئے، عہد مکیا یہی میں بہت سے ہندوستانی راجہ مسلمان ہو گئے تھے، چونکہ بت پرستی کے سلسلہ میں عرب میں ان کی آمد و رفت تھی۔ اسی طرح وہ بعثت اسلام کے وقت بھی آئے، اور دین اسلام قبول کیا پھر پہلی صدی ہجری کے اواخر میں حجاج بن یوسف نے اپنے داماد عبداللہ محمد بن قاسم کو سندھ کی فتح کے لئے روانہ کیا اس نے سندھ فتح کیا، محمد بن قاسم جب ولید بن عبدالملک کے حکم سے مار گیا تو تیمم انصاری کی اولاد نے سندھ پر حکومت کی اس سلسلہ میں عرب کے بہت سے خاندان سندھ میں آ گئے یہی وجہ ہے، کہ سندھ نے بہت بڑے بڑے صوفیہ اور محدثین پیدا کئے حضرت ابو رجاء محمد ث اور شیخ ابو علی صوفی اسی زمین کے فوہال تھے، شیخ ابو علی، سنی حضرت بایزید بسطامی کے عہد میں گزرے ہیں، حضرت بایزید فرماتے ہیں کہ میں شیخ صاحب سے "فنا" کا درس لیتا تھا، اور شیخ صاحب مجھ سے، سورہ فاتحہ پڑھتے تھے، اسی بنا پر ڈاکٹر مسٹر نکلن نے یہ قیاس پیش کیا ہے، کہ تصوف اسلامیہ پر ہندوستانی لوگ کا اثر پڑا ہے،

یوں تو مسلمانوں میں بڑے بڑے سیاح گزرے ہیں۔ جنہوں نے اپنے حالات سفر قلبند سیر و سیاحت کئے، اصطلاح عالم کے جغرافیہ خالص پر روشنی ڈالی، مسلم بن حمیر، جعفر بن احمد المروزی ابن فضلان، ابن خردادبہ، جماتی، الاصفہری، ابن حوقل، یاقوت حموی، البقری، المقدسی، ادرسی وغیرہ کے جغرافیہ کار ناموں سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن جہاں تک ہندوستانی سیاحت کا تعلق ہے اس سلسلہ میں مسعودی، البیرونی، اور ابن بطوطہ نے دقیق خدمات انجام دئے، مسعودی (چوتھی صدی) بغداد کا رہنے والا تھا، اس نے اپنے آغاز شباب

ہی میں اسلامی دنیا کا بڑا حصہ دیکھ ڈالا چلے پہل وہ ہندوستان میں آیا اور مختلف ممالک کی سیر کی پھر دوبارہ آیا اور کچھ دنوں تک کجاہ اور دکن میں قیام کیا۔ اس کے متعلق ایک فرانسیسی عالم دینی بویر لکھتا ہے،

”وہ ہر اس چیز کی تعریف کرتا ہے، اور اس سے دلچسپی لیتا ہے، جو نوع انسانی سے متعلق ہے، جہاں کہیں وہ جاتا ہے،

آدمیوں سے مل کر وہ کچھ سیکھتا ہے، روزانہ زندگی اور مذہب کے معمولی امیال و عواطف اور فلسفہ کی ہوائی خیال آرائیاں اس کا

مركز توجہ نہیں اس کو اپنی استعداد کا اندازہ ہے، اور آخری دم تک جبکہ وہ مصر میں بیری کے دن گزار رہا تھا، مطالعہ تاریخ کو وہ

اپنی تسکین کا واحد ذریعہ اور اپنی روح کی دوا بتاتا ہے۔“

السیرونی نہ صرف ایک سیاح اور جغرافی تھا بلکہ اس نے بہت دنوں تک ہندوستان میں قیام پذیر رہ کر شہریت زبان کی تعلیم حاصل کی، یہاں کی معاشرت و مذہب، شاعری و ادبیات، فلسفہ و حکمت، ادب و خرافیات، ملک کی جغرافی و طبعی خصوصیات سے اپنی مشہور تصنیف کتاب الهند میں تحقیق و بحث کی اس کے متعلق ڈرافٹ ”تاریخ فلسفہ اسلام“ لکھتا ہے،

”اس سے اس عمدہ کی خصوصیت کی وضاحت ہوتی ہے، نوکندی اور مسعودی کو فارابی اور ابن سینا کی بہ نسبت زیادہ سچا

ہے، کہ اس کے (بیرونی) اساتذہ میں مشمول ہوں، بیرونی کی نظر مطالعہ خاص طور پر ریاضی، حکمت، جغرافیہ اور طبیعیات

تک محدود تھی، اس کا مشاہدہ عمیق اور قوت تنقیدی عمدہ تھی، اپنی بہت سی علمی مشکلات کے حل کرنے کے لئے اس

کو فلسفہ کا بھی مہیون منت ہونا پڑا اور اس نے مسلسل اس پر بہ حیثیت ایک منظر تہذیب ہونے کے، اپنی توجہ مبذول

رکھی، بیرونی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فیثاغورثی افلاطونی فلسفہ، ہندوستانی حکمت اور بہت سے صوفیانہ نظریات

میں جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے، ان کو تعجب خیز شہرت دی، جب وہ علوم یونان سے عربوں اور ہندوستانیوں کے رسائی

و اعمال کا موازنہ کرتا ہے، تو اس کا یونانی علوم کی برتری دکھانا اور بھی حیرت زا معلوم ہوتا ہے، وہ کہتا ہے، اگر ہندوستان نے

(عرب کا کیا ذکر ہے)، کوئی سقراط نہیں پیدا کیا، وہاں منطقیان طریقے حکمت سے مغالطہ کو دور نہیں کیا پھر بھی وہ انفرادی

اعتبار سے بعض ہندوستانی فلاسفہ پر نصفانہ محاکمہ کرتا ہے، اور وہ آریستوٹل (مستوطن عظیم آباد بہار) کے پیروں کے قصد

ذیل انکار پسند بدگی کے ساتھ نقل کرتا ہے، ”ہم لوگوں کے لئے ان چیزوں کا علم حاصل کرنا فردوسی ہے، جو آفتاب کی شعاع

میں منور ہیں جو چیزیں اس دائرہ سے خارج ہیں، گو ان کی وسعت بے پایاں ہو لیکن ہم ان کا استعمال نہیں کر سکتے جو صحیحان

آفتاب کی شعاع نہیں پہنچتی، وہاں خواہ اس کو ادراک نہیں ہو سکتا اور جن چیزوں کا حواس کو ادراک نہیں ہو سکتا ان کا

ہیں علم بھی نہیں ہو سکتا " اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیرونی کا فلسفہ کیا تھا ؟ اس کے عقیدہ میں علم یقینی صرف محسوسات کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے ، جن کو منہجیانہ معلومات کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے ، وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمیں ایک فلسفہ عملی کی ضرورت ہے ، جس کے ذریعہ ہم دوست دشمن میں تمیز کر سکیں یقیناً اس کو اس کا تصور بھی نہ ہو گا کہ اس نے وہ سب کچھ کہ ڈالا ، جو اس موضوع پر کہا جا سکتا تھا ۔

ابن بطوطہ اس عہد میں وارد ہندوستان ہوا ، جب اردو اپنی نشاۃ کے دوسرے دور میں تھی ، یعنی افغانہ سربراہانے حکومت تھی ، اور سنسکرت زبان جو عربی لغات کے ساتھ محرم و جہل کی تھی ، بھاشا کی صورت میں فارسی کے ساتھ مخلوط ہو رہی تھی ، جس کی تفصیل آگے آئی ہے ، اس لئے ابن بطوطہ کی سیاحت اردو کی تاریخ کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ، لیکن مسعودی اور بیرونی کی تصنیفات نے ایک طرف تو اہل اسلام کو ہندوستانی ادبیات سے بہت کچھ آشنا کیا دوسری طرف عربی زبان میں سنسکرت کے بہت سے لغات والفاظ داخل ہو گئے ، اسرائیل و لغسون مہر کے ماہر لسانیات نے اپنی کتاب میں سامی زبانوں کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے ، ثابت کیا ہے ، کہ بابلی و آشوری آریائی و عبری زبانوں کو عربی سے خاص مماثلت ہے ، اور لغات سامیہ کا ایک قاموس ہے کہ سامی زبانوں کے مشابہ الفاظ کو یکجا کر دیا ہے لیکن اس نے عربی اور سنسکرت کے علاقہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گویا ایک متنازع فیہ مسئلہ ہے ، کہ عربی و سنسکرت کے نحو و صرف میں کوئی ربط پایا جاتا ہے یا نہیں ؟ اس کے متعلق مستشرقین کے مختلف خیالات ہیں ۔ چنانچہ و لغسون ، سامی اور آریہ زبانوں کے تناسب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے ،

فبعضہم مرجع ان جمیع اللغات السامیہ واللغات الآریہ | انہیں بعض کا یہ رجحان ہوا کہ تمام سامی اور آریہ زبانیں کسی زمانہ  
کانت فی عصر من العصور لوقت واحد | میں ایک زبان تھیں ،

لیکن بعض ماہرین لسانیات نے اس کا مذاق اڑایا ۔ چنانچہ بروگلمان ، اور ٹولڈک نے اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ،

فلذا کان هناك اصل مشترك فیه فلا یکون خلاصۃ الا قبل | پس جب کوئی ایسی اصل تھی جو ( آریہ اور سامی زبانوں کی )  
التلوینح وما کاد ان قبل التاریخ الا یدخل فی حظیرۃ البحث | مشترک تھی ، تو تاریخ کے قبل کا واقعہ ہو گا اور جو تاریخ کے قبل کی  
عند علماء اللغات | چیز ہے ، وہ ماہرین لسانیات کے نزدیک حاطہ بحث سے خارج ہے ،

۱۰ " ہرٹری آف فلاسفی ان اسلام " مؤلفہ ڈی بویریہ کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی ۔ عام مقبولیت کے باعث  
سلسلہ میں اس کا انگریزی ترجمہ ورک اینڈ کمپنی ( لندن ) نے شائع کیا ، سلسلہ ۶ میں اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا یہی جدید الشیوع غنہ  
پیش نظر ہے ، ایڈرڈ ۔ آر ۔ جونس اس کے مترجم ہیں ( ملاحظہ ہو ص ۱۲۶ ) ۱۱ تاریخ اللغات السامیہ مطبوعہ مصر ص ۱۱۰ یہ کتاب

پھر بھی مروج الذہب اور کتاب المسند کے صفحات کا جائزہ لیا جائے، تو پتہ چل سکتا ہے کہ سعودی اور بیرونی نے سنسکرت اور عربی کو کس طرح مخلوط کیا ہے،

**نقل مکان و مذہبی تحریک** غزوہ اور افغانہ دہلی کے قبل ہی بعض قبائل عرب اور سادات ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے، ان لوگوں کی زبان عربی تھی، اس لئے اردو کے ارتقاء میں پہلے عربی زبان کے عناصر شامل ہوئے، اس کے بعد فارسی زبان نے کئی سو برس تک اسی عربی اور بھاشا کے مخلوط مواد میں اپنا اثر ڈالا، وہ عربی قبائل جو جزیرہ عرب سے ہجرت کر کے ایران میں آباد ہو گئے تھے، ہندوستان میں آئے تھے،

چنانچہ علامہ سراج الدین رفاعی حضرت عمر الاطراف ابن حضرت علیؑ کے اعتقاد کے متعلق لکھتے ہیں  
ولعمر الاطراف هذا ذیل بلخ وحران وواسط والیمین اور ابن حضرت عمر الاطراف کی اولاد، بلخ، حران واسط، یمین، وطبرستان والحند وملتات والمسند

طبرستان، ہند، ملتان اور سندھ میں آئی جاتی ہے

اسی طرح حضرت امام حسن کے پوتے ابراہیم الغفر کے متعلق لکھتے ہیں کہ آپ کے دو بیٹے ہوئے جن میں ایک کا نام حسن الشیخ تھا، دوسرے کا ابراہیم طباطبا، حسن الشیخ کے اعتقاد کا تذکرہ علامہ موصوت یوں کرتے ہیں

اما حسن الشیخ فاعقب من الحسن وهو اعقب من رجلیں لیکن حسن شیخ آپ کے ایک صاحبزادہ حسن سے اولاد ہوئی

ابن جعفر محمد وابی القاسم علی المعروف بابن معیہ وحی انھوں نے دوڑ کے ابی جعفر محمد اور ابوالقاسم علی معروف بہ ابن معیہ امہ انصاریہ عرف بھاو لھم ذیل طویل بمصر، العراق پھوڑے، معیہ ابوالقاسم کی انصاری، ان تھیں جیسے وہ مشہور ہوئے،

ومنھم عبد ھلی من الحمد لہ ان لوگوں کی اولاد کثیر مصر اور عراق اور ان میں بعض ہندوستان تک پھیلے ہوئے ہیں

عام قبائل عرب کے علاوہ بہت سے مشائخ آئے، جن کا مطلع نظر تبلیغ وارشاد تھا۔ چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین بنجر (متوفی ۷۸۰ھ) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۷۹۰ھ) خواجہ فرید الدین گنج شکر (متوفی ۸۰۰ھ) خواجہ نظام الدین

خالدی (متوفی ۸۱۰ھ) وغیرہ نے ارتقاء اردو میں بڑی مدد دی، چونکہ قومی اصلاح اور روحانی بلانے وارشاد کے سلسلہ میں عوام الناس کو آپ حضرات کے ساتھ گہری وابستگی تھی، خواجہ معین الدین بنجر (م) سلطان التمش کے عہد (متوفی ۸۲۰ھ) میں وارد ہندوستان ہوئے۔ خواجہ قطب الدین قصبہ "اوش" سے تشریف لائے تھے، جو ماور النہر کے علاقہ

میں تھا اسی طرح شیخ فرید الدین (م) قصبہ کہو تو ال سے جو ملتان کے علاقہ میں ہے، تشریف لائے، شیخ نظام الدین اولیا

(ہفتیہ عاشیہ صفحہ ۱۷) ۸۲۰ھ میں مصر کی ایک واقعہ علمی مجلس "جنتہ الترجمہ والتالیف والنشر" نے شائع کی ہے، موضوع کے لحاظ سے عربی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے، اس میں ابلی آشوری، عبری و آرمی، اور عربی زبانوں کی مکمل تاریخ ہے، ان زبانوں کے قدیم و جدید خطوط کے نقوش بھی پائے جاتے ہیں، اس پر ایک تبصرہ لکھا جا رہا ہے یہ صحاح الاخبار فی نسب السادة الغالیة الانجارس ۲۸، یہ کتاب ابن ندیم

کے والد احمد دانیال غزنویں سے ہندوستان میں آئے، دکن کے اسلامی سلاطین کے عہد میں بھی اولیا اکبار ہندوستان میں آئے، اگر ہر شاہی خاندان کے عہد کے بزرگوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے، تو پتہ چلے گا، کہ ایرانی شعرا کی طرح عراق عرب، و ایران کے صالحا و صوفیہ بھی ہندوستان میں کثرت کے ساتھ آئے اور ان کی بیعت و رشادت نے عوام الناس کی زبان پر نگہ اثر ڈالا

سادات بلگرام جن میں ترمذی، رضوی، و صفراوی ہیں وہ عراق و ایران سے آئے، بلگرام میں سب سے پہلے خواجہ عماد الدین تشریف لائے اس کے بعد سید محمد صفری تشریف لائے جو حضرت زید شہید ابن حضرت امام زین العابدین کے اعقاب میں ہیں اور انھیں کے اخلاف گرامی سے یہ شہر علوم و معارف کا سرچشمہ بنا، خواجہ عماد الدین تو بلا واسطہ عرب سے تشریف لائے تھے لیکن سادات صفراوی عراق یا عجم سے آئے اسی طرح بعض خاندان ترمذی سے آئے، سادات ترمذی کے جد امجد کمال الدین غزنویں سے تشریف لائے، خواجہ عماد الدین اور سید محمد صفری دونوں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مریدوں میں تھے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ابتدائے ساتویں صدی میں گزرے ہیں اور صفیر موم مؤلف تاریخ بلگرام سید محمد صفری کو آپ کا مرید بتاتے ہیں اس سے نتیجہ نکلتا ہے، کہ سید محمد صفری کا خاندان او آخر ساتویں صدی میں ہندوستان میں آباد ہو گیا تھا، لیکن اس عہد کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے بعد علامہ رفاعی نے صحاح الاخبار لکھی لیکن انھوں نے سادات زیدی کو صرف عراق و حجاز تک محدود بتایا ہے، چنانچہ عیسیٰ موم الاشبال بن زید شہید کے صاحبزادوں زید، احمد، اور حسین کے متعلق لکھتے ہیں

ولھم عقب طویل و ذیل جلیل بانعراق و الحجاز انکی کثیر اولاد و اعقاب گرامی عراق و حجاز میں پائے جاتے ہیں سادات صفراوی (بلگرام)، اپنا سلسلہ محمد بن عیسیٰ موم الاشبال بن زید شہید تک پہنچاتے ہیں تعجب ہے، رفاعی نے اس خاندان کے ورد و ہند کے متعلق کیوں نہ لکھا، حالانکہ انھوں نے بعض ہندوستانی خاندانوں کے متعلق لکھا ہے، جیسا کہ سطور بالا میں لکھا جا چکا، سید محمد صفری کے جد ششم سید ابوالفرح واسطہ کے رہنے والے تھے، اسی لئے سادات صفراوی ”واسطی“ کہلاتے ہیں

الغرض سندھ کی عربی حکومت ٹٹنے کے بعد اکثر قبائل جو ہندوستان میں آئے وہ بلا واسطہ عرب سے نہیں آئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) ہے، اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے جرمنی، اور انگلستان کے مستشرقین نے اس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا ہے، چنانچہ انگریز مستشرق سر ایڈمنڈسٹن اس کی فرائش پر اس کتاب کا مقدمہ لکھ رہا ہوں، ممکن ہے یہ کتاب علامہ موصوف گب موریل کی طرف سے شائع کرائیں جیسا کہ انھوں نے اپنے مکتوب گرامی میں ظاہر کیا ہے تاریخ بلگرام مؤلفہ سید فرزند احمد صفیر ج ۱ ص ۳۰ •

تھے، بلکہ ایران سے آئے ان کی زبان فارسی تھی، اس طور سے ہندوستان کی مادری زبان میں جس میں عربی زبان کے بہت سے عناصر شامل ہو چکے تھے، فارسی زبان مخلوط ہونے لگی، گو پہلی صدی ہجری کے اثر حکومت نے ہندوستان کی سر زمین سے عربی زبان کے بہت سے ادیب جلیل و محدث ثقہ پیدا کئے لیکن جب فارسی کا دور ہوا تو خود مسلمانوں نے بھی سنسکرت و بھاشا کی طرف کافی توجہ کی اور ہندو میں تو فارسی کے ایسے ایسے بے مثل ادیب و شاعر پیدا ہوئے، کہ دنیا آج ان کے بدلیہ افکار و حلاوت زبان پر پروں سردھنتی ہے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، الغرض ہندوستان میں فارسی زبان کی تاریخ کا آغاز عہد غزنویہ سے متعین کریں تو گویا پانچویں صدی سے تیرہویں صدی تک فارسی زبان نے ہندوستان پر اپنا سکہ جمائے رکھا

عہد غلامان سے لے کر آوان لودی کے درمیان خلجیہ، تغلق، سید وغیرہ نے حکومت کی ان تمام فائدہ انوں کے دور حکومت میں، سلطنت کی زبان فارسی تھی پھر بھی ہندو نے فارسی کی طرف ایسی توجہ نہیں کی، جیسا کہ عہد مغلیہ میں پایا جاتا ہے، مغلوں کی حکومت نے خود فارسی زبان کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا، ایران کے صفوی سلاطین شعر و ادب اور فنون لطیفہ کے بہت بڑے حامی تھے لیکن پھر بھی دربار مغل کا آوازہ جو دوستی اور خمرہ ادب لوزی اس قدر عالمگیر ہوا کہ ایران سے ہزاروں شعرا اور دہندوستان ہوئے، عہد اکبری اس کے لئے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، محمد شیم ہرودی (مؤلف طبقات اکبری) اور بدایونی (مؤلف منتخب التواریخ) نے تفصیل کے ساتھ سینکڑوں شعرا کے نام گنا لئے ہیں ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں بہت سے شعرا کا نام لکھا ہے، شیرازہ کا شان، تبریز، اصفہان، لاہجان، مشہد کے شگفتہ بیان شعرا دربار اکبری کی شمع فروزاں بن گئے تھے اور ایرانی شعرا کی آمد کا یہ سلسلہ نہ صرف دہلی ولاہور تک محدود تھا بلکہ اودھ، دکن اور بہار میں بھی کثرت سے ان کی آمد رہی، حکومت کے دفاتر، ایرانی شعرا کی آمد، اور قبائل عرب کی ہجرت نے (جن کی زبان فارسی تھی) پنجاب، اودھ، دکن اور بہار پر گہرا اثر ڈالا، اور مقامی باشندوں میں فارسی زبان کا بہت پاکیزہ ذوق پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس ضمن میں سب سے پہلے شاہی دربار کی طرف توجہ کیجئے، یوں تو ہر خاندان کے مسلمان بادشاہ کے عہد میں ہندوؤں نے دربار میں رسوخ حاصل کیا لیکن دربار اکبری نے جس فیاضی کے ساتھ دربار میں ہندوؤں کو جگہ دی اس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی،

دربار اکبری کے ہندو و لہیا ب مناصب | ابن تاریخ میں فرماتے ہیں، محمد معین ہرودی (مؤلف طبقات اکبری) کے صاحبزادہ

”چون تفصیل اسامی اہل حضرت خلیفہ افاضل پناہ علانی شیخ ابوالفضل

در کتاب اکبرنامہ مرقوم مسلم بدایع رقم گردایندہ اند، دریں مختصر بہ ذکر اسامی اہل



کبار اختصاص یافتہ تھے

اس کے بعد جستہ جستہ مفصلہ ذیل ہندو منصبداروں کے حالات لکھے ہیں یہ تعداد صرف ان امراء کی ہے جو ”منصب اعلیٰ“ پر فائز تھے، چھوٹے چھوٹے منصبداروں کا حال اکبر نامہ میں پایا جاتا ہے،

راجہ ٹوڈر مل اذالیف کھتری و نویسنده بود، و نویسنده مظفر خاں بہ مرتبہ وزارت رسیدہ مدت ہفدہ سال و دیر

باعتقال و چار ہزار سوار داشت

راجہ رائے سنگھ کو بیگانہ اور ناگوار کی حکومت اور چار ہزاری منصب ملا تھا، رائے سال کچھواہہ دو ہزاری رائے درکھل ہزار و پانصدی، اور راجہ بیر بر دو ہزاری امراء میں تھے، راجہ سرجن رتنپور میں تھا شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو اس نے اطاعت کی اور دربار کے دو ہزاری امیروں میں شامل ہو گیا راجہ روپ سی بیر کی ہزار و پانصدی منصب رکھتا تھا۔ جگت سنگھ ولد راجہ مان سنگھ ہزار و پانصدی امراء کے صف میں تھا راجہ بارہ مل حکومت مغلیہ کے آقا تھے میں امراء کبار میں شامل تھا، راجہ بھگوان داس ولد راجہ بھارت مل کو جو راجہ مان سنگھ کے باپ تھے، پانچ ہزاری منصب ملا تھا اس خاندان کے ساتھ اکبر اور اس کی اولاد و احفاد کو خاص لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ کئی پشت تک راجہ بھارت مل کے بیٹے پوتے اور پر پوتے دربار میں شامل تھے، ان پر حکومت کو کامل اعتماد تھا۔ مان سنگھ کو بہار و بنگال کی گورنری اور پانچ ہزاری منصب عطا ہوا تھا، راجہ جگن ناتھ پسر راجہ بہار مل اور راجہ اسکرن تین ہزاری امراء میں تھے، راجہ لونکرن بھی صف امراء میں داخل تھا، مادھو سنگھ برادر راجہ مان سنگھ دو ہزاری امیروں میں تھا، رام سنگھ ولد راجہ اسکرن سلک امراء میں تھا، اسی طرح رائے پتر داس کھتری قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور درباری مشینوں میں تھا، اس کے بعد اس کو بلا دھمکے یا تہ کی حکومت ملی اسی طرح راجہ اس کچھواہہ اکبر کے حاضر باش درباریوں میں تھا، مدنی رائے جوہان، اور رائے بھوج ولد رائے سرجن ہزاری امیروں میں تھے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے، کہ جو امراء بائیسو نوکر رکھتے تھے، ان پر ”امارت“ کا اطلاق ہوتا تھا لیکن مفصلہ بالا امراء کا درجہ ”امارت“ سے بڑا تھا،

اب سوال یہ ہے کہ ان منصبداروں سے فارسی زبان کو کیا تعلق ہے؟ اس کے لئے ہمیں عہد حاضر کے

۱۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے، دوران مطالعہ میں اس کتاب کے مصنف کا نام کہیں نہیں ملا، دربار اکبری کے امراء کے سلسلہ میں مولف نے مشکوک طریقہ سے اپنا نام لکھا ہے، لیکن بتایوں کے سلسلہ میں انہوں نے صاف بتا لیا ہے، کہ اس کتاب کے مولف کے والد کا نام محمد تقیم بہروی ہے، ظاہر ہے، کہ محمد تقیم ”طبقات اکبری“ کا مصنف ہے، اس لئے یہ کتاب ایک ایسے خاندان کے فرد نے لکھی ہے، جو ایک مدت سے مشغول کے دربار سے وابستہ تھا، اس کے بعد اکبر تک خاندان تیموریہ کا سلسلہ تذکرہ پایا جاتا ہے،

والیان ریاست پر ایک نظر ڈالنی چاہئے، جن میں مشکل ہی سے کوئی ایسا نکلے گا جو انگریزی زبان سے ناواقف ہو اور اکثر تو انگریزی زبان کے ماہر ہیں اس لئے یہ ناممکن ہے، کہ دربار منلیہ میں ہندو منصبدار حاضری تو دیتے ہوں، مگر بادشاہ اور احرار کی زبان سے نابلد ہوں، اس کے علاوہ ان میں اکثر وہ تھے، جن کو دربار سے بلا واسطہ سروکار تھا، مثلاً راجہ بھارت مل کا خاندان، رام داس کچھواہہ، راجہ لونگرن وغیرہ آخر الذکر کالوکارائے منوہر تو فارسی زبان کا بڑا ادیب اور شاعر تھا اور ”بوسی“ تخلص کرتا تھا

**مسلمان اور سنسکرت و بھاشا** | سنسکرت اور بھاشا کی تحصیل میں مسلمانوں نے بھی بہت بڑا حصہ لیا، چنانچہ عمد غلاماں ہی سے اس زبان کے شاعر و ادیب، افسانہ نگار

و لغوی پیدا ہونے لگے، خسرو دہلوی کی پہیلیاں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، فیضی اور بدایونی نے سنسکرت سے فارسی میں بہت سی کتابیں ترجمہ کیں دارا شکوہ نے سنسکرت زبان کی کتابوں، اپنیشید وغیرہ کے ترجمہ پر کافی توجہ کی، اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں تو بھاشا کا ایک مستند شاعر مانا جاتا ہے، چنانچہ محمد قاسم بھٹاؤں ”خانخاناں در قابلیت و استعداد تمام عبار و یکتائے روزگار بود سواد عربی، و ترکی و فارسی و ہندی روان داشت

وہ زبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے تھے

وہ سنسکرت زبان سے بھی واقف تھا چنانچہ ایک غریب برہمن نے اس کے دربار میں آکر کہا کہ میں اور آپ ساڑھو ہیں آپ لطف و مسرت سے بسر کریں اور میں پریشاں حالی کا شکار رہوں! تو وہ بارہوں نے سوال کیا کہ حضور یہ برہمن آپ کا ہمرلف کیونکر ہوا، خانخاناں نے جواب دیا کہ ”بتنا“ اور ”سپنتا“ دو برہمن ہیں ”بتنا“ (مصیبت) اس کے عقد میں ہے، اور ”سپنتا“ (فراغ بانی) میری زوجیت میں اس سے پتہ چلتا ہے کہ بھاشا کے الفاظ اس کے دماغ میں کس طرح حاضر رہا کرتے تھے۔

اسی طرح اکبر کا ایک منصبدار حسین خاں ”مکریہ“ (متوفی ۹۸۲ھ) تھا، مکریہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس نے اپنی حکومت لاہور کے زمانہ میں ہندوؤں کو حکم دیا تھا کہ کاندھ کے نزدیک کرتے میں پیوند لگائیں ابن محمد عظیم الہردی لکھتا ہے

وہ زبان ہندی پیوند را مکری می گویند مشہور بہ ”مکریہ“ گشت ہے

چنانچہ دیہاتیوں کے پیر میں آج بھی یہ ٹکڑہ پایا جاتا ہے، اسی طرح یوسف عادل خاں دکن کے عادل شاہی خاندان کے بانی کو ”سوائی“ کہا کرتے تھے، اس کی وجہ تسمیہ

لے اقبال اللہ جہانگیری و خانی سال ۱۰۲۷ ھ کلمات اشعار تذکرہ خانخاناں سے تاریخ ابن محمد عظیم الہردی تذکرہ امراے اکبری

یہ بیان کی جاتی ہے، کہ وہ ”سادہ“ کا رہنے والا تھا اس لئے عوام کی زبان میں ”ساوی“ کے بجائے ”سوائی“ ہو گیا لیکن یہ قرین قیاس نہیں صحیح یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حکام دکن میں سب سے زیادہ قوی حکمران تھا اس لئے اہل دکن اس کو ”سوائی“ ہندسہ کے اعتبار سے کہنے لگے، ابوالقاسم لکھتا ہے،

”و میان شکستہ زبانان ہند بہ ”سوائی“ مشہور است چہ کہ سوائی بہ زبان ہندی چارویک مای گویند چون عا دشاہ

بہ اعتبار ولایت و شمشیر چارویک بر حکام دکن زیادتی داشت بنا بر ایں او بہ ایں لقب شہرت یافتہ“

آگے چل کر مولف مذکور لکھتا ہے، کہ صحیح یہی ہے، کہ ”سوائی“ ساوی کی تحریف ہے، مگر میرے خیال میں ”ساوی“ کو سوائی کہنے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوئی اگر ”سوائی“ کو فرشتہ کی پہلی رائے (چارویک) کے مطابق مانیں تو نتیجہ نکلتا ہے، کہ کس طرح ہندی اور فارسی کا میل جول ہو رہا تھا، فیروز شاہ بہمنی کے حرم میں ہر قوم و ملک کی عورتیں تھیں، ان میں راجپوت، بنگالی، گجراتی، تلتگی، کنہڑی، مرہٹی عورتیں بھی تھیں فرشتہ کہتا ہے،  
و زبان آنا ہمہ می دانست

مرزا افضل سرخوش (عمد عالمگیری) نے مسلمانوں کی ہندی اور بھاشا کی معلومات کے متعلق بہت سے واقعات درج کئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں،

”بیراگی مروے است آزاد مشرب بہ مذاق فقر آشنائی دار دبیش فقیر مشق می گذراند قصہ از کتب ہندی در

زمین شاہنامہ بہ نظم راست بہ راست طرز در آوردہ مطالب تصوف را توضیح نمودہ“، ۱۷

ملا دانا امیر خاں کی سرکاری پیشکش تھی، ان کے متعلق مرزا صاحب رقم کرتے ہیں

در معنی ہندی تلاش بسیار داشت

اسی طرح عاقل خاں دہلی کے بہت نیک نیت، حق شناس، رعیت پرور، اور سخی امیر تھے، انہوں نے فتویٰ روم کے

طرز میں کتاب مرقع تصنیف کی اور فارغانہ کلام پیش کیا، سرخوش کہتے ہیں

گل دہلیل، و شمع و پروانہ، قصہ پداوت، و دہالت را بہ نظم در آوردہ،

لاشیداکے ہمنشینوں میں پانی پت کے ایک شاعر تھے، انہوں نے رام و سیتا کا قصہ نظم کیا تھا، اس کے

متعلق مرزا سرخوش فرماتے ہیں

و یک بیت در تعریف مصمت سیتا گفت کہ جمیع خوش خیالان پشت دست گذاشتند بچکس قدرت نداد کہ چنین بیت

تواند گفت و ایں یک بیت بہ اعتقاد سخنوراں صاحب انصاف برابر لک بیت است (ص ۲۱۰)

و وہ شعر یہ ہے ،

تنش را پیرہن عریاں ندیدہ

چو جان اندرتن و تن جاں ندیدہ

مرزا محمد علی آہر جیسے نباض سخن نے پہروں اس پر سر دھنا ، یہی وجہ ہے کہ اس ایک بیت کو اہل نظر نے ایک لاکھ بیت کے برابر تصور کیا

اس عہد کے ایک اور شاعر ”نسبتی“ تھا فیسری تھے ، یہ بھی بھاشا کے اچھے شاعر ہوئے ہیں ، مرزا صاحب فرماتے ہیں

بہ زبان ہندی نیز شعر گفتہ ”نسبتی“ در ان تخلص می کرد ، یعنی ”ماہ“ ”نس“ یہ زبان ہند شب را گویند ”ہی“ ”آہر“

یعنی ”اہرئے شب“ کہ ماہ است ، (ص ۲۲۵)

اس عہد کے مسلمان ادیب و شعرا نہ صرف زبان بھاشا سے دلچسپی لیتے تھے ، بلکہ ہندوستانی معاشرت و رسوم بھی ان کا موضوع سخن تھے ، عہد جمالیگری کا ایک شاعر ”ستی“ کے متعلق لکھتا ہے ،

چنان مستانہ بر آتش نظر کرد

کہ از بدستیش آتش حذر کرد

جمالیگری کے شکار سے لے جاتا ہے ، ایک شیر غزاں حملہ آور ہوتا ہے ، اور اس کے ایک ہندو منصف دار انوپ لائے کو دبوچ لیتا ہے ، گشتکش شروع ہوتی ہے ، اور وہ امیر بڑی بہادری کے ساتھ شیر کے پنجے سے نکل آتا ہے ، شیر مارا جاتا ہے ، اور جمالیگری اپنے امیر کو ”رائے سکھ دکھن“ کا خطاب دیتا ہے ، (اقبال نامہ و قالج سال پنجم) عالمگیری کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے ، کہ اس کا لڑکا شہزادہ محمد معظم ، بادشاہ کی خدمت میں دو قلم کا آم بھیجتا ہے ، اور استاد عا کرتا ہے کہ ان کا نام لکھا جائے بادشاہ ان کا نام ”رستا بلاس“ تجویز کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو قعات عالمگیری)

(باقی)

عبدالملک (آردی)

ضرورت ہے

نگار جنوری جون و اگست ۱۹۳۳ء کے پرچون کی۔ اگر کوئی صاحب علمہ کرنا چاہیں تو اطلاع دیں۔

نینجمر نگار

# حسین و عشق کی کشاکش

(تیارخ یونان کا ایک ورق رنگین)

(۱)

صنوبر، — دیہاتی اطوار کی حسین ہلاکی حسین، دیکھنے والے نے دیکھا نہیں کہ ساری کی ساری آنکھوں کی راہ بدن میں سما گئی۔ رگ رگ میں دوڑ گئی۔ کلیجہ میں اتر آئی۔ دل و جگر چیلنی ہو گئے۔ خون جوش میں آگیا۔ آنکھوں میں نور بھر گیا۔ جو وہ طبق روشن ہو گئے

غار تگر دیں وہ بت کا فرغی سراپا۔ اللہ کی قدرت

پاری، — بڑے کا تو جوان بادشاہ، شکار کھیلنا ہوا ادھر سے گذرا۔ صنوبر پر نظر پڑی۔ سناٹے میں آگیا۔ زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ بے اختیار آگے بڑھا۔ حسینہ کے قدموں پر جھک گیا۔ وہ مسکرائی، کھلکھلا کر ہنسنے لگی، بادشاہ کی آغوش میں آگئی۔ دونوں ایک ہو گئے

حکایت بود بے پایاں بجا موشی ادا کردم

رات دن عاشق معشوق ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے اور یونہی ایک زمانہ گذر گیا۔ ایک دن ٹرائے کے خواہی بلوغ میں دونوں بیٹھے ایک دوسرے کو محبت سے تک رہے ہیں۔ صنوبر نے بوجھا: — ”کیا سچ تم تجھ سے سچی محبت کرتے ہو؟“ اچھا قسم کھاؤ گسی اور کو نہیں چاہو گے!“

— ”میری جان! تمہارے ننھے سے دل میں یہ دسواں کیوں آتے ہیں؟ قسم تمہارے سر کی میں قیامت تک تمہارے سوائے کسی اور کو نہیں چاہوں گا۔ پیاری! یہ کیا غضب ہے کہ تم میری محبت میں اتنا شک کرتی ہو!“ — ”پیارے! یہ سچ ہے، تم مجھے ضرور چاہتے ہو۔ مگر — تمہاری محبت کا کیا اعتبار! کل حسن کی دیوی، اس بار مٹائی، ملکہ ہیلن کو دیکھ لو گے اُسے چاہنے لگو گے اور میری محبت تمہارے دل سے یک قلم کا فور ہو جائے گی۔ پیارے! قسم کھاؤ تم کبھی ہیلن کو نہیں چاہو گے!“

صنوبر کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے آبدار موتی ٹپکے اور پھول سے رخساروں پر چپکنے لگے۔ پاری حیرت میں ہے

”ہیلن، ہیلن! یارب یہ ہیلن کیا بلا ہے؟ انگلنڈ راجا بھی ہستی ہے۔ کیلو پیٹر نے بھی یہی کہا۔ اور اب تم بھی یہی کہتی ہو۔ کوئی بتاؤ کہ یہ ہیلن میں کونسا جادو بھرا ہے۔ جو دیکھتا ہے اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں ہیلن کو ضرور ٹونگا دیکھوں میرا دل کیسے جھینپتی ہے۔ ہم لو میں چلا۔ پیاری! نہ روکو، جانے دو۔ میں چلا۔ اور وہ چلا گیا۔“

ٹرائے سے چل کر پاری سیدھا اسپارٹا پہونچا۔ یونان کے بادشاہ موتی لیس کا سہان ہوا۔ اُسے ملکہ حُسن و جمال بادشاہ موتی لیس کی بیوی، ہیلن کی خدمت میں آسانی سے باریابی حاصل ہو گئی۔ اُس نے ملکہ کو دیکھا، ملکہ نے اُسے دیکھا۔ آنکھوں سے آنکھیں لڑیں۔ دل سے دل ملے۔ ایک ہی نظر میں تمام معاملات طے ہو گئے، پہنچ کھل گئے، گھٹیا سلجھ گئیں۔ واقعی ہیلن، کچھ اور ہی چیز تھی

(۲)

بھیا نک رات۔ تاریکی۔ سناٹا۔ تیز رو گھوڑے پر ایک بہادر شہسوار اور ایک پری پیکر حسینہ جواسے باتیں کر رہے ہیں! خوفناک دن۔ طوفان۔ شور۔ قیامت سمندر کی موجوں پر ایک نوجوان ملاح کسی ماہ طلعت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کشتی چلا رہا ہے!

یہ دونوں کون ہیں؟

طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ ہر جگہ یہی چرچا، ہر طرف یہی قصہ، یونان کی رگ جیت جو شس میں آگئی۔ ایشیا والوں سے انتقام کی تیاریاں ہیں۔ بچہ بچہ کی زبان پر ہیلن کے اغوا کی داستان ہے۔ لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قیاس آرائیاں کرتے ہیں: — ”یہ ہونہیں سکتا! — اگر وہ خود راضی نہ ہوتی تو کس کی مجال تھی! — اور یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ راضی ہو۔ تو پھر اس کا بھید؟ وہ پاری کے ساتھ کیوں چل دی؟“

کارکنان قضا و قدر شوق و استعجاب سے کرہ زمین کے مستقبل کو دیکھ رہے۔ شاید کوئی عظیم الشان انقلاب آنے کو ہے! شاید پھر زمین کا طبقہ الٹنے کو ہے! ہواؤں میں ہیلن اور پاری کی داستان پھیلی ہوئی ہے۔ آسمانوں پر یہی چرچا ہے۔ وہ پاری کے ساتھ کیوں.....؟

جنگ چھڑ گئی! — عالمگیر جنگ۔ خونخوار، خونریز، ہولناک۔ جو بیڑ کا قمر۔ جو بیڑ کی پناہ! الامان الحفیظ! —

کچھ تاجدار اسپارٹا (یورپ) کی حمایت میں ہو گئے۔ کچھ ٹرائے (ایشیا) کی۔ برسوں لڑائی جاری رہی دوچار، پانچ چھ، ساٹھ آٹھ، دس بارہ برس گزر گئے اور جنگ کی آگ کم نہ ہوئی بڑھتی چلی گئی آخر، تاجکے؟ — ٹرائے کی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پاری مار گیا۔ ایشیا والوں کو شکست ہوئی۔ سینیٹس جیت گیا۔ فتح کے شاد باجے بجنے لگے۔ قتل عام شروع ہو گیا

مونی لس، ہیلن کے قتل کرنے کے لئے دیوانہ وار شاہی محل کی طرف دوڑا۔ ادھر سے وہ استقبال کو نکلی! عظمت و محبت کی دیوی! حسن و جلال کی مورت!۔ اس نے قاتل کی آسانی کے لئے آنجل بٹا دیا، سینہ کھول دیا، تصویر صفت سیدھی مٹی ہو گئی، خاموش، متین، آفتاب، ماہتاب

خونخوار شہنشاہ سکتے میں آگیا۔ دم بخود رہ گیا۔ اس ابھرے ہوئے سینہ کو چہروں یا اس ہنس کی سی گردن کو کاٹوں؟ ہاتھ اٹھلا پڑ گیا۔ قریب تھا کہ خنجر ہاتھ سے پھوٹ کر گر پڑے۔ تھر تھرانے لگا۔ ڈنگ گیا۔ دنگ ہو گیا۔ ہیلن پہلے سے کہیں زیادہ حسین، کہیں زیادہ شگفتہ۔ حسن و عفت کی مکمل تصویر۔ صانع قدرت کے کمال کا مرقع۔ گلشن فردوس کا بہترین گلاب۔ اس کی عمر بڑھنے کے بجائے بارہ برس گھٹ گئی تھی۔ نئے سرے کم سن ہو گئی تھی۔ سولہ برس کی لڑکی!

کسی نے پیچھے سے کہا: — ”جہان پناہ! ہاتھ روکے!۔ یہ کیا غضب ہے!۔ جو پیٹرنے عالی جاہ کو کامیاب بنایا۔ باری مار آگیا۔ دشمن پامال ہوئے۔ ملکہ حسن و جلال واپس مل گئیں۔ اب یہ خون کیسا!۔ ملکہ کو ساتھ لیجئے اور اپنا پٹلے۔ آخر یہ جنگ اسی لئے تو ہوئی تھی کہ ملکہ واپس لائی جائیں!

مونی لس چپ تھا۔ یہ جنگ کیوں ہوئی؟ یہ عظیم الشان جنگ؟ بارہ برس کی مسلسل جنگ؟ کیا اسی لئے کہ ہیلن واپس لائی جائے! شاید!۔ مگر میں تو یہ نہیں سمجھا تھا۔ کہیں کوئی اور مقصد نہ ہو! کچھ یاد نہیں آتا۔ شاید!۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟..... نہیں

(۳)

گناہ، بالجبر، بدترین، ارذل ترین، اسفل ترین۔ سپاہ سالار اعظم ”ٹی ٹس“ نے ذیابلی کی۔ خود خداوند قدوس کے حضور، خود خداوند جو پیٹر کے مندر میں، محراب کے پاس، مورت کے سامنے، دن کے وقت، اگر نڈرا باری کی بہن..... صاف، صریح، ظلم عظیم۔ اثم عاکبیر

ٹی ٹس کا بیان ذرا مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے عبادت گاہ میں اُس وقت خداوند کی مورت موجود نہ تھی۔ لہذا مجھ پر خداوند کی توہین کا الزام غلط ہے۔ مگر اس کی محبت مسموع نہ ہوئی اور خداوند جو پیٹر کی توہین کی پاداش میں اُسے پھانسی کی سزا دیدی گئی۔ نیز اسی مصیبت کے کفارہ میں لگاتار چالیس دن تک روزہ ہو سو بکروں کی قربانی کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ تمام فاتح نامہ داروں کی یہی رائے تھی۔ صرف بادشاہ مونی لس اس رائے سے متفق نہ تھا

مونی لس نے کہا:۔ ٹی ٹس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے جلدی کی، اگر ایک روز ٹھہر جاتا تو اگر نڈرا بطور لونڈی کے اس کے حوالہ کر دی جاتی اور کوئی گناہ نہ ہوتا۔ اب ٹی ٹس مارا جا چکا ہے۔ قربانیاں بھی تھوڑی بہت ہو چکی ہیں، لہذا اب اس اُپرے ہوئے خیر میں پڑے رہنا اور قربانیوں کا سلسلہ جاری رکھنا، مناسب نہیں۔ اگر خداوند جو پیٹر کو اس شہر کی بے حرمتی منظور نہ ہوتی تو یہ شہر ویران نہ ہوتا، لوٹا نہ جاتا۔ میں اتنی لمبی قربانیوں کا قائل نہیں ہوں

میرے نزدیک یہاں رکنا بے سود ہے

بادشاہ آگونس نے جواب دیا :- تم اس گناہ کا احساس نہیں کر سکتے ! تمہارے گھر کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ ہیلن  
لود کچھ کتنوں نے اُسے شکار کیا اور کتنوں کو اس نے شکار کیا ! تم ٹی ٹس کے گناہ اور خداوند قدوس کی توہین کا کیونچہ قصور  
کر سکتے ہو ! اپنا فلسفہ پاس رکھو۔ قربانی کے فرائض رُک نہیں سکتے !

مونی لس — میں یہ منطق سمجھنے سے قاصر ہوں

آگونس — اچھا، تو تم چلے جاؤ۔ اور اپنا لشکر ساتھ لے جاؤ۔ ہم اور ہماری فوجیں یہیں ٹھہریں گی

مونی لس — میں کل روانہ ہوں گا

خداوند جو بیٹر کے مندر میں منبر کی سیڑھیوں پر ہیلن کھڑی قربانی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اس کی روشن پیشانی  
پر پسینہ کی بوندیں جھلک رہی ہیں۔ سامنے مقدس آگ جل رہی ہے جس میں وہ آہستہ آہستہ گہی ڈال رہی ہے۔ راہب جو بیٹر  
ل جھگڑا رہے ہیں۔ آگ کی گرمی سے ہیلن کا رنگ سرخ ہو رہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کی نگاہیں خداوند جو بیٹر کے  
جائے اسی جس کی جیتی جاگتی مورچی کی پوجا کر رہی ہیں۔ جو بیٹر کی صورت پر کسی کی بھی نظر نہیں۔ البتہ ہیلن اسی خداوند  
قدوس کے مقدس سونے کے پتلے کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی عبادت بے نوبت، بے عیب، بے ریا ہے۔ شام ہو گئی اور  
ہیلن پہلے دن کی قربانی کے فرائض انجام دے چکی۔ اب اتالیس دن اور باقی رہ گئے

رات کے وقت ہیلن اور مونی لس میں باتیں ہو رہی ہیں

مونی لس — ہم کل اس پارٹا روانہ ہوں گے

ہیلن — ایں !۔ اتنی جلدی !۔ اور قربانیاں !

مونی لس — کیا اب بھی جلدی ہے ! تم ٹھہرنا چاہو تو شوق سے ٹھہرو

ہیلن — نہیں۔ میرے لئے تو ہر جگہ برابر ہے۔ ٹرائے ہو یا اسپارٹا۔ یورپ ہو یا ایشیا۔ البتہ سپاہیوں  
کے احساس کا خیال ضروری ہے۔ ان کے دلوں سے قربانی کی اہمیت کیونکر دور کی جاسکتی ہے !۔ اور پھر جیسا تم مناسب  
سمجھو۔ تعجب ہے کہ میرے تعاقب میں تو اتنی جلدی نہیں کی گئی تھی۔ اور قربانی کی تمام رسمیں ایک ایک کر کے ادا کی گئی  
نہیں۔ حالانکہ وہ جلدی کا محل تھا نہ کہ اب۔ میرے خیال میں قربانی کی رسمیں ادا ہوئیں تو چلیں۔ اس کے علاوہ لشکری  
سب ہمت ٹھک بھی گئے ہیں۔ تھک کے جو رہ گئے ہیں۔ انھیں کچھ دنوں کے لئے آرام مل جائے گا۔ لشکریوں کو ناخوش  
رہا مصلحت کے خلاف ہے کہو، تم کیا کہتے ہو ؟

مونی لس — خدا ہماری قربانیوں کا بھوکا نہیں۔ آگونس اور اس کے ساتھی یہاں بیٹھے قربانیاں کرتے

ہیں گے۔ میں اپنے لشکر کے ساتھ کل روانہ ہو جاؤں گا



ہیلن ————— میرے خیال میں تمہارا بھائی آگوسٹس حق پر ہے اور تم غلطی پر ہو  
مونی لس ————— شاید میرا داغ جل گیا ہے۔ مگر میں صبح روانہ ہوں گا۔ تم چلو گی یا نہیں؟  
ہیلن ————— میں چلوں گی

(۴)

کشتی ڈول رہی ہے اور ہوا مخالف ہے۔ ہیلن کی زلفوں سے تیز ہوا کے جھونکے بدستیاں کر رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں دور سمندر کی حد پر گڑی ہوئی کتاب شفق کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ وہ دنیا و افہام سے بے خبر، سمندر کے تلاطم سے بے پردہ، زمانہ کی نیرنگیوں سے بے فکر، کسی اور ہی عالم میں مدھوش ہے۔ سپاہی بار بار اس کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں: ————— ”اگر یہ آسمانوں کی دیوی ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو کشتی ڈوب جاتی اور ہم سب مر جاتے۔ بھلا خداوند جو پیر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے!“

ہیلن نے کروٹ بدلی۔ طاعون کے ہاتھ خود بخود رک گئے۔ سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ کہنے لگی: —  
”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

مونی لس: ————— اسپارٹا!

ہیلن ————— نہیں۔ یہ اسپارٹا کا آسمان نہیں ہے  
کئی ہفتے گزر گئے اور شاہی بیڑا اسپارٹا نہ پہنچ سکا۔ ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ سامان رسد بھی ختم ہو گیا۔ چاروں طرف ہلاکت ہی ہلاکت نظر آنے لگی۔ بڑی مدت کے بعد آسمان پر کچھ مرغابیل دکھائی دیں۔ پھر کنارہ نظر آیا۔ مونی لس چلا اٹھا: — ”ہیلن! وہ دیکھو! اسپارٹا کا ساحل آگیا!“

ہیلن نے کہا: — ”نہیں یہ اسپارٹا کا ساحل نہیں۔ کوئی اور بستی ہے“

وہ اسپارٹا نہ تھا۔ مصر کی زمین تھی۔ کشتی رگی تو سب سے پہلے ہیلن بے دھڑک کنارہ پر اتر آئی۔ لب ساحل شاہی خیمے نصب ہو گئے۔ مصر میں اک دھوم مچ گئی۔ ”ہیلن آئی! ہیلن آئی! جنگ عظیم کی دیوی! حسینان عالم کی رانی! مشوقانِ جہاں کی ملکہ!“۔ مصر والے حیرت میں تھے۔ یہ کوئی بشر ہے، یا عورت، یا پری ہے، یا آسمان کا تارہ!  
ہیلن کو مصر کی سرزمین بہت پسند آئی۔ اس نے اپنے خاوند سے کہا: — ”کیسی حیرت انگیز زمین ہے! یہاں کی ہر چیز بے نظیر، بے عدیل، بے بدل! میں تو کہتی ہوں کہ تہذیب و تمدن میں بھی مصر، اسپارٹا اور ٹرے دونوں سے بڑھ کر ہے“

مونی لس ————— مجھے اتنی فرصت نہیں کہ یہاں کے تمدن کا اپنے تمدن سے مقابلہ کروں۔ ہمیں چاہئے کہ جلد سے جلد تمام سامان رسد فراہم کر لیں اور جہل نکلیں! میرے لئے ایک ایک منٹ پہاڑ ہو رہا ہے

ہیلن ————— اور شیربائیاں !  
 موتی لس ————— کیسی قربانیاں ! قربانیاں قطعاً غیر ضروری ہیں۔ ہمیں چلنے میں دیر نہیں کرنی چاہئے !  
 ہیلن ————— قربانیاں بہت ضروری ہیں۔ کیونکہ ہمارے ساتھی بد دل ہو رہے ہیں  
 موتی لس ————— تم انہیں بد دل نہیں کرو گی تو وہ بد دل نہیں ہوں گے۔ تم چلنے کو تیار ہو ؟  
 ہیلن ————— میں تیار ہوں  
 رات کو موتی لس اپنی چادر کے اندر ایک بھیری کا بچہ چھپا لایا۔ اس نے بچہ خداوند جو بیڑی کی تصویر کے سامنے فوج  
 آیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر دعاؤں مانگنے لگا۔ دیر تک دعائیں مانگتا رہا۔ ہیلن جاگ رہی تھی۔ دل ہی دل میں مسکراتے لگی۔ اور  
 خوش پڑی رہی  
 چند روز بعد کشتیان روانہ ہوئیں اور ہوا بھر مخالفت ہو گئی۔ نہ معلوم موتی لس کے نصیبوں میں کیا لکھا تھا۔ تند ہوا  
 شور سمندر، بد دل طلاح، ہر طرف ناکامی ہی ناکامی کا سامنا تھا۔ دوسرے دن کشتی جزیرہ مردہ کے ساحل پر جا لگی۔ پھر  
 بلن جلدی سے خشکی پر اتر آئی۔ موتی لس جبران تھا یہاں اترنے کا حکم کس نے دیا۔ اور کب دیا ؟ مگر وہ خاموش رہا  
 انکے سببا ہی بد دل تھے اور سمندر میں تلاطم تھا  
 ہیلن اس شور و ہنجرد میں بھی چاروں طرف گشت لگایا کرتی۔ یہاں نہ کوئی آدم نظر آتا نہ آدم زاد۔ نہ پیسے کو بانی  
 لھانے کو دانہ۔ سمندر کی شوریت نے جزیرہ کی مٹی کو زہر ملا بنا دیا تھا  
 کئی ہفتے گزر گئے۔ پھر سامان رسد گھٹ گیا۔ اور سپاہی بھوک سے پریشان ہونے لگے  
 موتی لس نے ہیلن سے کہا: ————— ”سمہر واپس چلنا چاہئے۔ ورنہ یہاں سب بھوک سے مرجائیں گے۔ مصر یہاں  
 ہے ایک ہی دن کے فاصلہ پر تو ہے۔“ ہیلن نے جواب دیا: ————— ”یہاں ایک دن بھی رگنا مناسب نہ تھا  
 جب تم اتنی مدت کیوں ٹھہرے ؟“  
 اسی وقت چند پریشان حال سپاہی اجازت لے کر خیمہ کے اندر داخل ہوئے اور کہنے لگے: —————  
 ”جہاں پناہ ! ہم نے ہمیشہ وفاداری سے آپ کا ساتھ دیا۔ مگر اب مجبور ہیں ساتھ دے نہیں سکتے۔ ہم نہیں  
 بہتے کی یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں۔ آخر ہمیں کس جرم کی سزا میں یہاں قید رکھا گیا ہے، جہاں نہ دانہ ہے نہ پانی۔ نہ  
 دم نہ آدم زاد۔ نہ چرند نہ پرند۔“ موتی لس ————— ہم مصر جانیکا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جاؤ تیار ہو جاؤ!۔ آج دوپہر  
 ملے نظر اٹھ جائیں!۔ جلدی کرو جاؤ کیوں نہیں جاتے؟ کیا کھڑے ہو؟ کیا کہتے ہو؟ کچھ اور کشا ہے؟ بولو؟  
 ”جہاں پناہ ! قربانیاں !“ (باقی آئندہ)  
 محمد اسحاق (امرتسری)

# انگریزوں کی آئینی آزادی

یوں تو ہر انگریز بادشاہ کا ماتحت ہے اور اس لحاظ سے اس کو انگلستان کی رعیت کہا جاسکتا ہے لیکن فی الحقیقت تمام فہری حقوق (Rights of Citizenship) جو کسی آزاد سے آداب ملک میں لوگوں کو حاصل ہیں وہ اس کو بھی حاصل ہیں اس لئے اس کو اپنے ملک کا (Citizen) کہنا چاہئے۔ بادشاہ سے اس کا تعلق قدیم نظام جاگیر (Suzerainty) کے زائے ہے۔ لیکن وہ تعلق اس قسم کا ہے کہ وہ قومیت کے ترقی میں مبین ہے اور (Citizenship) کے حقوق میں داخل نہیں ہے۔ اس کے اور عہد راج (ظہار انداز کر کے بھی آئینی اعتبار سے ایک نتیجہ اس کا یہ ہے کہ بادشاہ کو تسلیم کرنے کے بعد ہر شخص کو انگلستان میں رہنے سے تمام حقوق برٹش رعایا ہونے کے ہو جاتے ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر جب (Hanover) ہینور خاندان کا بادشاہ جارج اول تخت نشین ہوا تو (Hanover) جو جرمنی میں ہے وہاں کے لوگوں کو پارلیمنٹ میں بیٹھے اور ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا۔ یہ قہر ایک سرکہ الٹا مقدمہ میں اس وقت طے ہوا جبکہ یہ سوال اٹھا کہ بادشاہ جبکہ انگلستان کا راج پا گیا ہو تو وہ بچہ جو (Edinburgh) میں پیدا ہوا ہو وہ تخت پاسکتا ہے یا نہیں اور آیا وہ ملکی یا غیر ملکی سمجھا جاوے گا۔ اس مقدمہ میں یہ طے پایا کہ وہ ملکی سمجھا جاوے گا۔ اس طرح انگلستان میں صرف ایک چیز جو تنہا رہی ہے وہ بادشاہ کو تسلیم کر لینا ہے۔ اس کے بعد آدمی آدمی کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ جاتا بلکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا وہ پارلیمنٹ وغیرہ کا ممبر اور ووٹر بن سکتا ہے۔ وہ میونسپل ووٹر بھی بن سکتا ہے۔ سول یا ملٹری ملازمت حاصل بھی کر سکتا ہے اور بہ استثنائے چند حالتوں کے جلاوطن نہیں ہو سکتا لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ غیر ملکی کو بھی انگلستان میں چند حقوق حاصل ہیں۔ حالانکہ یہ پہلے نہ تھے۔ مثلاً ایک غیر ملکی وہاں زمین حاصل کر سکتا ہے۔ اور وراثت بھی زمین پاسکتا ہے اور بعض پیشوں کو بھی حاصل کر سکتا ہے مثلاً وہاں ڈاکٹر یا بیرٹر ہو سکتا ہے

فرانس اور امریکہ میں اس قسم کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ اور چونکہ وہاں کسی بادشاہ کی اطاعت وغیرہ لازم نہیں ہے اس لئے (Citizenship) کے حقوق پر وہاں بہت اہمیت دی جاتی ہے اور آزادی پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ ایک نقص ان کے نظام میں یہ ہے کہ جب کوئی نیا ملک امریکہ یا فرانس کے تحت میں ہوتا ہے تو وہ ایسے کسی مرکز کو نہیں پاتا جس کی طرف وہ رجوع کر سکے۔ جیسا کہ برٹش رعایا بادشاہ سے بہ آسانی رجوع کر سکتی ہے۔ دیگر ممالک میں وہ حقوق بھی غیر

لیکھوں کو حاصل نہیں ہیں جو انگلستان میں غیر ملکی برٹش رعایا کو حاصل ہیں مثلاً *Philippines* کے امریکہ کے تحت میں ہونے کے باوجود وہاں کے باشندوں کو امریکہ میں *Citizenship* کے حقوق حاصل نہیں ہو سکتے اسی طرح گواجمیر *Algeria* کے مسلمان فرانس کے ماتحت ہیں لیکن ان کو فرانس میں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ہر برٹش رعایا کو *British Citizenship* نہیں بلکہ *British Nationality* کے بھی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں عام طور پر *British Nationality* کے حقوق حسب ذیل دوہرہ حاصل ہو سکتے ہیں۔

- (۱) کسی برٹش ڈومینین (نوآبادی) یا برٹش جہاز پر پیدا ہونے سے
- (۲) باپ کے برٹش ہونے سے
- (۳) اس ملک کا باشندہ ہونے سے جو سلطنت برطانیہ میں شامل ہو جائے
- (۴) *Certificate of Nationalisation* حاصل کر لینے سے
- (۵) کوئی عورت اگر کسی برٹش سے شادی کرے تو یہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں

انگلستان کے ..... آئین کے اعتبار سے آزادی کو تین مختلف طریقہ پر تقسیم کیا جاسکتا ہے

- اول۔ پارلیمنٹ کی آزادی اور تاج کے حدود
  - دوم۔ باشندگان ملک کی روزانہ زندگی میں مداخلت کی کمی
  - سوم۔ قانونی شیرادہ بندی کی وسعت
- نمبر اول و دوم کے متعلق یہاں لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ پارلیمنٹ - تاج - اور قانونی فضیلت پر جو کچھ پہلے لکھا گیا ہے۔ اس سے اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہاں پر صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ایک انگریز اپنے طرز نظام کے ہر رخ اور ہر شعبہ میں اپنے دماغ - جسم اور جائیداد کی کمال آزادی چاہتا ہے۔ اور اسی کو نظام کا بنیادی اصول سمجھتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ملک کے نظام میں اس کے لئے شگے اور حدود نہیں ہیں۔ وہ تو موجود ہیں لیکن وہ ان کو فطری اصول نظم و تنظیم سے آگے تجاوز ہونے دینا نہیں چاہتا

نمبر ۳ کے ضمن میں خاص طور پر دو باتیں شامل ہیں۔ آزادی نقل و حرکت و آزادی تفسیر۔ قدیم زمانہ میں بادشاہ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اپنی رعایا میں سے جس کو چاہتا اگر قید کر سکتا اور قید کر سکتا تھا لیکن *Habeas Corpus Act* یعنی "قانون لزوم تحقیقات محبوس" نے جو مسئلہ عین اس

ہوا بادشاہ کے اس اختیار کا قطع قلع کر دیا۔ اس ایکٹ کی مد سے تمام برٹش رعایا ہر قسم کے جس بے جاے محفوظ رکھی گئی ہے۔ گورنمنٹ کا کوئی افسر کسی شخص کو بے جا قید نہیں کر سکتا۔ اور اگر گورنمنٹ یا کوئی افسر یا کوئی معمولی آدمی کسی کو جس میں رکھے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی اعلیٰ میں لائی جاتی ہے۔ اس اصول کا نفاذ تو بہت پہلے سے تھا لیکن یہ ایکٹ اس وقت پاس ہوا جبکہ بریوی کونسل نے ایک شخص مسی فرانسس جنکینس (Francis Jenkins) کو ایک سیاسی تقریر کی وجہ سے قید کر دیا تھا۔ اور اس فیصلے کے خلاف کوئی عدالت اندج سننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ اسی ایکٹ کی رو سے رعایا کو یہ بھی حق دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص فوجداری کے کسی جرم میں قید کیا جائے یا حوالات میں بند کیا جاوے تو اس کی طرف (Lord Chancellor) یا جج کو عرضی دی جاسکتی ہے کہ (Habeas Corpus) کے ذریعے اس افسر کو حکم دیا جاوے جس نے اس کو تجبوس کر رکھا ہے کہ وہ فوراً عدالت میں اس کو حاضر کرے۔ اس حکم کے جاری ہوتے ہی جج کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ دو دن کے اندر اس کو بلا ضمانت یا ضمانت پر چھوڑ دے۔ اگر جج ایسا نہ کرے تو پانچ سو پونڈ تک جرمانہ کا مستحق ہوگا۔ اس قانون کو مشتمل ۸۵ء کے (Bill of Rights) نے اور بھی مضبوط کر دیا کیونکہ اس سے بہت بھاری ضمانت طلب کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ ۱۸۱۶ء کے ایکٹ نے اس قانون کی وسعت کو اور بڑھا دیا کیونکہ اس ایکٹ کی رو سے علاوہ فوجداری کے جرائم کے اور کسی قسم کی گرفتاری اور قید پر بھی یہ ایکٹ نافذ تھا۔ یہ ایکٹ ایسی کارروائیوں میں دخل نہیں دیتا جو جائز ہیں۔ مثلاً قانون فوجداری کی رو سے بعض دفعات کے تحت میں ملزم کی گرفتاری جائز ہے۔ اسی طرح عدالت عالیہ کے جج کو توہین عدالت کرنے میں ملزم کو قید کرنے کا اختیار ہے پارلیمنٹ بھی خاص صورتوں میں بعض لوگوں کو قید کرنے کی مجاز ہے۔ جنگ کے زمانہ میں (Defence of the Realm Act) کے ذریعے کچھ اختیارات قید کرنے کے اور نقل و حرکت روکنے کے حاصل کئے گئے تھے۔ ایسی صورتوں میں (Habeas Corpus Act) کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی کی آزادی کو قطعی روک دے سوائے اس حالت کے جبکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگنے والی ہے تو (Habeas Corpus) کی کارروائی اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ اس ایکٹ کی کارروائی رائے کا حق صرف بادشاہ کی رعایا ہی کو نہیں بلکہ اوروں کو بھی حاصل ہے۔ یہاں پر ایک مقدمہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا (James Somerset) ایک حبشی غلام تھا۔ وہ (Virginia) سے ۱۷۷۲ء میں انگلستان لایا گیا۔ وہ اپنے مالک کے پاس سے بھاگ گیا۔ مگر گرفتار کر کے ایک جہاز پر بٹھایا گیا۔ اس غلام کی طرف سے (Habeas Corpus) کی کارروائی کی گئی اور جب جہاز واپس آیا تو لارڈ جسٹس فیملڈ (Lord Mansfield) جو اس وقت (Chief Justice) تھے،

تھے یہ فیصلہ کیا کہ غلام، ننگ تہذیب و تمدن ہے اور کوئی چیز غلامی کی حامی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ رہا کر دیا گیا۔ انھوں نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ انگلستان کی فضا غلامی کے تحنیل کو برداشت نہیں کر سکتی۔ شاید ہمارے ہندوستانی بھائی اس مسئلہ کو ایک حال کے واقعہ سے زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ ہمارے ایک دوست حال میں ایک نوکر اپنے ساتھ ولایت لے گئے۔ انگلستان میں نوکر اور مالک میں وہ امتیاز نہیں ہے جو یہاں ہے۔ وہاں اس کے ساتھ سفر کرتا کھانا کھانا عیب نہیں ہے بلکہ ( *the same as the master* ) کا لفظ جیسا اوروں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اس کے ساتھ بھی ہر وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ایک بہت بڑے پنشن یافتہ افسر نے جو ہندوستان میں بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ بھی امتیازی برتاؤ کرتے تھے جب ان کی دعوت کی تو نوکر کو بھی اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور اپنے دلہنے ہاتھ پر موٹر میں بٹھا کر سیر کر دئی۔ ہندوستان میں اس کے خلاف جو نوکر کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہے وہ سب پر روشن ہے

فرانس میں بھی ستمبر ۱۸۴۸ء ایک اس قسم کا مقدمہ ہوا تھا۔ اس میں بھی غلام کے موافق طے پایا تھا۔ لیکن امریکہ کا آئین کچھ اور کہتا ہے۔ وہاں کے آئین کے الفاظ یہ ہیں کہ ”جو آدمی کسی خدمت یا مزدوری کے لئے مقرر کیا جاوے اور وہ بھاگے تو وہ جھوٹا نہیں جائے گا بلکہ وہ اس مالک کے حوالے کیا جائے گا۔ جس کی مزدوری وہ کرتا تھا۔ قانون کی یہ بندش انگلستان کے مندرجہ بالا مقدمہ ہی کی وجہ سے ہوئی اور اس سے دونوں اقوام کے تحنیل کی روشنی معلوم ہوتی ہے

آزادی تقریر یا تحریر آزادی کا سب سے اہم جڑ ہے۔ اسی حق آزادی کے ذریعہ سے انسان اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ اور اخلاقی تمدنی و سیاسی اصولوں کی تبلیغ کر سکتا ہے۔ تہذیب کے ارتقا میں اس آزادی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے اور جن اقوام نے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں کیا وہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں

انگلستان میں یہ حق دو چیز سے حاصل ہے

(۱) *Rule of Law* ، یا آئینی دستور

(۲) آزادی کا وہ قومی جذبہ جو قوم کے آئینی ضمیر کو ہمیشہ جلا دیتا رہتا ہے

اگر ان دونوں اصولوں کے فلسفہ پر پورے طور سے غور کیا جاوے تو معلوم ہو جائے گا کہ انگلستان نے اپنے باشندوں کو تقریر و تحریر کی پوری آزادی دی ہے مگر اسی کے ساتھ قانون کے ذریعہ سے آزادی کو اس قدر منظم کر دیا ہے کہ یہ آزادی بیجا طور پر استعمال نہیں ہو سکتی۔ وہ لوگ ملک کے فائدہ کے لئے ہر طرح کی نکتہ چینی کر سکتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ کسی کو بے جا طور پر ذلیل نہیں کر سکتے۔ اور نہ کسی کو بے جا نقصان پہنچا سکتے ہیں ( *Lord Mansfield* )

لکھتا ہے کہ پریس کی آزادی اس پر منحصر ہے کہ کسی چیز کی اشاعت کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہ ہو لیکن قانونی نتائج نظر سے فوگنڈا سٹ نہ کے باور میں

ایک اور انگریز ماہر آئین لکھتا ہے "ہمارا موجودہ قانون ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جو می چاہے کہے۔ لکھے اور شائع کرے۔ لیکن اگر وہ اس آزادی کا بے جا استعمال کرے تو موجب سزا ہوگا۔ اگر وہ کسی شخص پر بے جا حملہ کرے تو دوسرا شخص نقصان کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی چیز لکھے اور شائع کرے جس سے بد اخلاقی پیدا ہو یا بغاوت پھیلے تو بد اخلاقی اور بغاوت کے جرم میں سزا یاب ہو سکتا ہے۔" اسی آزادی کی اہمیت کے تحت میں بعض ایسے مستثنیات میں جن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً پارلیمنٹ میں جو کچھ کہا جائے یا عدالتی کارروائیاں یا وہ خطوط وغیرہ جو درمیان وزما کے یا وزما اور بادشاہ کے ہوں یا وہ کاغذات جو پارلیمنٹ کے حکم سے شائع کئے جاویں یا صحیح رپورٹ عدالتی کارروائی کی لیکن ان مستثنیات کے قائم کرنے میں بھی لوگوں کے حقوق کے لحاظ سے چند بندشیں رکھی گئی ہیں۔ مثلاً جہاں پارلیمنٹ کی تقریر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی وہیں اس تقریر کی اشاعت پر قانونی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ یا مثلاً بغاوت کا قانون تو یہ کہتا ہے کہ جو شخص ایسے الفاظ استعمال کرے۔ جس سے بادشاہ کی توہین ہو یا اس کے خلاف تنہر پیدا کرے یا کسی قسم کی شورش برپا کرے تو وہ سزا یاب ہوگا لیکن عام طور پر مقدمہ اس وقت تک نہیں چلایا جاتا جب تک کہ نقص امن کا بے حد خطرہ نہ ہو دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ (Reason) کے الفاظ کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ "ذہانت کو سزا دینا فی الحقیقت اس کی قوت اور تیزی کو بڑھاتا ہے اور ضبط شدہ تحریر کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں کچھ چنگاری سج کی ضرور ہے جو اون کے چہرہ پر لگتی ہے جو اس کو دبانا چاہتے ہیں"

ماحول یہ ہے کہ انگریزی آئین اپنی قوم کو نظم کے دائرہ میں رکھ کر اون کی روح کو تازگی بخشتا ہے۔ اون کے دماغ کو منور کرتا ہے۔ اور اون کے جسم کو قوت دیتا ہے۔ اوس کے ذریعہ سے انھیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ اور اون کے حقوق کا کامل تحفظ ہے

ایس۔ ان۔ جعفری

## دواہلی شاہکار

شوہنار۔ فلسفہ شوہنار پر ایک بمبش تبصرہ۔ ہمدرد (علاوہ محمول)

مثنوی زہر عشق۔ مہلہ مد رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت ہمدرد (علاوہ محمول)

مینجر نگار لکھنؤ

# تاریخ ہند کا ایک ورق

## ہندھیلکھنڈ کا موتی

(دو ایکٹ کا مختصر ڈرامہ)

### ایکٹ اول — پہلا منظر

(تاریک رات ہے اور جمیل ندی چٹانوں اور سنگ دیروں سے ٹکرا کر گراتی ہے۔ تاریکی کو اور بھی بھانگ بنا رہی ہے۔ ندی کے دائیں جانب ساحل پر ایک ٹکڑا ہے جس پر ایک بہت پرانی گڑھی قائم ہے۔ خسیوں پر گھاس اور کاٹی سے ایک خاص کیلگی پیدا ہو گئی ہے جس کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہیبت معلوم ہوتی ہے۔ اندر گڑھی کے ایک الاں میں سارندہ اور سیٹلا دیوی بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہیں)

سارندہ۔ یو لو سیٹلا یو پو چھپائے کا کام نہیں تمہا چوتنی بھی ہوا اور راجپوت کی بیوی بھی۔ تم کو کوئی بات چھپانا نہ چاہئے

سیٹلا دیوی۔ تم خفا ہو گئی۔ اور سو امی بھی اگر نہیں گئے تو خفا ہوں گے اس لئے اب نہ پوچھو، جلتے دو

سارندہ۔ ٹالو نہیں، اب میں بغیر ٹوچے نہ رہوں گا اور تمہیں بتانا پڑے گا

سیٹلا دیوی۔ میں نے کتنی بار ان سے بقی کی پاؤں پڑی کہ

میری آنکھوں کے سامنے سے گئیں نہ جاؤ مجھے یہود دار لے چلو ہند راہیں لے چلو۔ اچھو دھیا کے درشن کر لاؤ، رسی کیس، ہریاگ بدری ناتھ لے چلو۔ اپنے ساتھ جنگلیں رکھو۔ مگر یہ بیوگ کسی طرح نہیں سما جاتا کہ پہاڑوں دیا بانوں میں اپنی جان دیتے پھرو۔ ہر تو میں قسمت کی بیٹی ہوں کہ میں کسی ہتیار سے سو امی کے دل پر قابو نہیں سارندہ۔ دھاتن کر، کیا سیٹلا دیوی تمہا جاتی ہو کہ جیٹا جیٹو

سیٹلا دیوی۔ پورے تین برس ہو گئے کہ پران ناتھ کو چین سے بیٹھنے کو نہیں ملا، رام جانے وہ کون لوگ ہیں جسکے دن آرام سے گنتے ہوں گے

سارندہ۔ دو تک کر، کیوں، سیٹلا، کیا ہوا؟ کیا بھیتا کے

طرح میں تم کو لکھ نہیں ملا

سیٹلا دیوی۔ نہیں، ایشور نہ کرے کہ میں ایسی چٹا کروں

پرنتو



کے لئے پرکاشنگ کا ٹیکہ لگا دیں کیا تمہاری رہنمائی کی خاطر وہ اپنا نام میٹ دیں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ دشمنوں سے لڑنے کی جگہ تمہاری سہرا کے لئے محل میں بیٹھے رہیں۔ (غصہ سے) تم کو کیا معلوم کہ اس وقت کیا حال ہے، اور دشمنوں نے کیسا گھبراہٹ کیا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ چوڑیاں پسینہ بھر جائیں۔ یاد رکھنا سیتلا دیوی ایشور نہ کرے اگر دشمن جیت گئے تو تمہاری آج کی خبر نہیں۔“

(دروہہ لکھتا ہے اور ایک طویل اقامت نوجوان اندر داخل ہوتا ہے)

سیتلا۔ (غشی سے اُٹھ کر) سارن۔ لو وہ آگئے  
سارن۔ (شکرانہ آواز میں) بھیا۔ یہ کہنے کیسے بھیگے ہیں؟  
کیا پانی برسا ہے؟  
انروہ۔ نہیں اندی پار کر کے آیا ہوں  
سیتلا۔ ایشور نے بڑی خبر کی آج کل ندی باز ڈھ پر ہے  
سارن۔ اختیار کیا ہوئے؟  
انروہ۔ چھن گئے!  
سارن۔ اور ساتھی!  
انروہ۔ کام آگئے!

سارن۔ سیتلا کی طرف دیکھ کر سیتلا، یہ سب تمہارے کارن ہوا۔ تم نے کنبہ کی ناک کٹوا دی۔ اب تو کلیجہ میں ٹھنڈک بڑی  
انروہ۔ نہیں اس میں سیتلا کا قصور نہیں ہے۔ خود میں نے دھوکا کھایا

سارن۔ تو پھٹا، شاباش ہے تم کو۔ گر پڑکھوں کی ناک کٹوا کر اپنی صورت دکھانے یہاں آئے ہو، مہاجوت تو باپنہوا

کی آن کبھی نہیں کھوتے،

(انند کچھ دیر تک سوچتا رہتا ہے اور پھر باہر چلا جاتا ہے سیتلا پیچھے دیکھ جاتی ہے انند کو پکارتی ہے۔ لیکن انروہ فصل کی دیوار بجانہ کرات کی تانگی میں غائب ہو جاتا ہے۔ اور سیتلا چٹان پر بیٹھ کر روتے لگتی ہے)

سارن۔ سیتلا کہاں ہو

سیتلا۔ یہاں اپنی قسمت کو رو رہی ہوں

(سارن بھی جاتی ہے)

سارن۔ کیوں روتی ہو!

سیتلا۔ (ناگن کی طرح بل کھا کر) کیا باپ دادا کی آن اتنی پیاری ہے

سارن۔ (غصہ سے تیور کر) ہاں، ہے

سیتلا۔ اپنا پتی ہوتا تو کلیجہ میں بٹھالیتیں

سارن۔ کلیجہ میں۔ بالکل جھوٹ۔ تلوار جھوڑتی

سیتلا۔ (غصہ سے) جھوٹ۔ ڈولی میں چھپاتی پھر دگی۔ خیر،

دیکھا جائے گا۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات!

دوسرا منظر

(سارنہ سیتلا دیوی آپس میں مصروف گفتگو ہیں)

سیتلا۔ آج پورے ۳ مہینے ہو گئے مگر کچھ خبر نہیں ملی

سارنہ۔ شیر کچھار میں ہو گا۔ خبر کیا ملتی

سیتلا۔ سارن۔ تم نے اس رات بہت رولایا

سارن۔ لیکن پڑکھوں کی آتماؤں کو خوش کیا

سیتلا۔ (چونک کر) سارن۔ یہ سنگھ کی آواز کہاں سے

آ رہی ہے

سارن۔ (کان لگا کر) ہاں راجپوتی آن پر جان دینے والا

راجہ ازودھ سنگھ آگیا۔ مبارک ہو

سیتلا۔ (دور ستر سے) کہاں۔ کہاں

(آقاؤں اور قریب ہوتی جاتی ہے)

سارن۔ مہرہ، میرا دل بول رہا ہے کہ ہونہ ہو دہی ہیں

سیتلا۔ ایسا تو ایسا ہی کرے

(دروازہ کھلتا ہے اور ازودھ سنگھ داخل ہوتا ہے)

سیتلا۔ بران ناتھ۔۔۔۔۔ (قدموں پر گر پڑتی ہے)

سارن۔ بھیا۔ بھیا

ازودھ سنگھ۔ سارن میں مہرونی کا قلعہ فتح کر کے آ رہا ہوں

اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر چکا ہوں کہ راجہ چیمپ رائے

بندیلہ کے ساتھ تمہارا بیاباہ کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔

منظر سوم

(رات کا وقت ہے ورناس میں روشنی ہو رہی ہے۔ رانی سیتلا)

اور ہمارا راجہ ازودھ سنگھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں)

ازودھ سنگھ۔ رانی کچھ سنا

سیتلا۔ نہیں، کیا ہوا

ازودھ سنگھ۔ دیکھو یہ ایک پتر کسی کا آیا ہے جس میں لکھا

ہے کہ راجہ چیمپ رائے بنو دیہ راجپوت نہیں ہے

سیتلا۔ کیا یہ صحیح ہے

ازودھ سنگھ۔ بالکل جھوٹ۔ میں خوب جانتا ہوں وہ راجہ

پورن چند کے راجکار ہیں۔ اور پورن چند راجہ

ادیاجیت کے پتر تھے۔ جو راجہ پنچم اور وہ بیر بھدر

کے خاندان سے تھے۔ بھلا میں نے جو بات طے کی

تھی وہ جھوٹ ہو سکتی ہے

سیتلا۔ پھر کب تک اس کو ٹالے گا۔ بیاد ہو جائے تو اچھا ہے

ازودھ سنگھ۔ ہاں ارادہ ہے کہ اگلے مہینہ میں فارغ ہو جائیں

کیونکہ خبر آئی ہے کہ محی الدین اورنگ زیب اس طرف

سے گزریں گے اور عجب نہیں کہ دلیہمد بہادر کے خلاف

جنگ مقصود ہو۔ اور پھر میں جنگ میں چھٹن جاؤں

اور یہ کام وہ جائے

سیتلا۔ سہمی کیا لڑائی آپ ہی کے لئے بنائی گئی ہے

ازودھ سنگھ۔ ہاں رانی راجپوت کے گھر میں پیدا ہونے کا

یہی بھلاؤ ہے

منظر چارم

(دروازہ آدراستہ ہے درمیان میں آگ جل رہی ہے پروہت

ہون کر رہا ہے۔ ہون کے غم پر بندیلہ راجہ کا قوی تر لگا گیا

جاتا ہے۔ اور راجہ چیمپ رائے کا بیہ راجکاری سارنہ سے

ہوتا ہے)

ازودھ سنگھ۔ پروہت اب تم بھونری پھیرو

پروہت۔ جو حکم

(پروہت بھونری پھیرتا ہے)

درباری۔ راجہ چیمپ رائے، مبارک

ازودھ سنگھ۔ چیمپ رائے۔ میں بھی تم کو مبارکباد دیتا ہوں

لیکن اسی ملک میں چاروں طرف جنگ کا دیوتا سنگھ

بھونک رہا ہے کہیں تم اس شادی کے۔ ویش و عشرت

میں نہ بڑھانا، لویہ بیش قیمت خوجو خوجو شاہ اکبر کے میرے

بڑے بھائی کو عطا کیا تھا۔ وہ تم اپنی کرے باندھو لیکن اس

خوجو کو لے کر قسم کھاؤ کہ تم حق کے لئے جان دینے سے

درلجے نہ کرو گے۔ یاد رکھو نہ ہیلکھنڈ کے پاس ببادریہوں

کی بہت کمی ہے۔ اس لئے اس مبارک خوجو کی عزت

حرمت اب تمھارے ہاتھ ہے

درباری۔ جے۔ سارا ج اندھ سنگھ کی جے۔ بندیلہ راج

کا بول بالا ہو

راجہ چمپت رائے۔ خنجر کو چم کر میں بڑول نہیں ہوں

یقین رکھئے۔ چمپت رائے کے رگوں میں بندیلہ خون دود

رہا ہے۔ اگر میں بندیلہ دھار کو گرائے کی کو شستن کروں گا

تو سب سے پہلے یہ خنجر میرے قلب میں لہرائے گا۔

درباری۔ جے ہو۔ راجہ اور چمپت کی جے ہو

پروہت۔ راجہ چمپت رائے اس مقدس اگنی کو دیکھو

چمپت رائے۔ دیکھ رہا ہوں

پروہت۔ خنجر کو چم مو

چمپت رائے۔ خنجر کو بیان سے باہر نکلتا ہے اور چومتا ہے

پروہت۔ کو میں راجپوتوں کی سمجھا میں اقرار کرتا ہوں کہ

جب تک بندیلہ راج کی گزشتہ شان و شوکت پائیں

نہیں آئے گی۔ اس وقت تک قلمہ اور پتھار پر آزادی

کا پرچم نہیں لہرائے گا۔ جب تک کہ دراستریاں بندیلہ

راجدھانی میں ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک بے

کھٹکے نہ چلی جائیں گی۔ تم چہیں سے نہ

بیٹھو گے کیا یہ پرتگیا کرتے ہو

چمپت رائے۔ (تلوار سے قسم کھا کر) ایسا ہی ہوگا

اندھ سنگھ۔ اچھا اب آپ سارن کو لے کر اور چھ سداڑے

سب انتظام مکمل ہے (بے تاب ہو کر رونے لگتا ہے)

درباری۔ مہاراج۔ آئو بہانا آپ کے لئے مناسب نہیں ہے

سنگھ چنگ رہا ہے۔ سارن اور چھا

روانہ ہوتی ہے)

اندھ سنگھ۔ کیا مجھ کو اپنی سب سے پیاری بہن سے ہمیشہ

کے لئے چھٹنے کے بعد آئو بہانے کا حق حاصل نہیں ہے؟

درباری۔ مہارانا۔ اسی لئے تو کنیا کا دان بھرا ہوتا

ہے صبر کیجئے ورنہ راجکاری سارن کو ڈولہ میں

قرار نہ دے گا

(اندھ سنگھ نہ حال ہو کر غمت پر گر پڑتا ہے)

منظر پنجم

(دربار عام میں چمپت رائے تقریر کرتا ہے)

چمپت رائے۔ درباریو۔ آج تم سے رخصت ہوتا ہوں

اور اپنا تاج و تخت اپنی خوشی سے اپنے قوت بازو

پہاڑ سنگھ کے سپرد کرتا ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ میں

نے تخت نشین ہوتے ہی سلاطین مغلیہ کو خراج دینا بند

کر دیا تھا۔ لیکن اب میں مصلحتاً اطاعت کرنا چاہتا

ہوں۔ میں اپنی فوج کا بھی لشکر یہ ادا کرتا ہوں جس نے

میرے اشاروں پر اپنے گھر بار کو چھوڑا۔ اور ہتیلی پر

جان لے کر میرے احکام بجا لائے۔ اچھا

اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ پہاڑ سنگھ۔

اور چھا کی راجدھانی پر تم کو براہماں ہونا۔ مبارک

درباری روئے نکلے ہیں۔ اور رانی سارندہ اپنی

سیلیوں کے ساتھ داخل ہوئی ہے)

عورتیں۔ مہارانی ہم کو چھوڑ کر کہاں چلیں

رانی۔ سوامی کی ایچھا سب سے مقدم ہے

پہاڑ سنگھ۔ اچھا اس شرط پر میں نکھاسن پر پٹھوں گا کہ

جب آپ اور چھا واپس تشریف لائیں تو سنگھان

آپ ہی کا ہے۔

درباری - ہاں ضرور شاہش بہاؤ سنگہ - بندیرا محل میں  
کا بھی طریقہ ہے

چمپت رائے - اچھا رخصت

(سارنہ اور چمپت رائے جاتے ہیں)

منظر ششم

(نظام الدین کا شکستہ غلطہ)

چمپت رائے - جگن سنگہ - رانی سارن

چمپت رائے - جگن سنگہ کیسے آئے

جگن سنگہ - مہارانا - شیر باد دینے آیا ہوں

چمپت رائے - سب پر ماتا کا احسان ہے

جگن سنگہ - اعلیٰ حضرت نے بہت خوشی کا اظہار کر کے آپ کو

کاتبی کی بیش قیمت جاگیر عنایت کی ہے - اس سے زیادہ

احسان پر ماتا کا کیا ہو سکتا ہے ؟

چمپت رائے - ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن آثار اچھے نظر

نہیں آتے ہیں - بادشاہ سلامت کا اب آخری وقت

ہے - بھائیوں میں رقابت ہے - اور میرا خیال ہے کہ

شہنشاہ دہلی دکن میں ہے

جگن سنگہ - اس بساط کے منہ سب خطرناک ہیں

چمپت رائے - ہاں لیکن اقبال محی الدین ہی کے سرے

جگن سنگہ - تو ہم لوگ کیا کریں

چمپت رائے - ہم تو تلوار کے دھنی ہیں - جو تلوار کسے گی وہی

ہوگا - لیکن ہوگا بڑا بڑا - خون کی ندیاں بہیں گی

جگن سنگہ - رام نہ کرے ————— (جاتا ہے)

(دانی سارن محل سرا میں بھی ہوئی ہے - اور چمپت رائے

داخل ہوتا ہے)

چمپت رائے - تم نے سنا - کالبی کی ایک نو لاکھ سالانہ

کی جاگیر جملہ آج دربار میں عطا ہوئی ہے اتنوخوش ہو

سارن - یہاں ناٹھ آپ کی عزت بڑھی میں بھی خوش ہوئی

ایشور آپ کو اس سے زیادہ عزت دے

چمپت رائے - سارن تم اُداس کی کیوں ہو - کہو کیا ہوا - تم

جب سے آئی ہو کچھ کھوئی ہوئی سی رہتی ہو - بولو کیا بات ہو

سارن - پران ناٹھ - یہ خیال غلط ہے

(روئے لگتی ہے)

چمپت رائے - کوئی بات ضرور ہے تم روتی کیوں ہو ؟ سچ کہو

کیا بات ہے

سارن - (روئے ہوئے) آپ یہ نہ بوجھئے - اس کو ایسا ہی کہتے

دیکھئے - ہاں یہ سچ ہے کہ آج کل میں کچھ اُداس سی

رہتی ہوں

چمپت رائے - (جس میں ہنر) کیوں ؟ اور چھامیں کیا

تھا جو یہاں دہلی میں نہیں ہے ؟

سارن - (تاگن کی طرح بل کانکر) ہاں اور چھامیں رانی تھی

دلی میں جاگیر دار کی باندی ہوں ————— کوئی گھوڑے

پر چڑھ کر گدھے پر نہیں بیٹھا - سو امی آپ بڑا زانہیں

آپ نے یہ آرام دہین بیتے سنگے داموں خریدے

چمپت رائے (دشندر ہو کر) میں تمہاری ردعانی غلطہ

سے بے خبر تھا - آج آنکھیں کھل گئیں ایک پردہ تھا

جواٹھ گیا - (روئے لگتا ہے)

اچھا سارن چمپت رائے بندیلہ راجہ ہے اور رانوں

رات دہلی کو چھوڑ دے گا - اب —————

سارن - سو امی - ٹھیرنے کوئی پرنگیا نہ کیجئے - دربار شاہی

سے اجازت لے کر آپ اور چھا جانے کا ارادہ کریں۔

راجپوت پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگتا ہے

چمپت رائے۔ مناسب ہے۔ آج دربار میں تذکرہ کروں گا  
منظر ہفتم

(راجہ چمپت رائے دربار سے اجازت لے کر اور چھا واپس آگیا ہے۔ اور

سارا باندھیل کھنڈ اس خوشی سے نال ہو گیا ہے۔۔۔ انی ساندہ بھی بیت

خوش ہے۔۔۔ اسی عرصہ میں شاہجہاں بیار پڑا ہے۔ شہزادوں میں پچھلے ہی

سے رقیبہ جگمگاتی۔ اس خبر کے ساتھ ہی دونوں کا غبار ظاہر ہو گیا۔ فرد

دہی الدین دکن سے چل کھڑے ہوئے۔ برسات کا موسم ہے دھول پر رے

قریب جیلانی ندی کے کنارہ غورین جنگ نے محی الدین کو مجبور کیا ہے۔ کہ وہ

چمپت رائے سے مدد طلب کرے)

راجہ چمپت رائے۔ حاکم صاحب۔ میں مدد کرنے کو تیار تو ہوں

لیکن ولیعہد کے خلاف ہوگا

سفیر۔ ہمارا جہ اس وقت تو آپ کو شہزادہ محی الدین کی امداد

کرنا پڑے گی۔ آپ کو معلوم ہے شہزادہ کو بڑی تشویش ہے

عین دریائے جہل کے کنارہ شاہی فوج پرے جٹے کھڑی ہو

اس حالت میں تو آپ کو مدد کرنا ہی چاہئے

(چمپت رائے کچھ غلغلہ گفتگو کرتا ہے)

سفیر۔ ہمارا جہ آپ پر بڑا بھروسہ ہے۔ آپ کی امداد انشا اللہ

رائگاں نہ جائے گی۔ اور اس کے علاوہ الطاف خسروانہ

سے بھی آپ محروم نہ رہیں گے

ہمارا جہ۔ خاندان صاحب آپکا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن یہ معاملہ

ملکی حیثیت سے بھی اہم ہے میں اس معاملہ میں ذرا ذمہ دار

عمدہ داروں اور فوجی افسروں سے بھی مشورہ کر لوں۔

اوس کے بعد آپ کو شام تک اطلاع دید وں گا

(خانصاحب جاتے ہیں)

(پردہ مٹتا ہے)

(رائی سارن ایک کتاب دیکھ رہی ہے)

چمپت رائے۔ سارن، شہزادہ محی الدین کا پیغام آیا

ہے کہ داراشکوہ کے خلاف تلوار اٹھاؤں تمہاری کیا

رائے ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ اس پاریس محی الدین

ہی ایک سچا موتی ہے اور باقی سب جھوٹے ہیں۔ فتح

دیکھنا محی الدین ہی کی ہاتھ رہے گی۔ خون بہت بہیگا

سارن۔ آپ کو محی الدین کی مدد کرنا چاہئے

چمپت رائے۔ خوب سوچ لو۔ داراشکوہ سے عداوت مولیٰ لیتا ہے

سارن۔ اچھا میں بھاگوت میں سری کرشن جی سے مشورہ

مانگتی ہوں

(بھاگوت بند کر کے سری کشن جی کا دھیان کر کے

بھاگوت کھولتی ہے)

دیکھئے۔ پہلے ادھیان کے اشلوک ۲۸-۳۱-۳۲ میں

سری کشن جی فرماتے ہیں کہ "اے کرشن مجھے اپنے قریبی

رشتہ داروں کو دیکھ کر جو جنگ کے لئے یہاں اکٹھے

ہوئے ہیں بھلائی نظر نہیں آتی کیونکہ اپنے رشتہ داروں

کو مار کر نہ مجھے کامیابی اور نہ سلطنت اور نہ راحت کی

خواہش ہے" اے ارجن مخنوں کا طریقہ اختیار نہ

کر تیرے لئے یہ زیبا نہیں اے دشمنوں پر فتح پانیرا لے

بزدلی اور پست ہمتی کو چھوڑ کر کھڑا ہو۔" اے ارجن

جو سوچنے کی بات نہیں اوس کو سوچتے ہو اور اہل علم کی

باتیں کرتے ہو حالانکہ اہل علم کسی شخص کی موت یا زندگی

کی فکر نہیں کرتے "اے ارجن اگر تو جنگ میں کام آئیگا

تو سو رگ میں جائے گا اور اگر فتح پائے گا تو تجھے روئے  
زمین کی بادشاہت ملے گی۔ اس لئے اے کنتی کے لڑکے  
جنگ کی ٹھان کر اٹھ

”تمہارا ادھکار افعال تک ہی محدود ہے نہ کہ اُن کے  
فرائض پر خراج کی غرض سے افعالِ عمل میں نہ لا البتہ افعال  
کے ترک سے بچ“

سوامی۔ اب کیا ہے۔ دیکھئے سری کشن جی نے صاف  
صاف بتلادیا کہ

راجہ چمپت رائے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن بیابان بڑا خشک  
سارن۔ پران ناٹھ۔ ”میں واقف ہوں۔ منزل کٹھن  
ہے۔ قدم قدم پر کانٹے ہیں۔ ہمیں اپنے سپاہیوں کا  
خون پانی کی طرح بہانا پڑے گا۔ ہم اپنا خون پانی ایک  
کریں گے اپنے بھیلے بہادروں کا سر کٹوائیں گے۔ اور  
چنبیل ندی کا گھاٹ بنائیں گے۔ لیکن سوامی یاد رکھنا  
جب تک چنبیل کا دھارا جلال و عفت کے ساتھ اپنے  
منہ کا پھین اگلتا ہے گا تو ہمارے سرفردشوں کا خون  
لعل بن بن کر روشن رہے گا۔ اور جب تک بندیلہ قوم  
کا نام لیوا دنیا میں باقی رہے یہ خون اس کے لہتے پر  
کیسر بن کر چلے گا“

چمپت رائے۔ اچھا پیاری سارن ابھی شہزادہ محی الدین  
کو جواب بھیج دیتا ہوں

(ماتا ہے)

(پردہ گزرتا ہے)

منظر ہشتم

(برسات کا زمانہ ہے۔ آسمان بادل ہی بادل نظر آ رہے ہیں غم سے)

سرفردش بندیلوں کی کالی ٹکٹا اٹھتی ہے۔ اور چنبیل ندی پر بچا جاتی  
ہے ہر سپاہی ”برس“ سے جھوم رہا ہے۔ مانی سارن اپنے دروڑوں  
راجماروں کو لکھتے سے لگتی ہے اور راجہ چمپت رائے کو بان کا بیڑہ دیتی  
ہے ہتیار رکھتی ہے اور دستار پر کھنی مرصع لگاتی ہے)

رائی سارن۔ راجکارو، اب بندیلہ قوم کی لالچ تمہارے  
ہی ہاتھ ہے دیکھنا لڑائی سے منہ موڑ کر نہ آنا۔ بندیلہ  
قوم کے دقار کو قاتل رکھنا۔ کوئی بچہ بولہ بھایا عورت سامنے  
آئے تو تلوار کو اس بے گناہ خون سے آلودہ نہ کرنا۔ جاؤ  
راجکارو جاؤ۔ دیر ہوتی ہے شہزادہ محی الدین  
کو تم لوگوں کی ضرورت ہے۔ اور تمہارے پتا  
زبان دے چکے ہیں۔ دیکھو کہیں اون کو شرمندگی نہ ہو  
دونوں راجکارو۔ ماما جی۔ جیسی آپ کی اگیان ہوگی ویسا  
ہی ہوگا

(رائی سارن دونوں کو لگے لگتی ہے)

(راجکارو جاتے ہیں)

راجہ چمپت رائے۔ سارن۔ راجکاروں کو رخصت کر دیا  
تمہاری ہمت کی داد دینا چاہئے

رائی سارن۔ ایشور کی سہایت چاہئے ورنہ میں ایک مکڑور  
عورت کیا کر سکتی تھی وہی صبر دیتا ہے۔ میں نے کیا کیا  
وہ امانت قوم ہی کی تھی۔ اوس کے دینے میں جھگو کیا  
عذر ہوتا

چمپت رائے۔ سارن (ہاتھ لے کر) پیاری سارن یہ ہر

شخص کا کام نہیں ہے۔ معاف کرنا میں بھی جانتا ہوں

— زندہ بچے تو ملاقات ہوگی

لیجئے بیڑا لیجئے۔ لائے ہتیار بھی سج دلوں اور دستار

کھنی بھی لگا دی ہے۔ اچھا سوامی رخصت۔ ایشو تھاری  
تلواروں کو اندر کا بجا بنادے۔ بندیوں کی لاج تمھارے

ہاتھ ہے

چمپت رائے۔ پان کھاکر۔ رخصت۔ آج تو خوشی سے  
تمھارا ایک ایک عضو۔ پھر اک رہا ہے۔ ایک راجپوتنی  
کا یہی وصف ہے

(جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

(رائی سارن فوج کے ایک حصہ کو طلب کرتی ہے)

سارن۔ کوشلیا۔ استری بلٹن کو لیس ہونے کا حکم دو۔ میں  
دو گھنٹہ بعد مردانہ بھیس میں پنجم جانب سے جمنل ندی  
کے دشمنوں پر حملہ کروں گی۔ سب تیار رہیں۔  
کوشلیا۔ رائی۔ ایسا ہی ہوگا

(کوشلیا جاتی ہے)

منظر نم

(میدان جنگ۔ راج چمپت رائے نے بندیوں کو کہیں لگا دیے ہیں  
پچھنے کا حکم دے دیا۔ شہزادہ محی الدین و مراد کی منتشر فوج کو منظم کیا  
داراشکوہ کو دھوکہ ہوا۔ بندیلہ اپنی کہیں لگا ہوں سے نکل پڑے اور  
دریا میں گھوڑے ڈال دیے۔ چمپت رائے داراشکوہ کی فوج کو دھوکہ دیکر  
دریا کے اس پار جاتا ہے۔ محی الدین کی فوج کی جمنیں بندھ گئیں دست  
بدست جنگ کی فوج آئی کہ ایک جھٹا سپاہیوں کا پنجم جانب سے نروا  
ہوا۔ یہ سارنہ صاف تھی)

راج چمپت رائے۔ پچھتر سال۔ تم مشرقی جانب اپنی فوج  
لیجاؤ۔ اور کہیں لگا ہوں میں چھپ جاؤ  
(پچھتر سال چلا جاتا ہے)

چمپت رائے۔ اندرجیت۔ تم اتر جانب اپنی فوج لے جاؤ  
اور کہیں گاہ میں چھپ جاؤ  
(اندرجیت چلا جاتا ہے)

(شہزادہ محی الدین و شہزادہ مراد پھر مقدم کرتے ہیں)  
محی الدین۔ راج چمپت رائے۔ آپ کی اس مہربانی کا شکریہ  
تو ادا کرنا فصول ہے۔ کیونکہ شکریہ ادا کر کے آپ کے قومی  
وقار کو ٹھیس لگے گی۔ ہاں خدا کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہیے  
مراد۔ ہمارا راجہ ارجھاکو ان کی خدمات کا خاطر خواہ صلہ ملے گا  
محی الدین۔ یہ قبل از وقت گفتگو ہے۔ جو خدا کی مرضی ہو  
چمپت رائے۔ شہزادہ صاحب یہ سچ ہے جو خدا کی مرضی  
ہے وہی سب سے بہتر ہے۔ میری رائے ناخس میں فوج  
کی تنظیم کرنا ضروری ہے  
محی الدین۔ ہاں ضرور۔ آپ نے اس فوج کے کئے کئے  
کئے ہیں

چمپت رائے۔ تین حصہ ایک حصہ میرے تحت میں ہے  
دو حصہ خادم زادوں کی تحت میں مشرق و شمال کی  
کہیں لگا ہوں میں ہیں۔ وہ دیکھئے شہزادہ دارہ شکوہ  
مورچہ ہٹا رہے ہیں۔ اون کو دھوکہ ہو گیا بس اب وقت  
ضائع نہیں ہونا چاہئے گھوڑے دریا میں ڈال دینا چاہئے  
محی الدین (بسم اللہ کریم) گھوڑے کو اڑا لگاتا ہے

(اللہ اکبر کی پُربہیت تکبیر سے ارض بندیلہ گونج اٹھتی ہے)  
چمپت رائے۔ اس سات گھنٹہ کی نقل و حرکت میں...  
بندیلہ جانبازوں کی لاشیں پھر دک رہی ہیں۔ شکر  
ہے کہ میری بات خالی نہیں گئی  
محی الدین۔ چمپت رائے دیکھنا وہ افی مغرب پر کیا غبار

دکھائی پڑ رہا ہے

چمپت رائے - دیکھئے ابھی معلوم ہوا جاتا ہے

(سپاہیوں کا ایک دل دارا شکوہ پر حملہ آور ہوا معلوم ہوتا

ہے کہ کوئی فرشتہ رحمت آپنی ادلوکے لئے آسمان سے اتر آیا ہے)

(گھمنان کی لڑائی ہو رہی ہے)

چمپت رائے - فتح - مبارک

محی الدین - خدا کا شکر ہے کہ اوستہ حق و باطل کا فرق دکھا دیا

(ایک سردار آتا ہے)

چمپت رائے - کیا ہے —

سردار - ہنس کر - بندیلہ قوم کا راج مبارک - اس جان نثار

کو بھول گئے —

چمپت رائے - میری سارن —

سارن - (سرسنظیم غم ہو کر) سوامی

(پرہز کرتا ہے)

## ایکٹ دوسرا

### پردہ اول

(شہزادہ محی الدین چنیل کے ماحل سے آگے کی طرف چلا : اقبال اس

کے سر پر مور پھیل لانا تھا اور نصرت دکامانی نقارہ بجاتی تھی : اگر دیکھتا

ہے تو شوکت اوس کے لئے تخت شاہی کو سجاتی ہے - دربار ہوتا ہے سرور اور

شاہی کی خطائیں معاف ہوتی ہیں متا صوبہ بنگال کے جانتے ہیں راجہ

چمپت رائے کو اوس کی برقرور شانہ خدمات جلیلہ کے صلہ میں وادہ ہراری

کا منصب عطا ہوتا ہے اور اور چھابہ بازس تک کی جاگیر عطا ہوتی ہے اور

بندیل راجہ پھر دہلی میں قیام کرتا ہے - اور رانی سارن صاحبزادہ موشی جلی)

چمپت رائے - جگلس سنگھ - کنور چھتر سال - سارن

(چمپت رائے دربار سے غلت باہر آتا ہے)

کنور چھتر سال - بتاجی مبارک

سارن - کیسی مبارکباد

چھتر سال - شہنشاہ اورنگ زیب نے آج دربار عام میں بتاجی

کو بندیلہ راج کی جانتاناہ خدمات ”سرفروشیوں“ کے صلہ

میں اور چھابہ سے بنارس تک کی جاگیر اور دوازدہ ہزاری

منصب مع خلعت ہفت پارچہ عطا کیا ہے

سارن - ہاں - سوامی

چمپت رائے - سارن - دیکھو یہ تلوار خاص شہنشاہ اورنگ

زیب نے اپنے اسلحہ خانہ کی عطا کی ہے - اس تلوار کو شہنشاہ

جہانگیر نے لاہور کے معرکہ میں استعمال کیا تھا - اصفہانی

تلوار ہے

سارن - سوامی آپ کو مبارک ہو - دشمنوں کے حسد سے پرانا

آپ کو محفوظ رکھے

چمپت رائے - سارن تمھاری خوشی میری تمام کلفتوں کیلئے

کافی ہے

سارن - سوامی —

(جگلس سنگھ آتا ہے اور کنور چھتر سال اور رانی سارن

جانتے ہیں)

چمپت رائے - کو جگلس کیا سا چار باں!

جگلس - اشیر باد دینے آیا ہوں - بہت سے راجپوت آپ کی اس

غزت کو دیکھ کر جھسم ہو گئے

چمپت رائے - کون

جگلس - نام لینے سے کیا فائدہ - کوئی گھوڑا آپ کے اسطبل میں



ولی بہادر خاں کا ہے ؟

چمپت رائے ہاں۔ کیوں

جنگل سنگھ۔ ولی بہادر خاں کو اوس کی بڑی فکر ہے کسی مناسب موقع سے اوس کو واپس کر دیجئے گا

چمپت رائے۔ لیکن وہ تو میدان جنگ میں گرفتار ہوا ہے۔

ولی بہادر خاں زخمی پڑا ہوا تھا۔ اور یہ گھوڑا اپنی دم سے کھینچا اڑا رہا تھا محلو پسند آپا میں نے منع کیا کہ کوئی شخص اس کو جان سے نہ مارے زندہ گرفتار کرے۔ لیکن

رائی اُرچھانے اوس کو زندہ گرفتار کر لیا ہے۔

جگل۔ ہاں ولی بہادر خاں کو وہ بہت عزیز ہے اور شائد

وہ اوس کی طلبی کی درخواست دینے والے ہیں۔

چمپت رائے۔ اچھا دیکھا جائے گا۔ (متفکر ہو کر)

(جگل جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

## منظر دوم

(دلی میں دہتے سال بھر ہوا تھا۔ کہ ایک دن کنور چھتر سال

گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو گیا۔ اور ولی بہادر خاں کے محل کی طرف

سے جانکلا۔ راجا رتنپتا ولی بہادر خاں کے آدمی دقت کے منتظر

تھے گھوڑا بچھین لیا۔)

(کنور چھتر سال منوم داخل ہوتا ہے)

سارن۔ کیوں خیریت ہے

کنور چھتر سال۔ گھوڑا ولی بہادر خاں کے آدمیوں نے

بچھین لیا !

سارن۔ (غصہ سے چہرہ متاٹھا) کچھ فکر کی بات نہیں گھوڑا گیا

بلا سے گیا۔ لیکن دیکھ رہے کہ تو اسے زندہ کھو کر کیسے

لوٹا۔ کیا تیری رگوں میں بندیلہ خون نہیں ہے ؟ جگلو

نایت کر دینا چاہئے تھا کہ بندیلہ راجا کے سے گھوڑا بچھین

لینا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔

(غصہ سے) جاؤ کو شلیا استری پلٹن کو لیس ہوئے کا حکم

دو۔ (کو شلیا جاتی ہے)

چھتر سال تم اور تمہارے پتا دونوں اب شاہی غلام ہو گئے

ہیں۔ تم لوگ اب داو عیش دو۔ اور میں ابھی اپنی استری

پلٹن کی مدد سے گھوڑا لاتی ہوں۔ چاہے انجام کچھ ہی

(جاتی ہے)

(سپاہیانہ باتا سجا کر اور استری پلٹن کو لے کر خانہ صاحب کے محل

سے زبردستی گھوڑا کھولتی ہے۔ جنگ کی بوت آتی ہے مگر بندیلہ

خواتین کے سامنے کسی کی پیش نہیں جاتی ہے)

چھتر سال۔ راج مانا۔ آپ آگئیں (دم چماتا ہے)

سارن۔ لو۔ یہ تمہارا گھوڑا ہے

(گھوڑا سارن کی گود میں اپنا سر ڈال دیتا ہے اوس کے

آنکھوں سے آنسو کی دھاریاں نکلے)

اے بے زبان گھوڑے تو کیوں رو رہا ہے۔ لائیرے آنسو

پونچھ دوں

(گھوڑا سر جھکا دیتا ہے)

(چمپت رائے داخل ہوتا ہے)

چھتر سال۔ بتاجی۔ دیکھئے راج مانا نے کمال کر دیا

چمپت رائے۔ کمال کر دیا۔

سارن۔ سو امی آپ متفکر کیوں ہیں

چمپت رائے۔ کاش یہ گھوڑا جکو نہ دکھائی دیتا۔ یہ گھوڑا

میرے اعزاز کے لئے آہوئے زور ٹکا ثابت ہوا۔ سنیا جی

اطلاع کی کہ راجہ کو گرفتار کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔  
 راجہ جیرچہ قلعہ میں داخل ہوئے لیکن جلد ہی ان کے بعد دوبارہ دخت ہوا  
 پڑا۔ اس وقت میں بہنوں سے شاہی فوج اور جہاز کا محاصرہ کئے ہوئے  
 ہے اور راجہ چیت رائے نے قلعہ میں بیٹھا ہے

**چیت رائے۔** (آجھ کھول کر) سارن کیا ساچار ہے؟  
 سارن۔ فصلیوں کو گولوں لے چھلنی کر دیا ہے۔ بیس ہزار  
 جانیں قلعہ میں بند ہیں۔ جن میں عورتیں اور بچہ بھی شامل  
 ہیں۔ مردوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ رسد بند  
 ہے۔ باہر سے آمد و رفت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ استریاں  
 اپنے بالکوں اور سوا میوں کو زندہ رکھنے کے لئے فادہ کر رہی  
 ہیں۔ استریاں سورج دیوتا کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر  
 کوس رہی ہیں۔ سب سے بڑھ کر آپ کی بیماری نے قلعہ  
 میں کھرا م بچا دیا ہے  
 راجہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارن آج دشمن ضرور قلعہ کے  
 اندر گھس آئیں گے

سارن۔ ایشور نہ کر کے کہ یہ دہلی دیکھنا پڑے  
 راجہ۔ ان قلعہ والوں کا کیا حال ہوگا؟

سارن۔ ہم لوگ قلعہ چھوڑ کر چلے جائیں تو کیا ہو؟  
 راجہ۔ کیا ان بد نصیبوں کو اپنی زندگی پر نفرت کرنے کے لئے  
 سارن نہیں شاید دشمن ان پر دم کریں۔ دشمنی تو ہم سے ہے  
 نہ کہ ان سے

راجہ۔ نہیں یہ تو مشکل ہے۔ ہم سے نہیں ہو سکتا ہے کہ اپنی بلا  
 ان غریبوں کے لئے چھوڑ جائیں۔۔۔ عورتوں و  
 بالکوں کو میں کسی طرح بھی چھوڑ نہیں سکتا  
 سارن۔ مگر یہاں رہنے سے ہم کیا کر سکتے ہیں

ہرن دیکھا۔ ہرن ہوئیں۔ میں نے گھوڑا اٹھایا اور  
 ہرن ہوا  
**چھتر سال۔** (منبر پر) کیا قصہ ہے  
**چیت رائے۔** رانی سارن گھوڑا کھول لائیں۔ اور ادھر مالگیر  
 کو پرچہ لگا اور ان کو رانی کی یہ جرات ایک منصب واد کے  
 خلاف ناگوار ہوئی اور گھوڑے کی واپسی کا حکم آیا ہے اور  
 اوسے کے ساتھ منصب و جاگیر بھی اس گھوڑے کی نذر  
 ہو گیا۔ دلی بہادر خاں پہلے ہی سے مجھ سے جلتے تھے۔ اور  
 بہت سے راجپوت بھی اس سازش میں شریک ہیں  
**چھتر سال۔** گھوڑا واپس کر دیا جائے  
 رانی سارن۔ نہیں میری لاش جب اٹھائی اوس وقت  
 یہ گھوڑا جاسکے گا

**چیت رائے۔** رانی تمہاری منہ سے یہ ہوا۔ گھوڑا  
 تو جائے گا  
 رانی سارن۔ سوامی۔ جب آپ ہی بولتے ہیں تو بیشک  
 چلا جائے گا (روٹے لگتی ہے)

### منظر سوم

راجہ چیت رائے قلعہ میں مقیم ہیں۔ منصب و جاگیر جاتے کا قلق ہے  
 لیکن رانی سارنہ کی وجہ سے شکایت نہیں کرتے۔ مالگیر طہیان  
 ہوتے کے بعد چیت رائے کی جانب توجہ کی راجہ سہہ کرن بند بندہ راجہ  
 چیت رائے کو خاک میں ملائے کی قسم کھائی۔ ہندو سر دار راجہ چیت رائے  
 سے نفرت ہو کر شاہی فوج میں شامل ہو گئے۔ قرب و جوار کے ہندو  
 راجاؤں نے بھی رفاقت سے منہ موڑا۔ چیت رائے نے بھی دوبارہ  
 گروہی شروع کی۔ رانی سارنہ اور راجہ چتر سال بہادر راجہ کے ساتھ  
 رائے کی طرح تھے۔ شاہی فوج نے مقابلہ سے عاجز آکر مالگیر کو

راجہ۔ مرنے کے ہیں؟ قید کی مصیبتیں سمجھ لو لیکن قلعہ

میں رہوں گا

سارن۔ پران نا تھ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں مجھ کو زندہ کی ہوئی  
کہ ایسی بات کیوں کی۔ (بکھ سوچ کر) اچھا اگر آپ کو یقین  
ہو جائے کہ ان کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہو گا تو آپ چل سکتے ہیں؟

راجہ۔ (بہت غور کرنے کے بعد) یقین کیسے ہو؟

سارن۔ شاہی سپہ سالار کی تحریر!

راجہ۔ ہاں۔ اس شرط سے کہ یہ لوگ بھی ہم کو رخصت کر دیں  
(سارن جاتی ہے)

### منظر چہارم

سارن۔ کنور میں نے تم کو اس لئے بلایا ہے کہ تم کو میں بندیلہ

راج کی آن پر بھینٹ چڑھا دوں

چھتر سال۔ ماتا جی جو اگیان ہو میں تیار ہوں

رانی سارن۔ آج لڑائی کی کیا کیفیت ہے

چھتر سال۔ اب تاک پیاس آدمی مر چکے ہیں

رانی سارن۔ بندیلہ کی لاج اب ایشور کے ہاتھ ہے۔ اچھا یہ کام

کس کے سپرد کیا جائے

چھتر سال۔ میرے

رانی۔ بلا کر دو گے

چھتر سال۔ ہاں یقین تو ہے۔ اچھا ماتا جی رخصت

رانی۔ (دبے ہوا کر) ایشور تمھاری صورت جلد دکھائے

(روتی ہے)

(چھتر سال جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

رانی سارن۔ جیون نا تھ۔ آپ نے جو وعدہ کیا تھا اوس کے

پورا کیجئے

راجہ۔ تم نے وعدہ پورا کیا؟

رانی سارن۔ تحریری معاہدہ حاضر ہے جو آج تیر میں باندھ

کر کنور چتر سال نے بھیجا ہے

راجہ۔ ہاں اب میں چلوں گا۔ اور ایشور نے چاہا تو ایک

بار پھر ان دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس

بجھاؤں گا مگر سارن بیچ بتانا اس کا غذا کیا مول ہے؟

سارن۔ (آبدہ ہو کر) ایک جھان بیٹا۔ کاغذ کے ایک پر دھکیا اس

قدر گراں قیمت کس نے ادا کی ہوگی

راجہ۔ (دکھتے ہو گیا) : چچ کر کون

سارن۔ کنور چتر سال

راجہ۔ ہائے ————— (دبوش ہو کر گر پڑتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

### منظر پنجم

(راجہ چنٹ رائے۔ صاحب درخش ہے۔ تاریک رات میں ہاگی

میں بیٹھ کر قلعہ والوں کو اپنی قسمت پر رونے کے لئے قلعہ کی دین و ز

مانتے سے اور جیسے وہ میل آگے نکل چکا تھا۔ رانی سارن دعا

سچا ہوا لباس پہنے۔ گھوڑے پر سوار تھی۔ نام ہاگی میں بے سدا

تھا۔ اور کھار پسین میں شرب اور نشنگی سے قافلہ کا ہر حال تھا۔ پانچ سو

ہاگی کے ساتھ تھے۔ کہ دفعتاً شاہی فوج آگئی اور ہاگی سارنہ کے حکم سے

روک لی گئی)

سارنہ دعا۔ سوارو۔ دیکھو وہ فوج کیسی آ رہی ہے

سوارو۔ شائد شاہی فوج ہے!

رانی۔ شائد میرے راجکار۔ میری سہایتہ کے لئے آئے

ہوں گے

ماگتا ہوں

سارن - شوق سے کہنے !

راجہ چنیت رائے - زبان کا پاس کرنا

سارن - کانپ کر فرمائے

راجہ - اپنا خنجر میرے سینہ میں چھو دو

سارن - (سنائے میں) جیون ناتھ ایسا کبھی ہوا ہے ؟

راجہ - میں قید ہونے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا

سارن - مجھ سے کیسے ہوگا

(پانچوں سوار بھی حق تک ادا کرتے ہیں)

راجہ - (جھٹلا کر) کیا اسی پر آن بنا بنے کا دعویٰ تھا

شاہی سپاہی - راجہ کو لینا — راجہ کو —

رائی — ٹھیکو —

(خنجر آبدار راجہ کے سینہ میں پست کر دیتی ہے)

شاہی سپاہی - رائی صاحبہ - ارے آپ کیا کر رہی ہیں - ہم

آپ لوگوں کا بال بیکتا نہ کریں گے شہنشاہ عالمگیر کا حکم ہے

آپ لوگوں کو عزت و آبرو کے ساتھ چرنیچکا ہو چکا وینا

آپ نے عفتب کر دیا - کسی عورت کی تلوار سے بھی کبھی

ایسا کام ہوا ہے ؟ ہم نے اسے پورا دروازہ کے

راہ چوتنیوں میں بھی یہ خود داری کا جذبہ نہیں دیکھا عورت

کے لئے جان دیدینا بہت آسان ہے مگر رائی صاحبہ

کام آپ نے کیا ہے وہ کوئی عورت کریجا نہیں سکتی

بتلائے ہم شہنشاہ عالمگیر کو کیا سفہ دکھلائیں گے -

آپ کے بندہ بے دام ہیں آپ کا جو حکم ہو اس پر پورو

چشم بجالائیں اسلام سچا مذہب ہے اور ہم لوگوں

نام لیوا ہیں - ہم چندا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آپ کو قسم

صاحبہ - (ہوش میں آکر) کیا ہے ؟

رائی - (خو سے دیکھ کر) فوج آگئی ہے - کہا رو پاکی روک لو

(ہاکی - دیکھی ۴)

راجہ - بہادر و بیرو - آخری ہوش اور دکھا دو

(تلواریں کھینچ مانی ہیں)

سپاہی - جے جے جے

راجہ - (ہاکی سے باہر کر) — سارن —

(غش کھا کر گر پڑا)

سارن - (آبدیدہ ہو کر) پران ناتھ —

چنیت رائے - سارن افسوس جس ذلت سے تمام عمر بچتا

رہا وہ آج مرنے دم نصیب ہوئی - میری آنکھوں کے سامنے

دشمن تمھارے پوتہ شریہ کو چھو بیٹھے اور میں ہل بھی نہ

سکوں گا — ہائے موت کب آئے گی ؟

..... سارن ! تم نے بہت نازک موقعوں

پر میری آن رکھی ہے -

سارن - (خوش ہو کر) پران ناتھ - ایشور نے چاہا تو جب تک

سانس باقی ہے جیون ناتھ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی

(تیندو کو لے کر اپنے سینہ کے قریب لکھتی ہے)

راجہ - کیا تم کو منظور ہے !

سارن - مرتے دم تک مانوں گی

راجہ - آخری خواہش ہے اس کو رو دینا کرنا

سارن - (تینہ کو سینہ میں چھوئے ہو) یہ آپ کی درخواست ہے ؟

چنیت رائے - نہیں یہ خواہش نہیں ہے

سارن - میری آرزو ہے کہ مرنے تو سر آپ کے قدموں پر ہو

چنیت رائے - تم نے میرا مطلب غلط سمجھا - میں ایک بڑا

چوم رہی ہے ————— اگر ہمارے راجا۔ دس میں  
کے کوئی زندہ ہو تو ہا۔ ی دونوں لاشیں اون کو روپ  
دیتا ————— (خون آلود خنجر اپنے سینہ میں جو تک لیتی ہے)  
(پر وہ گرتا ہے)

مشیر احمد علوی ناظر (دکا کوڑی بی۔ اے)

پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لئے حرام ہے جو کم آپ دیں اوس کے  
بکالانے کے لئے ہم تیار ہیں۔  
سارن۔ (دسکراتے ہوئے) یہ خنجر۔ فرض کی کنار ہے۔ پر یہی  
بر بھی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پریم کی ناؤ پریم کے ساگر  
میں غوطہ کھا رہی ہے۔ جو سینہ کل تک عزت کا پاسبان اور  
میری محبت کا خوانہ تھا۔ آج اسی پاک سینہ کو میری تلوار

## نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت ہر معہ محصول مل سکتے ہیں

۱۹۳۲ء	۱۹۳۱ء	۱۹۳۰ء	۱۹۲۹ء	۱۹۲۸ء
مئی	مئی	جنوری	نمبر	نمبر
جون	اگست	اپریل	اکتوبر	اکتوبر
جولائی	ستمبر	مئی	مئی	۱۹۳۳ء
اگست	اکتوبر	جون	جون	جون
ستمبر	نومبر	اکتوبر	نمبر	۱۹۳۴ء
اکتوبر	دسمبر	نومبر	دسمبر	جنوری
نومبر	۱۹۳۵ء	دسمبر	۱۹۳۵ء	فردی
دسمبر	جولائی	۱۹۳۵ء	مارچ	مارچ
۱۹۳۵ء	اگست	مارچ	اپریل	اپریل
فردی	ستمبر	اپریل	مئی	مئی
مارچ	اکتوبر	جون	جون	جون
اپریل	نومبر	۱۹۳۵ء	۱۹۳۵ء	جولائی
جولائی	دسمبر	دسمبر	دسمبر	اگست
۱۹۳۵ء	۱۹۳۵ء	۱۹۳۵ء	۱۹۳۵ء	نمبر
ستمبر	فروری	مارچ	مارچ	اکتوبر
اکتوبر	اپریل	اکتوبر	نمبر	
نومبر				
دسمبر				

منیجر نگار لکھنؤ

# وحی کی حقیقت علمی نقطہ نظر سے

وحی، اصطلاح میں اُس مرسلت یا پیغام کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے اپنے نبی پر بروسطت فرشتہ یا ملاو اسطہ نازل ہو، وحی کا عقیدہ خالص اسلامی عقیدہ نہیں ہے کیونکہ بنی اسرائیل بھی کہا کرتے تھے کہ خدا ان کے قائدین سے براہ راست کلام کرتا ہے۔ اور مسطورہ میں تو خیر عیسیٰ ابن مریم کو اولوہیت تلاوتہ کا رکن سمجھتے تھے لیکن اسلام کا وحی کو بروسطت فرشتہ ماننا گویا قرون مابعد کا معقولات کی جانب ایک قدم اٹھانا تھا کیونکہ بلا واسطہ وحی کا عقیدہ خدا کی تجسیم کو مستلزم تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا کا بندوں کے نام پیغام بھیجنا، اور پیغام کی نوعیت جس سے اس کے اعلیٰ یا خدا کا پتہ چلے کہاں تک محسوس شہادت سے مسلم سمجھی جاسکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ہم اُن تمام رجحانات کو بھی نظر امعان دیکھیں گے جن کی بنا پر انسانی تکمیلات کو ایک خاص کامل و مکمل ہستی کی جانب منسوب کیا گیا

تدریجی ترقی کی شہادت لے اس امر کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ فطرۃ کے حقائق انسان پر فطرۃ خدا کا پیغام | رفتہ اور اکثر نہایت غیر متوقع طور پر ہونا لیکن یہی اکتشافات ہیں جنہوں نے انسان کے ارتقاء میں عظیم الشان حصہ لیا اور تہذیب و تمدن کو نویت بہ نویت موجودہ منزل تک پہنچایا۔ انسان کی قوت و کمزوری یا اس کی دیگر خصوصیات سب نتیجہ ہیں اُن بے شمار علی رجحانات کے جو اُن کے افراد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ قصد خواہ غیر ارادی طور پر۔ ماضی کی لاتعداد صدیوں میں نوع آدم کا رفتہ رفتہ سطح کے اوپر آنا نہایت دلچسپ مطالعہ ہے۔ خدا کی ارضی مخلوقات میں سے کتنی انواع اب تک معدوم ہو چکی ہیں جن کے آثار بجا بجا زمین کی تہوں میں سے برآمد ہو رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کے معدوم کرنے میں خدا کی انتقامی جذبہ سے متاثر نہ تھا۔ کیونکہ فطرت مقررہ اصول کی کار بند ہے اور انہیں اصول کے ماتحت فنا و بقا کا نظام جاری ہے جس کو بحر انسانی اصطلاح میں جو جاہیں کھڑکیا رہیں۔ اسی اصول کی بنا پر کہتے خدا کی مقررہ مت گئے۔ لیکن خدا نے کسی کے بچات کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا اور نہ بڑھاتا ہے۔ تو اُم اس وسیع قانون کے ماتحت جسے ”قانون حفظ حیات“ *Law of preservation of life* کہتے ہیں اپنی فطرۃ اور اصول کے مطابق متاثر ہوتی تھی اور اسی تاثر کا نام عروج و زوال ہے۔ انسان نے مجموعی طور پر جو باتیں اپنی آسانی کے لئے سمجھیں یا وضع کیں وہ بالکل انہی قدرتی اصول کے ماتحت تھیں اور نسل بعد نسل کام آتی رہیں۔ مثلاً آگ یا دھوپ کی ایجاد جس نے فاصلہ کی تسخیر میں اتنا حصہ لیا۔ جانوروں کے اہلی بنانے کی ابتدا۔ فن تعمیر میں عمارت کی ایجاد۔ اوزاروں کی صنعت۔ پانی پر تیرنے اور حرکت کرنے

والی چیزوں کا اکتشاف وغیرہ وغیرہ۔ علامہ بریں اخلاقی قوانین۔ سیاست مدن اور علوم وفنون کہ یہ سب رفتہ رفتہ انسانی تجربہ سے ظہور میں آئے۔ اور ان میں سے کسی ایک تفصیل کو بھی خدا نے فرشتہ بھیج کر نہیں بتلایا۔ الغرض انسان کے دوسرا ارتقاء میں عمرانی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حقائق دریافت ہوئے ہیں اور اب نسل فی الجملہ ان سے مستفید ہو رہی ہے وہ ایک زمانہ یا کسی ایک شخص کی تعلیمات میں سے نہیں ہیں بلکہ پچھلے علم اور تجربہ کی بنا پر نسل کے افراد ان کو دریافت کرتے رہتے ہیں اور یہ دستور العمل اب بھی جاری ہے اور آئندہ جاری رہے گا۔ اس کا نام ہدایت یا غیبی اعانت ہے جو کسی وقت یا مقام کے لیے مخصوص نہیں

اب اس تمہید کے بعد دیکھنا چاہئے کہ خدا کے پیغام کی نوعیت کیا ہے۔ خطاب کی شکلیں تین ہو سکتی ہیں۔ ایک تحریر۔ دوسرے کلام فی الصوت۔ تیسرے ذہنی تصور۔ صاف ظاہر ہے کہ پہلی شکل خارج از بحث ہے کیونکہ خدا کی طرف سے تحریری احکام پانے کا کسی نے دعویٰ نہیں کیا۔ دوسری صورت یعنی غیب کی آواز یا ندا۔ سو یہ صورت مشرقی ادب اور روایات میں اس قدر عام طور پر مسلک ہے کہ ہمارے ذہن نہایت آسانی سے اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور ہم ہر زمانہ میں خاص خاص بندگان خدا کی نسبت اس کو ممکن سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ آواز اگر مسترد کر دیا جائے (Coharent) ہوگی تو وہ یا تو کسی انسانی لکھ سے خارج ہوگی یا صدائے بازگشت ہوگی یا جدید آلات سمعی مثلاً۔ کارڈ۔ ریڈیو فون وغیرہ سے ماخوذ ہوگی۔ لیکن خدا جو کچھ جسم وغیرہ کی اصیاج سے بری ہے اس لئے اس کا مستدرک صوت پیدا کرنا محال ہے۔ اب یہی تیسری شکل، ذہنی تصور کی۔ جس سے وحی کا مفہوم مستنبط ہو سکتا ہے۔ سو اس کی حالت یہ ہے۔ کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصور ان خود بغیر کسی خارجی سبب کے پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور وہ خارجی اسباب اسی کے تجربات یا مشاہدات ہوتے ہیں جو ذہن انسانی میں مختلف و متنوع صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً خواب میں انسان کو عجیب و غریب شکلیں دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کی اجزائی ترکیب فرداً فرداً اس کے ذہن میں پیشتر سے موجود ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص نے سونے کا پہاڑ دیکھا تو اگر بیداری میں یہ تصور اس کے خیال میں نہ آیا ہو لیکن سونا اُس نے دیکھا ہے اور پہاڑ بھی اور ایک شے کی بہتات کا تصور بھی ذہن میں آچکا ہے۔ سونے وقت دماغ ارادے کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے لہذا ایک نقش دوسرے کسی نقش سے ملے گا یا باہم کئی نقوش آمیز ہو کر عجیب و غریب شکلیں (Synthetic Combination) بنائے رہنا بالکل ایک فطری عمل ہے۔ بہر حال خواب ہو یا بیداری اگر تصور کو مطلق العنان کر دیا جائے تو گردش تاثرات کے ذخائر اس قدر کثیر السعد انہی شکلیں پیش کریں گے کہ علم ریاضی ان کے حساب سے قاصر رہے گا

اب ہم ضمناً اس بحث کو اٹھائیں گے کہ خدا کے پیغام کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے، مخلوق پر اس کے اجرا کی کون سی صورت ممکن ہے۔ خود اجرا کی کیا ضرورت ہے اور یہ عقیدہ کہاں سے آیا لیکن اس پر بحث کرنے سے قبل انسان کے فی فو ارتقاء کی تاریخ مجلاً جان لینا ضروری ہے۔ انسان نے جن قوانین کے ماتحت رفتہ رفتہ

ترقی کی ان سب کی بنیاد ماحول کی ضرورت، فطری صلاحیت اور قوت حافظہ و استدلال پر قائم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جاندار کو دوسروں کی دستبرد سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی جسمانی یا طبیعی خصوصیت عطا ہوئی ہے۔ چنانچہ ہرن کی قسم کے جانوروں میں ٹانگوں کی قوت اور دوڑنے کی صلاحیت۔ لومڑی کی چالاکی اور فی الفور قوت فیصلہ، خرگوش کے کان، سانپ کا زہر، بندر کی چستی، خار پست کے کانٹے، تیزی کے قسم کے پتنگوں کے لمبے بئے خار، بعض نازک پودوں کا نباتی زہر پھیلنے والی سیلوں کی گرفت وغیرہ پھر اس امر کا ثبوت کہ یہ خصائص خلقی طور پر کتبائی ہیں اس بات سے ہم پہنچتا ہے کہ جہاں حفظ نفس کے لئے ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو یہ رفتہ رفتہ کر کے سلب یا محو ہو جاتی ہیں مثلاً اہلی جانوروں کی دفنی خصوصیت ان کے سینک اور سر کی مگر تھی جواب بھی جنگی بھینس اور اونوں میں موجود ہے مگر اہلی جانور انسان کی حمایت میں اس کی ضرورت ہزاروں نسلوں کے دوران میں کھو چکے ہیں چنانچہ اب اُس کی یادگار صرف سینک باقی رہ گئے ہیں۔ اسی طرح انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اول اول ایک جانور ہی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ تجربہ و استدلال کی مدد سے اس نے ترقی کی، چنانچہ ہم مذہبی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح اُس نے ابتدائی شیروں کو شکار کی تلاش کے طریقے بتائے، جس طرح اُس نے بے کوٹھنسل بنانا سکھایا جس طرح اُس نے چرندوں کو مختلف قسم کی نباتی پیداوار میں تمیز کرنا سکھایا، ٹھیک اسی نتیجے سے وہ انسانوں کی مساعی سے نتائج پیدا کرتا رہا جسے آپ پیغام خداوندی کیلئے یا کچھ اور دیر یوں خدا کو فی الحقیقت ہماری بقا۔ ہماری ترقی۔ ہماری بہبودی اور ہماری نجات کسی چیز کی پرواہ نہیں وہ احساس اور جذبات سے بالکل بری ہے وہ صرف قدرت ہے محیط و ساری اور نیک و بد کا تعلق صرف ہماری ذات سے متعلق ہو اور ہمیں پر اس کا اثر ہوتا ہے۔۔۔ صرف ایک اصولی بحث نہیں اس سلسلے میں اور کرتا ہوں وہ یہ کہ خدا کا پیغام مخلوقات کی کسی نوع کیلئے اگر یہ میدان قیاس پر لیکن ضرورت بحث کیلئے صحیح باور کر لیا جائے تو اسکے لئے دو شرطیں لازم ہیں اول تو یہ کہ اسے عالمگیر ہونا چاہئے دوسرے یہ کہ ابتدائے تخلیق نوع کے وقت ہونا چاہئے اور ساتھ ہی اسی صورت کیساتھ کہ اسکا بعد نسل کی تکرار ہوتی ہے۔ دراصل ایک اصطلاح کا بیغیر نظام صرف بنی اسرائیل اور سامی اقوام تک محدود رہا جاتا ہے۔ علاوہ اسکے تمام باطلو کشف اللسان ہونا چاہئے تھلشن ایک ہونا ضروری تھا اور نتائج میں بھی یکسانیت ہونی چاہئے تھی۔ دراصل ایک خود سامی اقوام کے مختلف مذاہب یا جملہ متعلق نہیں ہیں اور اوام و نواہی تقریری قوانین میرانی ترتیب اور مالی حقوق میں جاسما فرق موجود ہے علاوہ بریں پیغام کی ترجمانی پر مذہب اور مختلف عقائد پر بعد ازاں ہوتی رہی اسکے پیغام کا ظاہری مقصد تھا ہونا ہر پیغام کو صاف اور صریح ہونا چاہئے تاکہ ہر شخص اسی آسانی سے سمجھ سکے اسکو استدلال و غیر متعین عبارتیں منہا چاہئے کہ لوگ جسے دلت یونانی یا لائی کی طرح اپنے اپنے معنی میں سمجھ لیں اور سب زیادہ اہم یہ شرط ہے کہ اسکے اجزا ہم متناقض نہ ہوں ایک حکم دوسرے حکم کی ایک بیان دوسرے بیان کی تردید نہ کرے کوئی بات خلاف قیاس نہ ہو اور فطرت کے عام طریقوں کے متعلق نہ ہو اب اس مسئلہ کو دوسرے رخ سے دیکھنا ہمیں مقصد سے زیادہ قریب کرے گا۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ کون سی صورتیں ہوتی ہیں جن میں انسانی افعال خدا یا مافوق الادراک قوت کی جانب منسوب کئے جاتے ہیں۔ ہم نے قبل ازیں دوران بحث میں بتایا ہے کہ خارجی تاثرات انسان کی ذہنی اور طبیعی تشکیل میں اکثر کار فرما رہتے ہیں اور لفظ خارجی تحریک کا رد عمل ہے جسے میں کوئی اثر قبول کرنے کے بعد جواباً یا بے بصیرت ہے مثلاً کسی شخص کے شانہ پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اور ذراغ نے اس کو محسوس کیا پھر تجربہ سے اُس نے معلوم کیا کہ جب کوئی شخص ایسا اشارہ کرتا ہے تو وہ مخاطب کرنا چاہتا ہے، یہ تمام ذہنی عمل چشمِ دِل میں اُس کے



نظام انحصاری نے انجام دیا اور جو اب اس کے نطق نے ان الفاظ کی تشکیل کی۔ کیا کہتے ہو۔

اس طرح پر نطق گویا ذہن کے بارے میں آگاہی ہے جس کے ذریعہ سے انسان نے اپنا مافی الضمیر دوسروں پر ظاہر کرنا قبل تاریخی زمانہ سے جان لیا ہے۔ اور الفاظ اور ادائے مطلب کے علامات روز بروز بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ با محمل اور مؤثر الفاظ و علامات کا استعمال نہایت بلند پایہ فن سمجھا جانے لگا۔ پھر چونکہ اس لحاظ سے شاعر، نثر، مقرر، خطیب وغیرہ تصویریں آرٹسٹ ہیں۔ اس لئے جتنا زیادہ انسانی جذبات و احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی صناعتی کریں گے۔ اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوں گے

شاعر غالباً سب سے قدیم آرٹسٹ اس فن کا ہے۔ لیکن اس میں اور ایک محقق میں یہ فرق ہے کہ شاعر زیادہ تر اپنے جذبات سے کام لیتا ہے جیسا کہ وہ چاہتا ہے اور ایک محقق صرف فطری خط و خال سے بحث کرتا ہے یا الفاظ دیگر لوگوں سمجھے کہ محقق واقعات سے پہلو تہی نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنا ہی متاثر ہو اور شاعر کو اوزان اور تناسبات الفاظ کا پابند ہونا پڑتا ہے

اب انسانی کے ادوار پر نظر ڈالنے اور اقوام کی تدریجی نشو و نما پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر اور اس کے جیسے ارباب فن کے فروغ کا زمانہ عموماً وہی ہوتا ہے جو علمی کساد بازاری کا ہوتا ہے حالانکہ صحیح معنوں میں کسی قوم کا کوئی دور اب تک ایسا نہیں گزرا جو خالص علمی کساد بازاری کے اور اسی نسبت سے شاعر کا فن ہر جگہ کم و بیش پایا گیا ہے، انگلستان میں شکسپیر ملٹن اور ٹینسن کے زمانہ کو زیادہ دن نہیں گزرے اور انی حال اگر اس میں کچھ کمی ہوئی ہے تو دوسرے جدید آرٹسٹ نے اس کی جگہ لے لی ہے یعنی ناول و فنی افسانہ نگاری اور جزلزم وغیرہ۔ ان میں بھی تصورات کی ترتیب ہے اور ساتھ ہی واقعات کی جن سے تعلیمی اور تفریحی کام لیا جاتا ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی سب انفرادی آرٹسٹ کے تصوری نظام کی سادگی و پرکاری ہے۔ ہندوستان میں ویدوں کے گیت ہمیشہ گائے گئے اور برہمن اسی کے اشلوک اور منتر سے دوسری ذاتوں کو نشاء ستم بتاتے رہے کالیداس کے والمیک والے جادو سے سنسکرت دال طبقہ اب تک واقف ہے اس کے علاوہ شکر اچاریہ۔ کبیر نانک اور چیتیا نے بھاشا زبان کے ذریعہ سے عوام کو مسحور کیا

عرب میں ابام جالبیت کی شاعری ایک قومی جوہر تھا۔ شاعر، قبیلہ کی قوتوں میں ایک اہم قوت سمجھا جاتا تھا۔ رجز، نسب نامے، تلوار اور گھوڑے کی شہرت شاعر پر منحصر تھی۔ دشمنوں پر تلوار اور نیزے سے زیادہ کاری زخم بھریہ اشعار کے لگائے جاتے تھے۔ شاعری عرب کی آواز تھی شاعری عرب کی جان تھی۔ اُن کی دماغی اور ذہنی تشکیل۔ اُن کی قومی عادت اون کے معیاد زندگی ان سب میں شاعری بحیثیت عنصر غالب کے جلوہ مناسی اور قومیت کا شیرازہ اگر کسی چیز سے تصور ہوتا تھا تو وہ شاعری کے ذریعہ سے رائج کئے ہوئے مشترک خیالات سے۔ اُس زمانہ میں شعر چند مخصوص افراد کا مشغلہ دماغی نہ تھا بلکہ کل قوم کا واحد ذریعہ افکار خیال تھا۔ ہر قبیلہ میں ایک یا زیادہ شاعر ہوتے تھے جو اپنے جملہ مشاہدات اور تاثرات کو تلامذہ کی ساتھ عروہی جامہ پہنانے

تھے۔ اُن کے بے لکھے الفاظ صحرائے عرب کے ایک گوشہ سے دوسرے تک تیر کی سرعت کے ساتھ پہنچ جاتے اور زبان زد ہو جاتے تھے۔ بچہ بچہ اُن کی خوبیوں کو پرکھ سکتا تھا اور ذرا سی لوجی پنج کو سننے ہی قیصر کر لیتا تھا۔ اَلشَّعْرُ دِیَوَانُ الْعَرَبِ بہت مشہور مقولہ ہے۔ عرب کی ریگستانی زندگی کے تمام مظاہرے اس میں محفوظ ہیں۔ عرب جو کچھ سوچتا تھا اور سمجھتا تھا اور محسوس کرتا تھا وہ ان قبائلی منادیوں یا اعلان کرنے والوں سے نہ بچ سکتا تھا۔ اُن کی پھوٹی اور بڑی رسیں اُن کے قومی اور انفرادی جہان اُن کی آرزوئیں اور مقاصد شاعروں ہی کی آواز سے بروئے کار آتے تھے۔ غرض کہ باوجود خانہ جنگی اور انتہائی بد نظمی کے ایک متحد کرنے والا عنصر اندر ہی اندر کام کر رہا تھا۔ کوئی اخلاقی و تمدنی مربوط قوت اُن کے درمیان نہ تھی مگر یہی اشعار تھے جو مختلف شاعروں کی زبان سے نکل کر ایک غیر مدون سرمایہ بن گئے تھے۔ جس نے 'مروت' کے اخلاقی معاشرتی معیار قائم کئے تھے اور جس نے عصیت اور نسبی شرف کو ایک طرح پر منظم بمانہ پر قائم کر دیا تھا۔ لوگ ایک مشترک جذباتی و احساسی بگا لگت محسوس کرتے تھے۔ اشیا کا اندازہ انہی شاعرانہ معیاروں کی بنا پر کرتے تھے۔ اور زبان کے جوہر فصاحت۔ بلاغت اور دیگر محاسن کلام کو بن پڑے ہوئے سمجھ لیتے تھے۔ اور کوئی بات اُن پر اثر نہ کر سکتی تھی مگر وہ جو فصیح و بلیغ شعروں کی شکل میں اُن تک پہنچتی تھی لیکن ظاہر ہے کہ جاہلیت کے عربوں کا علمی مبلغ کیا ہوگا۔ یونان کے ماوراء الطبیعیات کا علم انھیں مطلق نہ ہوا تھا۔ وہ بودھ کے نروانی فلسفہ سے قطعاً نا آشنا تھے۔ نہ زرتشت کی تعلیم کا وہاں کچھ اثر تھا نہ قدیم مصری تمدن کا انھیں پتہ۔ بنی اسرائیل کی نیم تاریخی روایات اور تورات و انجیل کے زیادہ مشہور نظریات، عبرانی عیسائیوں اور منتشر یہودی قبائل کے ذریعہ سے البتہ ان کے حیطہ علم میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ اللہیت۔ مذہب اور قوانین قدرت کے متعلق اُن کے احتمالات نہایت مبہم اور غیر مبسوط تھے۔ کاہن اور موجد ضرور جا بجا تھے جو اُس وقت کے حالات سے غیر مطمئن تھے۔ عیسائی اور یہودی زندگی کی بے راہ روی کو انھوں نے دیکھا تھا اور قائم شدہ خیالات اور سوشل نظام کی کمزوریوں کو جگہ جگہ سے محسوس کرتے تھے لیکن کسی تعمیری نظام کے قائم کرنے کی نہ اُن میں جرأت تھی نہ خیالی وسعت۔ عام عرب ناچار بٹ پرستی پر اُتر آیا تھا کیونکہ عصیت کے قومی رجحان کی بنا پر اپنے جدا جدا اسمعیل و ابراہیم کے طریقوں پر بزمِ خود عمل کرنا اور اُن کے خداؤں پر تکیہ کرنا ایک فطری تقاضہ تھا۔ پرستش کا کوئی خاص طریقہ سوائے عجز اور نیا مندی کے اظہار کے اُن کو نہ آتا تھا۔ اللہ۔ رب۔ رحمن۔ رحیم۔ ملک۔ عقوبت۔ شیطان۔ قربانی۔ جبریل میکائیل اور بہت سی قرآنی اصطلاحات بول چال میں استعمال کرتے تھے

معاشی و مسائل عرب کے کبھی قابلِ اطمینان نہیں رہے صرف تھوڑے زمانہ تک (شاید قبل مسیح دو ایک صدی تک) جبکہ ہندوستانی سواصل کی تجارت شام سے براہِ یمن ہوتی تھی۔ مغربی عرب میں تجارتی گرم بازاری رہی ورنہ عرب پیشتر چراگاہی کا پیشہ کرتے رہے یا بہزنی اور فارنگری کا۔ مکہ میں کعبہ کی تولیت وہاں کے قبائل کی وجہ معاش تھی۔ ا بعد اسلامی عہد میں بھی حماد و نجد دائرین اور معتدین ہی کے دستِ نواں پر منحصر رہے۔ عرب کی یہ بے باگلی اُس کی اُدادی اور عزت گرہی کا باعث ہوئی اور ساتھ ہی اُس کے باشندوں کی شہادت۔ تہور، محنت کو شہی اور خود مختاری کی فطری وجہ بنی۔ کوئی بیرونی قلع

اُن کے ملک کی طرف توجہ کر کے کیا لیتا اور خود انھیں جنگ سے باز رہنے کے لئے کس چیز کا خوف تھا۔ چنانچہ نہ تو عرب نسل میں یہودی آمیزش ہوئی نہ یہودی خیالات وہاں مسلط ہوئے پائے۔ ہندوستان اور وسط یورپ برخلاف اس کے ہمیشہ بھوکی جنگجو قوموں کے آج گاہ رہے۔ باہر کا خون۔ باہر کے خیالات باہر کے طور و طریقہ ان ملکوں میں سوشل اور معاشرتی انقلابات برپا کرتے رہے اور کتنی کروٹیں بدل کر وہاں کے حالات نے موجودہ نشست اختیار کی ہے۔ عرب میں انسان صرف ان مظاہر قدرت سے آگاہ تھا جو ایک گرم و خشک منطقہ بحارہ والے ملک میں رونما ہوتے ہیں۔ سبزہ زار۔ سمندر۔ موسلا دھار پانی۔ برسات وغیرہ اس قسم کی چیزیں وہاں مفقود تھیں اس لئے وہاں کی ادبی روایات میں ان کا کہیں ذکر نہیں ہے نہ وہاں بارش کی شان تھی۔ نہ افواج و خدم کی نہ وہاں رُدا کے جیسے تماشے تھے نہ ہندوستان کے زرعی وسائل، جیسا ملک سادہ تھا ویسے ہی لوگ سادہ تھے۔ نیکین چونکہ موت کی بیکسی اور موت کے بعد کی تاریک مدت کا انھیں بھی احساس تھا۔ اس لئے اخلاقی نصائح کی قوت بشرطیکہ نفسیاتی بنیاد پر قائم ہو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو بھی سوچنے اور سمجھنے پر مجبور نہ کر دیتی خصوصاً جبکہ اس کا انعام دنیا میں غنیمت، غلام و کنیز اور عقبی میں جنت اور عور و قصور باور کرائے جائیں۔ ایک فاقہ مست قوم ان ہی وعدوں سے اُبھاری جاسکتی ہے

یہ ملک تھا، یہ قوم تھی اور یہ اُس کے حالات تھے جب ظہور اسلام ہوا۔ پھر چونکہ عیسائی مہذب، عرب موحدین یا حنفیہ اور کاہن برابر کہہ اور اطراف میں آتے جاتے تھے۔ اس لئے اُن کے ذریعہ سے مفرد تصورات کا ہم بہو پنجا بعید از قیاس نہ تھا۔ بنی اسرائیل کی کہانیاں زبانِ ہندو تھیں۔ اصنام پرستی کا اصولی ضمنت تھوڑی سی سنجیدہ طبیعت والے پر روشن ہے شاعر اپنے تصورات کی تشکیل اور ترتیب میں آزاد ہے۔ لوگوں میں آنے والے نبی یا مصلح کے چرچے ہمیشہ رہے ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ عیسائی بداد اور یہودی جدا نجات دلانے والے کے انتظار میں تھے۔ لیکن چونکہ نبوت کے لوازم میں فوق البشر عنصر کی ضرورت تھی۔ اور عرب کے نزدیک کلام سے زیادہ اثر کرنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے اگر ایک شخص میں آرٹ (شاعری) فلسفہ۔ تعمیری اصلاح کا شوق اور تہذیب و دلالت ہوں اور حالات کی مساعدت سے ہر ایک کے اظہار کا موقع حاصل ہو جائے۔ اور ارادہ کی پختگی اور خود اعتمادی اس کی مساعی میں شامل حال ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیاب نہ ہو ایک اور بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ زمانہ رسالت میں اعلیٰ سے کلمتہ الحق، نہایت محدود و پیمانہ پر ہوا۔ فتح مکہ تک تو صرف

لے حقاۃ مذہبی تمہیلین تھے جو مختلف اکناف عرب میں خاموش زندگیاں بسر کرتے رہے۔ موصوفین نے ان میں سے چند کے متعلق جسے جسے حقائق بھڑکے ہیں۔ مثلاً ان کے رقبہ بن نضل قریشی۔ زید بن عمر۔ امیہ بن ابی صامت ثقیفی زیادہ معروف ہیں۔ ان کے حالات کے متعلق اتنا ظلم ہے کہ وہ اصنام پرستی سے سخرت تھے ابراہیم کے اصل طریقوں کے جوہر تھے۔ مردہ جانور کا گوشت خون اور بتوں پر کی قربانی نہیں کھاتے تھے۔ نوزائیدہ لڑکی کا دفن کر دینے کو لغزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ابراہیم کے خدا کی پرستش کرتے ہیں

حوالی مدینہ کے چند قبائل داخل اسلام ہوئے

اس کے بعد دو تین غزوات اور سرایا میں صرف جنگی حکومت عمل میں آئی۔ مفتوحین جان و مال کے عوض باسانی چند اصول کی باتوں کو تسلیم کر لیتے تھے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں پھر ایمان کا دنیاوی انعام تمام قوم کو اس کی جانب متوجہ کر دینے کو کافی تھا۔ علاوہ بریں خانہ جنگی کے مقابلہ میں منظم زندگی۔ دسپن اور باقاعدگی کے فوائد۔ قوم بھر کی اخوت یہ سب باتیں وحشی اعرابیوں کو بھی رام کر سکیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اوسط عرب وسیع نظر سے قوم کے مفاد اور دیگر اغراض کی طرف غور کرنے کے قابل ہو گیا بلکہ ان میں کے بھدار لوگ ان تغیرات کو دنیاوی اعتبار سے منتظم سمجھنے لگے۔ اسلام کی داغ بیل اگر زمانہ رسالت میں رکھی گئی تو یقیناً استحکام اور قوت عہد خلافت میں ہم پہنچی۔ اس میں جناب عمر بن الخطاب کی شخصیت کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اسلام اگر بڑھایا نہ جاتا اور دوسری قوموں پر مسلط نہ ہوتا تو اپنے ملک کی خشک سرزمین میں بہت جلد کا عدم ہو جاتا۔ اسلام کے دور ارتقا میں اہم منزل کے نشانات یہ ہیں :- ہجرت کی کامیابی۔ جنگ بدر۔ جنگ نہادند۔ جنگ یرموک۔ نظام فاروقی اور امیر ولید کی فتوحات۔ نیم وحشی اقوام کی سیلابی تاخت بالمقابل قائم شدہ تمدنی نظاموں کی دنیا ایک سے زائد بار دیکھ چکی ہے۔ چنانچہ تاتاریوں کا سیلاب ایران و عراق پر۔ کشن اور یوپیچی اقوام کا ہندوستان پر گوتھ اور ونڈال کا روم پر۔ ہون قبائل کا شمالی یورپ پر تارخ میں ردشن ہے۔ اسلام بالکل قدرتی اسباب کی بنا پر پیدا ہوا بڑھا۔ پھیلا اور زوال پذیر ہوا۔ اس کے کسی دور میں نہ تو غیبی امداد شامل حال ہوئی نہ خدائی غضب نے اسے بچے گرایا

اب ہم اس نمید کے بعد اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جس چیز کو خدا کا کلام، باور کرایا گیا ہے اُس میں فی نفسہ ایسا سمجھے جانے کے عناصر موجود ہیں یا نہیں۔ قرآن موجودہ صورت میں بالکل غیر سائنٹفک طور پر مدون ہے۔ بنا ترتیب سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ طویل ترین سورۃ سے ابتدا کی گئی ہے۔ اور سب سے چھوٹی صورت پر اختتام کیا گیا ہے قدیم اہل عرب کو شعر کا مجموعہ کلام اور اس کے راوی اسی ترتیب سے یاد تھے۔ چنانچہ خلافت عمر و عثمان میں اسی اصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے

صاحب کلام نے اپنی معنوی تخلیق کی تدوین و ترتیب میں وہی استغنا اختیار کیا جو ہر زمانہ میں (اور اب بھی) بالکل اہل فن سے فطرتاً ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان کو اپنی تعلیم کی ترویج میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اور امت کو کتاب کی حفاظت کے لئے تاکید

لہ عرب میں لکھنے کا فن بہت بعد میں عام ہوا لیکن ماہیت کے شعرا کا کلام حیرت انگیز سمجھ کے ساتھ محفوظ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں سادہ دل کا پیشہ بہت عام تھا۔ جس قبیلہ میں شاعر ہوتے تھے اُس میں ناوی بھی ہوتے تھے اور وہ لوگ شعر کے کلام کو مع متعلقہ باتوں کے حفظ کر لیتے تھے جیسے ہندوستان میں بھاؤں کا پیشہ تھا اور انگلستان میں (Mendicant) فریئر کا۔ یہ لوگ اپنی اولاد کو بھی یہ فن تفویض کرتے تھے اس طرح سید بلبینہ مشہور کلام بانی رہے قرآنی حفاظ بھی اسی نوع میں شمار کئے جاسکتے ہیں

نہوئی حیثیت سے تھی نہ کہ خارجی حیثیت سے۔ چنانچہ متعلقہ لوگوں نے اس کی ترتیب میں کوئی خاص کاوش نہیں کی۔ مکی اور مدنی ورتوں میں بین فرق محسوس ہوتا ہے۔ مکی آیات مختصر، تبلیغ بلند اور موثر ہیں، مدنی کلام انتظامی، آئین سازی اور سیاست کی طرف راجع معلوم ہوتا ہے۔ متکلم کے دنیاوی ماحول اور حالات کا تغیر نفس کلام سے مترشح ہے۔ مثلاً مکی سورتوں میں جبکہ عداوت اور نصاریٰ سے سابقہ نہ ہوا تھا۔ ان کے طریقوں کی تردید کیس نہیں ہے اگر کہیں ذکر ہے تو نہایت محمل اور بلاغیت مدینہ میں یہود سے زیادہ سابقہ پر ان کی طرف سے مزاحمت ہوئی۔ لہذا ان کی نسبتاً زیادہ نگذیب۔ ان کے قصص اور آیات کی طرف پہلے درپے کنایہ۔ عادتاً اور قوم لوط جن کی بستیوں کے گھنڈر جا بجایا عرب کی گرد گرد گاہوں پر دکھائی دیتے ان سے استنباط

جدال و قتال کے متعلق احکام اُس وقت نازل ہوئے جب فی الواقعہ مدینہ کے قیام میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قبلہ کے تغیر کی بابت جو احکام صادر ہوئے وہ بھی اسی اصول پر مبنی تھے۔ کیونکہ مکہ کے قیام تک اہل کتاب سے مخالفت و وجہ پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد حالات بدلنے پر اس کی ضرورت محسوس ہوئی اسی طرح مصلحت زمانہ کے اعتبار سے قدیم عرب رسموں کا جو اڑ۔ مثلاً حرمت کعبہ۔ حرمت شہود طلاق۔ تعدد ازواج۔ لام و کنیز۔ غنیمت۔ قربانی وغیرہ کے مروجہ قواعد

ابتداءً 'بہشت' میں جبکہ مقصد صرف تبلیغ وحدانیت اور نگذیب شرک تھا۔ اسلوب خطاب نہایت زور دار اور رعب کُن ہے۔ سننے والوں کے ذہنی اشکال اور طبعی رجحانات کو نفسیاتی ذرائع سے متاثر کیا گیا ہے۔ چنانچہ خدا کی عظمت جبروت۔ اور تاریخی واقعات کی ترجمانی مصنوعی خداؤں کی بیچارگی ان کے طریقوں کی ناہمواری نہایت مسمیٰ فیض اور تصور الفاظ میں پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح منکرین کے عذاب کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک عامی کو سر مجیب فکر کر دینے کے لئے مت موزوں ہے۔ بچے اور ناتربیت یافتہ سخت گیر لوگ جزا اور سزا کی ایسی ہی تصویروں سے اُبھارے جاسکتے ہیں۔ اعلیٰ تر یہی پایہ کے لوگوں سے یہ کم دینا کافی ہوتا کہ انھیں مستقل عزت باذلت نصیب ہوگی۔ انھیں روحانی بلندیاں یا بستیاں حاصل ہوں گی (باقی)

قاضی محمد عمر یز عرفانی (نیو نیوی)

## ماہِ آئینہ سے

حضرت نیاز فتحپوری کا ایک مسلسل بے مثل افسانہ ہیراگ کا بروگ شائع ہوگا۔  
مینجر نگار لکھنؤ

# مکتوبات نیاز

ذیرم  
تمہاری شاعری سے تمہیں کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن مجھے ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس بہانہ سے کبھی کبھی تمہاری خیریت معلوم جاتی ہے۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ تم نے کبھی کوئی خط ایسا لکھا ہو جس میں کوئی غزل ملفوف نہ ہو اور اصلاح کی خواہش نہ کی گئی۔ پھر اسی کے ساتھ میں تمہارے صبر و استقلال کا بھی قائل ہوں کہ میں نے کبھی تمہاری خواہش پوری نہیں کی، لیکن تم نے کبھی مایوس ہو کر اس سلسلہ کو ختم نہیں کیا۔ تاہم یہ سوچتا ہوں کہ آخر کب تک میں ٹالتا رہوں گا اور تمہیں کب سمجھ آئے گی سیری خاموشی کو اور کچھ نہیں تو میری نااہلی ہی پر محمول کرو

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں شعر و شاعری ایک زمانہ ہوا ترک کر چکا ہوں اور مشکل ہی سے کسی کا کوئی شعر مجھے پسند آتا ہے۔ اس کو میرے معیار کی بلندی کمو، ضبط کمو، بے حسی سے تعبیر کرو، بہر حال جو کچھ سمجھو واقعہ یہ ہے کہ میرا دل اس فن سے اچاڑ چکا ہے اور دل و دماغ کے سامنے اور اتنے اہم مشاغل موجود ہیں کہ اس طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ پھر اسی

لے ساتھ جب تمہاری غزلوں کو دیکھتا ہوں تو ان میں اصلاح کی بھی کوئی گنجائش نہیں پاتا کیونکہ اصلاح کا مقصد تو مابجا مقام کو دور کرنا ہے، لیکن جس غزل میں تلاش سے بھی کوئی معقول بات نظر نہ آئے۔ اس کی اصلاح تو صرف اسی طرح ممکن ہے کہ از سر نو دوسری لکھ دی جائے، پھر بتاؤ کیا مجھے سودا ہے کہ میں خواہ مخواہ تمہیں غزلیں کہہ کر دیا کروں اور تم کو فریب نفس بن جیلا کروں جس کی خیر سے لوں بھی تم میں کوئی کمی نہیں۔ باگل ہوئے ہو، اپنا کام کرو اور اس ضبط کو چھوڑ دو۔ نہ

حاری تعلیم پوری، نہ تمہاری صحبت معقول، نہ تمہارا مول ٹھکانے کا، پھر جو یہ ضبط تم پر سوار ہوا ہے سو کیوں؟ اگر تم کو میرے ساتھ کوئی علاوہ ایسا ہے جو کبھی کبھی خیریت لکھنے اور دریافت کرنے پر مجبور کر سکتا ہے تو اس قسم کی مراسلت سیر

لے یقیناً باعث مسرت ہو سکتی ہے، لیکن محض "غزلبادی" کے لئے کیوں اپنے پیسوں کا اور میرے دل کا خون کرتے ہو

نیاز

میر صاحب قبلہ

خط ملا۔ دلپرسی کا شکریہ۔ آپ مجھ سے تفصیل چاہتے ہیں۔ حالانکہ مجھ میں ”اجمال“ کی بھی تاب نہیں۔ آپ کے جواں بخت و جواں سال تلمیذ اجل، یعنی آپ کی مملکت شہ و سخن کے ”ساراجمار“ کی تحریر جو انھوں نے اچھے گڑھے لکھی تھی میرے پاس بھیج دی گئی ہے۔ کیا کیا گل افشائیاں کی ہیں، کیا کیا ”برشیں تیغ جفا“ پر ناز فرماتا ہے۔ حل وصل ان کو میرے آپ کے تعلقات معلوم، وہاں میری پوزیشن اُن پر روشن، علاوہ بریں اس تمام ماحول سے آگاہ جس میں زندگی بسر کر رہا ہوں، لیکن اللہ رس غورِ حسن و جوانی کے بے دھڑک پیغام بھیج دیا۔ اور میری برائی میں اپنی کامیابی سمجھ کر گھوٹ کا طواری باندھ دیا۔ یقیناً میں اس تعلق کا مخالف تھا اور ہوں لیکن خدا را اُن سے پوچھئے کہ اس سے خود میری کیا غرض متعلق تھی

انھوں نے میرے رسوخ سے خواہ مخواہ جذبہ رقاوت پیدا کر لیا۔ اور ظاہر ہے کہ ”رقیب روسیہ“ کو ایک شاعر کا لیاں نہ دیگا تو اور کیا کرے گا۔ بہر حال اس سے میرا نقصان تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوا کہ تھوڑی سی ندامت و خفت اٹھانا پڑی، لیکن اُن کے لئے کامیابی کی اب کوئی ادنیٰ اسی صورت میں باقی نہیں رہی۔ کئے تو ان کا اصل خطر روانہ کر دوں؟ آپ کے تو وہ محبوب شاگرد ہیں، آپ ہی سمجھائے کہ جوانی میں تھوڑا سا دیوانہ پن تو خیر ہونا ہی چاہئے، لیکن یہ ”پامی پن“ کیسا؟

نیاز

گفتی کہ چرا سالِ دل زار نہ گوئی

من خود کتم آغاز بہ پایاں کہ رساند؟

آپ کیا اس سے زیادہ تفصیل چاہتے ہیں، اس لئے زیادہ سننے کے متمنی ہیں؟ آہ، اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

یہ نہ پوچھئے کہ جو کچھ ہوا کیو کھر ہوا بلکہ یہ سوچئے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ مجھ میں تو اتنی سکت بھی نہیں کہ مستقبل کی تاریکی کا خیال تک دل میں لا سکوں۔ جی چاہتا ہے کہ کپڑے بھاڑ کر کسی ایسی دنیا میں چلا جاؤں جہاں کم از کم آزادی سے مروت و سکون۔ یہاں تو یہ بھی ممکن نہیں۔ دم گھٹتا ہے، جی الجھتا ہے اس کے خیال سے اس کے خیال سے ساری دنیا کے خیال سے۔ پھر لطف یہ کہ مجھے خاموش دیکھ کر بعض سنگ دل کہتے ہیں، بعض صبر و ضبط کی داد دیتے ہیں۔ اور یہ خبر کسی کو نہیں کہ جب کلیجہ سے دھواں سا اٹھتا ہے تو میرا کیا عالم ہوتا ہے

آپ فرماتے ہیں کہ چند دن کے لئے کسی اور جگہ چلا جاؤں۔ مشورہ مناسب ہے، لیکن کوئی تدبیر ایسی بتائیے کہ دل و دماغ

میرے ہمیں رہ جائیں۔ ورنہ یوں کہیں جانا بیکار ہے

جانتا ہوں کہ رفتہ رفتہ یہ غم بھی کم ہو جائے گا، چند دن اور اس شیش کی لذت اٹھا لینے دیجئے

سنگوار۔ نیاز

خوب، اندازِ بیان ہی وہ چیز ہے جس سے شاعر کے صحیح جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ بولنے میں لب و لہجہ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، لیکن تحریر میں تو یہ کام اندازِ بیان ہی سے لیا جاسکتا ہے فارسی میں خدا جانے کتنے غزل گو شعرا گر چکے ہیں، لیکن جذباتِ محبت کو پوری صداقت و سادگی کے ساتھ بیان کرنے میں سعدی کی انفرادیت اپنی جگہ قائم ہے۔ یہی حال اردو میں میر کا ہے۔ پھر یہ کہ شہ اندازِ بیان کا نہیں تو کس بات کا ہے؟ مومن کا رشک آمیز سوز، غالب کا شوخ و ذہین تعشق، خواجہ میر درد کی والہانہ لہجہ، ان سب کی تفریق اندازِ بیان ہی سے تو ہوتی ہے ورنہ یوں کون سا ذریعہ تعین و امتیاز کا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا کہ ایک نقاد کا مختلف ”اسالیبِ لہجہ“ سے آگاہ ہونا اور ان کو دیکھ کر شاعر کے جذبات پر حکم لگانے کی اہلیت رکھنا از بس ضروری ہے مشہور شعر ہے :-

جلوے مری نگاہ میں کون کونساں کے ہیں

مجھ سے کہاں پھپس گئے وہ ایسے کہاں کے ہیں

کتنا پیارا شعر ہے، لیکن اس کو صرف نقاد ہی سمجھ سکتا ہے کہ پہلا مصرع صرف مطلع بنانے کے لئے لکھا گیا ہے ورنہ صحیح رنگِ تغزل کا اقتضا کچھ اور تھا

آپ کسی کے سامنے صرف دوسرا مصرع پڑھئے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ شاعر نے اس میں اپنے محبوب کا ذکر کیا ہے جو اسی دنیا سے متعلق ہے۔ لیکن جب آپ پورا شعر پڑھیں گے تو اس کا خیال دوسری طرف منتقل ہو جائے گا۔ اور دوسرے مصرع کا خطاب جو پہلے اس نے سمجھا تھا۔ اب بالکل بدلا ہوا نظر آئے گا۔ کیونکہ دنیاوی محبوب کا تعلق نہ کون و مکان سے ہے۔ اور نہ کار و بار محبت میں اس کے ذکر کی ضرورت — اس لئے یہ شعر تو اپنی جگہ مکمل ہے لیکن اس رنگ سے ہٹا ہوا ہے۔ جو دوسرے مصرع کا اقتضا تھا۔ اور یہ فرق پیدا کر دیا صرف لفظ جلوہ اور کون و مکان نے اگر پہلے مصرع سے کچھ اس طرح کا مفہوم پیدا ہوتا کہ

وہ میری روح میں ہیں، نظر میں ہیں، دل میں ہیں

دل میں جے ہوئے ہیں، نظر میں بے ہوئے

اپنی نگاہِ شوق پر ہے مجھ کو اعتماد

یا

یا



تو یہ شعر حمد و نعت میں رہتا گو اعلیٰ معیار کا پھر بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ دوسرے مصرعہ کے انداز بیان میں جو اتانیت و طنز پنہاں ہے وہ شعر کو بلندی کی طرف سے پستی کی طرف کھینچ رہا ہے

تقریباً اسی مفہوم کا ایک شعر عربی کا بآگیا، دیکھئے اسی جذبہ کو کس دالمانہ انداز سے ظاہر کیا ہے:-

جمالک فی عینی و حبک فی قلبی

و ذکرک فی فنی فاین تغیب

یعنی — اے تو وہ کہ تیری صورت آنکھوں میں بسی ہوئی ہے، تیری محبت دل میں سائی ہوئی اور تیرا ذکر ہر وقت زبان پر ہے تو کہاں تجھ سے چھپ کر رہ سکتا ہے

اب غور کیجئے کہ انداز بیان نے اسی مفہوم کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ سوردا اس کے اس دوہے کو دیکھئے:-

ہاتھ پھرائے جات ہونیل جان کے موئے

ہردے میں سے جاؤ گے تو مرد بد دنگی توئے

یعنی — مجھے کمر در جان کر زبردستی ہاتھ چھڑکے چلے جا رہے ہو لیکن میرے دل سے نکل جاؤ تو جانوں کہ بڑے فرد ہو۔ ہر چند اس میں بھی الٹی سی کیفیت طنز کی ہے لیکن انداز بیان نے اس میں بھی خاص فتادگی پیدا کر دی ہے

بہر حال میری رائے تو یہی ہے کہ شاعری میں اصل چیز انداز بیان ہے۔ اگر آپ کے نزدیک بلندی مضمون کوئی اور

چیز ہے اور سب سے زیادہ اہمیت وہی رکھتی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، کیا کر سکتا ہوں، جبکہ اس زمانہ میں غزل کا معیار تصوف و فلسفہ طرازی کے سنانے سے صرف مہمل گوئی قرار پا گیا ہے

نیاز

بیدل ! ہائے بیدل ! ہائے بیدل !! آپ نے بھی کیا ذکر بھیر دیا۔ اس کجخت میں فارسیت ہو یا نہ ہو، لطفِ زبان پایا جائے یا نہ پایا جائے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ تخیل کا بادشاہ ہے، ندرتِ بیان کا خدا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک رند زولیدہ موہے، جو لفظ اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ دل میں تیر و سنان کی طرح پوست پہ جاتا

ہر کجا نکلت گل پیرہن رنگ و رو :-

نہیست پوشیدہ کہ از خود سفر ہے بخواب

پھول کو ”پیرہن رنگ“ کہنا اور نکلت کو گل کی ”جامہ دری“ ”حُسنِ تعبیر کی وہ مدہ ہے جہاں نہ نظیری کی رسائی ہے نہ حافظ کی اور ”از خود سفر ہے می خواب“ تو وہ انداز بیان ہے جسے بہت سے نادانِ صرف مزنی لڑ بچر کی خصوصیت سمجھے ہوئے ہیں

بکات و چار عناصر پر کیا موقوف ہے، اس کا تو ایک ایک لفظ حوزہ جاں بنانے کے قابل ہے۔ فتویاں دیکھئے اور فتا کا مطالعہ کیجئے، قطعات و رباعیات بدرودِ عین، لیکن زبان نہ کھولے، کون کھتا ہے اور کسے کھنے کا ہوش ہے۔ وہ خود کہ گیا ہے کہ

چہ رسد نانشہ معنوی بہ دماغ بے جس لبے خبر  
زیری پیائے لگرشی بہ دکان خدیشہ گراں مبر

نیاز

بندہ نواز،

شکر ہے آپ نے مجھے پوچھا، لیکن اُس وقت جب

شایان دست و بار و قالی نہیں! ہا

پھر ناشہ یہ ہے کہ اگر میری طرف سے "اعتزاف" میں کمی ہوگی تو آپ مجھی کو موردِ اہرام قرار دیں گے، آجا

کمند کو تہ و بازوئے سُست و بام بلند

بہنِ حوالہ و لومیدیم گنہ گیسرند

واقعہ یہ ہے کہ میں اب کسی قابل نہیں رہا۔ "بندہ بگریختہ" نہیں بلکہ "بندہ معذور" جان کر میرے پاؤں کی بخیر کاٹ دیجئے۔ اربابِ کرم کا بھی شیوہ ہے۔ ورزیوں مجھے امتثالِ امر میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ حاضر ہوں گا اور سر کے بل حاضر ہوں گا، لیکن ڈرتا ہوں کہ شاید امیری وجہ سے آپ کی محفلِ نشاط میں افسردگی پیدا ہو اور ایک داغِ ناکامی اور لے کر وہاں سے واپس ہوں

نیاز

آپ بھی عجیب چیز ہیں۔ پریشانیوں کی شکایت خدا سے کرتے ہیں جہاں تاثر و انفعال کا گزر رہی نہیں۔ ہر بے نصیب شخص اپنی جگہ یہی باور کرتا ہے کہ جو مصائب اس پر نازل ہوئے ہیں وہ انتہائی مصائب ہیں اور اُس سے زیادہ مظلوم دُنیا میں کوئی نہیں۔ لیکن اسے کیا خبر کہ قدرت کے ترکش میں کیسے کیسے تیر رہا ہے اور وہ کس کس طرح اُن سے کام لیتی ہے۔ درد و بیچارگی کی کوئی انتہائی صورت قیاس کر لو، لیکن واقعتاً اس سے بھی زیادہ الم انجیز صورتیں پیدا ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ فطرت کا نظام ہی یہ ہے

مذہب کی تلقین اس باب میں صرف اس حد تک مفید ہے کہ انسان صبر و ضبط کا عادی ہو جاتا ہے۔ ورنہ دعا

”استحباب دعا معلوم ! تدبیر کے بن پڑنے کا نام قبول دعا ہے، اور جب کچھ نہیں بڑتی تو اہل مذاہب اس کو ”مصلحت خداوندی“ سے تعبیر کرتے ہیں، یہ سب الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقت کچھ نہیں —

یقیناً آپ کی مایوسیاں اس طرح سے اور زیادہ بڑھ جائیں گی، لیکن کیا کروں۔ صبر و ضبط کی لامعنی تلقین میرے بس کی بات نہیں۔ میں کیوں وہ بات کہوں جسے کھلا ہوا فریب سمجھتا ہوں۔ مگر ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تدبیر سے غافل نہ رہئے، دُنیا میں جب تک زندہ رہنا ہے اسی طرح مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا، کبھی آپ کامیاب ہو جائیں گے اور کبھی مغلوب۔ لیکن مغلوب ہو جانا ہتھیار ڈال دینا نہیں ہے، اس لئے ہاتھ پاؤں چلائے جائے اور میرے کرنے کی جو بات ہو اس سے مطلع فرمائے۔ محض غم و غصہ بیکار بات ہے اور دعا اس سے زیادہ بیکار

نیاز

محترم  
 نامہ گرامی ملا — آج کل یہاں کا موسم خود کشی کی حد سے شاید ہی ایک آدھ ڈگری کم ہو۔ ظاہر ہے کہ زمینی تال کے بہنے والے اس وقت بہشت میں ہیں۔ لیکن مجھ کافر کا دہاں گزر کیونکر ہو — بہر حال جنت والوں کو میرا سلام پہونچے اور حسرت نارسائی — مضامین کا منتظر ہوں

نیاز

## ادٹیر صاحب نگار کی رائے خضاب بلیک ڈائمنڈ کے متعلق

ادٹیر صاحب نگار فرماتے ہیں: —

”اس میں شک نہیں کہ عام طور پر جو خضاب طیار ہوتے ہیں ان میں نمایاں کار جو شامل ہوتا ہے جو آہستہ نو مگر نہایت مسلک قسم کا رہے اور اسی لئے اب لوگوں میں اس کی مغرت کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ خضاب بلیک ڈائمنڈ کے مالک نے اپنا خضاب میرے سامنے طیار کر کے دکھایا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میں واقعی کوئی مغرت دساں جو شامل نہیں ہے۔ تجربے سے اس کا رنگ بھی نہایت پختہ سیاہ ثابت ہوا اور جلد پر دھبہ بھی باقی نہیں رہتا“

کیا اس سے زیادہ کوئی اور شہوت ہمارے خضاب کی عمدگی کا ہو سکتا ہے ؟ قیمت فی شیشی عدد (علاوہ محصول) تین شیشیاں طلب کرنے والوں کو محصول میں بہت کفایت ہو سکتی ہے

میجر کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

# باب الانتقاد

## اصغر کے سوشلزم

دہلی کے مکتبہ جامعہ نے ایک نیا اور نہایت دلچسپ سلسلہ مشاہیر شعراء کے انتخاب کلام کا شروع کیا ہے اس سلسلہ کے دو پہلٹ جن میں اصغر و جگر کے سوشلزم انتخاب کر کے درج کئے گئے ہیں۔ بغرض ریویو ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ اور آج کی صحبت میں ہم اصغر کے انتخاب کلام پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:-  
انتخاب کرنے والے کوئی بزرگ محمود علی خاں صاحب ہیں اور جس اصول کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق خود انتخاب کنندہ کے الفاظ یہ ہیں:-

”اس مجموعہ میں حضرت اصغر کے ایک سو منتخب اشعار درج ہیں جو لطافت بیان، اور یکسانہ مضامین سے بالامال ہیں، خصوصاً تصوف و حکمت، علم و عرفان، اسرار و معارف، ذوق مشاہدہ، افشاں راز اجمال دوست، احساس خودی، اور حقایق نگاری وغیرہ کے چیدہ اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اور آخر میں الفاظ میں مصوری کے چند نمونے بھی درج کئے گئے ہیں“

قبل اس کے کہ اصغر کے کلام پر غور کیا جائے یہ امر ضروری ہے کہ انتخاب کنندہ کے اصول انتخاب کو سمجھ لیا جائے۔ اور نیز یہ کہ وہ اصول بجائے خود درست بھی ہے یا نہیں؟

غالباً اس جگہ یہ بحث موزوں نہ ہوگی کہ تغزل میں ”تصوف و فلسفہ“ کے شمول کی بدعت کب اور کیوں رائج ہوئی، لیکن اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ”تصوف و فلسفہ“ جسے آج کل غزل گوئی کا معیار بلند سمجھا جاتا ہے حقیقتاً کیا چیز ہے۔۔۔۔۔ میں اگر انتخاب کنندہ سے یہ سوال کر بیٹھوں کہ یکسانہ مضامین سے ان کی کیا مراد ہے، تصوف و حکمت کسے کہتے ہیں، علم و عرفان، اسرار و معارف سے ان کا کیا مقصود ہے، ذوق مشاہدہ، افشاں راز اور احساس خودی کیا بلاتے ہیں، تو وہ غالباً اس کا جواب نثر میں تو دے سکیں گے، لیکن ہے کسی شاعر کا کوئی شعر بڑھ دیں گے کہ دیکھو یہ ہے حکمت

و تصوف وغیرہ وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے شعراء اور اُن کے بعض ہوا خواہ ناقدین نے چند الفاظ یاد کر لئے ہیں۔ جو لغت کے اعتبار سے خواہ کچھ مفہوم رکھتے ہوں، لیکن غزل گوئی کی دنیا میں ان کا اصطلاحی مفہوم کوئی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ سننے والا ان الفاظ سے عجب ہو کر شعر کی داد دینے پر مجبور ہو جائے

یقیناً ”تصوف“ کے کچھ مخصوص اعتقادات ہیں، بعض معین نظر پے ہیں، اور اس میں بھی کلام نہیں کہ انہیات کی بعض تفسیروں کو جن میں سے سب سے زیادہ الجھی ہوئی چیز ”خدا اور خدا کا مفہوم“ ہے، اس نے بوجہ احسن سلجھا یا ہے لیکن ”غزل“ سے ان باتوں کو کیا واسطہ۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا، یعنی اس غلطی کی ابتدا شاعروں کی طرف سے ہوئی یا صوفیوں کی طرف سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں شاعروں کا دامن آلودہ نہیں ہے بلکہ اس بدعت کے مخترع ہمارے آریاب تصوف ہی ہیں

ہرم سماع منعقد ہے، صاحب سجادہ مہتمم اُن خواہر و علامات کے جو اظہار تقدس کے لئے ضروری ہیں۔ صدر میں جلوہ افروز ہیں، امداد تمدن انیالیس کیش مودب سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں، سامنے مزار پر درکار چادر میں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں، نمود و مندل کے بخور سے فضا مسطر ہو رہی ہے۔ اور

مضطرب، بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے !

”سیچ پیمان کشمیری و ترکان سمرقندی“ سامنے موجود ہیں، شراب اور منبجوں کا ذکر دلوں میں گرمی پیدا کر رہا ہے، ہا کی غزلیں گانگا کر زاہد کی پگڑی اچھالی جا رہی ہے، روزہ و نماز کی توہین ہو رہی ہے، کعبہ حرم پر بنگہ و میخانہ کو ترنم دی جا رہی ہے، اور علی الاعلان کہا جا رہا ہے کہ

اد قول زاہد کر دیم توبہ

و در فضل عابد استغفر اللہ

دعوتِ رقص و شراب کھلم کھلا دی جا رہی ہے کہ

عید ست و موسم گل ساقی بیار بادہ

ہنگام گل کہ دیدہ ست بے مے قح منادہ

اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ تقدس مذہبی کو دفتر بے معنی لکھ ”غرقِ مے ناب“ کر دینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے —

پھر، مجلس میں اگر سوار امداد تمدن ہیں تو دو چار سوچنے بکھنے والے بھی ہیں۔ آپس میں سرگوشیاں ہوتی ہیں کہ زاہد کی یہ تعلیم کیسی ہے کہ دین و مذہب ہی کو بُرا کہا جا رہا ہے، اخلاق کا یہ کیسا درس ہے جس میں سوائے ساقی و شراب کے کسی چیز کا ذکر ہی نہیں — رفتہ رفتہ صاحب سجادہ کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچتی ہے اور پھر جو فلسفہ ”ہویت“ ہو تو

آتا ہے تو نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ”ساتی“ خدا ہو جاتا ہے اور شرب و کوشر ”بیکدہ“ دل فریاد یا ہوجو مہبط انوار الہی ہے اور ”مشتوق“ کا سستی وہ پیر کمن سال، جس کے ہاتھ پر ہیبتِ توبہ و سلوک کی جاتی ہے یہ ہیں حقایق و معارف اور اسرار و خواص کے وہ مظالم جو غریب شاعری کی جانب نا تو اں پر اول اول توڑے گئے اور پھر رفتہ رفتہ بدعت اس قدر عام ہوئی کہ محبت کی ایک قسم ہی علاحدہ ہو گئی جسے ”عشقِ حقیقی“ کہتے ہیں اور ایک اچھے اور بلند شعر کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں رہ گیا کہ نہ خود شاعر سمجھ سکے۔ نہ کسی اور کو سمجھا سکے حقیقتاً غزل نام ہے صرف جذباتِ محبت کو جو اسی دنیا اور دنیائی دنیا کے مشتوق سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ نہایت صاف و سادہ زبان میں ادا کر دینا۔ پھر اس سے پہلے کے بعد ایک شعر چاہے ”کلام اللہ“ ہو جائے لیکن تغزل تو اس میں رہتا نہیں ”عشقِ حقیقی“ کیا ہے ؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کیا ہے ؟ اور ظاہر ہے کہ خدا کو شاعری سے کیا واسطہ ؟ یا شاعری کو خدا سے کیا تعلق ؟

محبت نام ہے اس خاص کیفیت کا جو گوشت و پوست کی زندگی میں کسی تعلقِ غلط کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور اس کیفیت کا اظہار غزل ہے۔ پھر ممکن ہے کہ ایک صوفی جو اخلاق و مذہب کی آڑ میں شکار کرنا چاہتا ہے وہ اس کو پسند نہ کرے اور کسی ایسی تاویل پر مجبور ہو جائے۔ جو اس کے تقدس کا بھرم رکھنے والی ہو، لیکن شاعر کو کیا غرض کہ وہ اس کی رعایت سے اپنی زبان بدل دے۔ پھر حافظہ اور اس کے بعد بھی کچھ اور شاعر ایسے نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور کھلم کھلا وہی کہتے رہے جو انھیں کتنا تھا۔ خواہ ایک صوفی کا دامن تاویلیں کر کے بیکار رہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن بعد کو جب مسلمانوں میں قوتِ عمل اور زیادہ ضعیف ہو گئی، عام قومی انحطاط نے فکر صحیح سے ان کے دماغوں کو بیگانہ کر دیا اور جہل و لاعلمی نے خانقاہوں کی گرم بازاری کو تقویت پہنچائی، تو شاعر بھی اپنی منزل سے ہٹنے آئے، اس نے بھی اپنی زبان بدل دی اور آخر کار اس نے وہ الفاظ بھی ترک کر دیے جن کی تاویل کی ضرورت ہو اگر کتنی عقلی۔ یعنی اب وہ بھی عشقِ حقیقی کے چکر میں آگیا اور تصوف کی اُن بہت سی اصطلاحوں کو جن کا کوئی حقیقی مفہوم نہیں ہے، وہ اپنی شاعری میں صرف کرتے لگا۔ خیر پہلے تو ایک صوفی کسی غزل کی تاویل کر کے اپنے رنگ میں اسے کھینچ لانا تھا، لیکن اب ایک عاشق کے لئے یہ تاویل بھی ممکن نہیں رہی۔ کیونکہ جب تک خدا کو ساتی کے نام سے پکارا جاتا تھا، زند کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ فضول آوازوں کی طرف سے اپنے کان بند کر کے ساتی کو ساتی ہی سمجھے، لیکن جب ساتی کو بھی خدا کہا جانے لگا تو ظاہر ہے کہ ”زند بے نوش“ سوائے جان دیدینے کے اور کیا کر سکتا تھا

تصوف یا تصوف کی شاعری میں جن چیزوں کو اسرار و معارف، علم و عرفان وغیرہ بہت سے مہل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے وہ صرف دو نظریوں میں محدود ہیں۔ ایک یہ کہ خدا ہر جگہ اور ہر چیز میں ساری دھاری ہے اور دوسری

یہ کہ اس کی گنہ حقیقت دریافت کرنے سے انسان عاجز ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریے کسی "علم قطعی" سے متعلق نہ ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان دو نظریوں میں سے ایک میں خود ہی جہل و غرر کا اعتراف ہے اور دوسرا جسے نظریہ "ہوتیت" یا "وحدۃ الوجود" کہتے ہیں ایک ایسی تعبیر ہے جسے ایک خیال پرست شخص تو مان سکتا ہے لیکن علم کو درجہ یقین تک پہنچانے والوں کے لئے اس میں زیادہ سامان دلچسپی موجود نہیں۔ پھر جب تصوف کی بنیاد ہی ایسے مجہول نظریوں پر قائم ہے تو اس میں اسرار و غوامض یا علوم و معارف کیا ہو سکتے ہیں، اور ایک شاعر ان کے اظہار میں وہ کونسی بات پیدا کر سکتا ہے جو جوش و ولولہ کی حامل ہو اس نوع کے شاعروں میں سب سے بلند مرتبہ بیدل کا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی اسی عالم حیرت و استعجاب میں بسر کر دی جو فلسفہ "ہوتیت" نے اس پر طاری کر دیا تھا، لیکن کیا اس کی قدر و غزل گوئی کے لحاظ سے کی جاتی ہے، کیا وہ اپنے رنگ تغزل کی وجہ سے کامیاب شاعر کہلایا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں اس کی کامیابی کا راز صرف اس کا انداز بیان، تنوع تعبیرات، اور علوئے تخیل ہے، جو انسان کی قوت متخیلہ کو مسجور کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ علاوہ بیدل کے اس وقت تک کوئی دوسرا شاعر اس رنگ کا پیدا ہوا ہے؟ — اس نے غزل گوئی ترک کر کے جس شاعری کی بنیاد ڈالی، اس کے لئے اس نے ایک زبان بھی تخلیق و وضع کر دی اور یہ وہ خصوصیت تھی جس نے اس کو ایک مخترع و مبدع کی حیثیت سے دنیا میں پیش کیا اور اس اختراع و ابداع کو وہ اپنے ہی ساتھ لے گیا۔ دوسرا از بیدل کی کامیابی کا یہ تھا کہ وہ فارسی زبان میں شاعری کرتا تھا جو اردو کے مقابلہ میں زیادہ وسیع، زیادہ لطیف و شیریں اور زیادہ ابجاذ کی گنجائش رکھتی ہے۔ اس لئے اردو میں اگر اس کا متبع کیا بھی جائے تو کامیابی ممکن نہیں کیونکہ اول تو بلند سے بلند خیال کوئی ایسا نہیں جو بیدل کی دسترس سے باہر رہا ہو اور دوسرے یہ کہ اردو میں الفاظ کی کمی اور حروف و روایط کی زیادتی نے اس کو محال بنا دیا ہے۔

بہر حال اردو میں غزل کو تصوف و حکمت سے گراں بار کرنے کی رسم فارسی سے آئی ہے اور آئی چاہے تھی، کیونکہ اردو شاعری بحیرہ فارسی کی نقل ہے جس میں مسلمانوں نے کبھی کوئی مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ مسلمانوں کی یہ ملعون ذہنیت کہ وہ ہندوستان میں ایک اجنبی فاتح کی حیثیت سے آئے اور کفرستان ہند سے اپنے آپ کو مذہب کرنا ان کی توہین ہے۔ کب ان کو یہاں کی شاعری کا متبع کرنے کی اجازت دے سکتی تھی۔ اور وہ کیوں بیدل کو چھوڑ کر کوہل اور مہیشا کی طرف آسکتے تھے، اسی طرح جو کچھ ایرانی امر پرستانہ شاعری حلقہ زہد و اتقا میں قدم قدم پر تاویلوں کی محتاج تھی، اس لئے اردو میں بھی وہی رنگ پیدا ہو گیا۔ اور "عشق حقیقی" والی لغو و مہمل ذہنیت یہاں کے شاعروں میں بھی پیدا ہو گئی جس کو اسرار و معارف اور فلسفہ و حکمت کا خزانہ بنایا جاتا ہے اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ تصوف نے جو تصور خدا (Conception of God)





تو یقیناً ہم اسے غزل کی توہین کریں گے اور اگر انداز بیان کے لحاظ سے وہ ”رختِ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس“ ہے تو یقیناً اسے غزل سے خارج سمجھنا پڑے گا۔

پھر جو کچھ کاروبارِ محبت میں نہ تاثرات کی کوئی انتہا ہے نہ اندازِ بیان کے تنوع کی، اس لئے استعارات و تشبیہات، کنایات و محاکات وغیرہ کے استزاج سے ایک نہایت وسیع میدانِ شاعر کے سامنے آجاتا ہے جس میں وہ اپنے تخیل و تخیل دونوں سے مدد لے کر بہت کچھ چولانیاں دکھا سکتا ہے اور وہ قطعاً ان تمام مفروضہ اسرار و معارف کے اظہار پر مجبور نہیں جنہیں اربابِ تصوف کے تاویلِ عشقِ حقیقی سے منسوب کیا جاتا ہے یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ صرف اس تحریر سے متاثر ہو کر لکھا گیا جو محمود علی خاں صاحب نے اپنے دیباچہ میں تصوف و مکت ”کے متعلق درج کی ہے اور جسے اپنے پندار میں نہایت بلند معیارِ غزل سمجھ کر اصفہر کے کلام کو اس پر منطبق کرنا چاہا ہے

ہر چند جس معیار کو قائم رکھ کر انتخاب کنندہ نے یہ مجموعہ پیش کیا ہے وہ اس قدر تمہید کے بعد محتاج تنقید باقی نہیں رہتا کیونکہ اگر واقعی اصفہر کے ایسے ہی اشعار انھوں نے چننے میں جن میں سوائے متصوفانہ اسرار و معارف کے اور کچھ نہیں تو میں اپنی رائے اُن کے متعلق ظاہر کر چکا، لیکن اگر انتخاب کنندہ نے غلطی سے انھیں ایسا سمجھ لیا ہے تو بیشک دیکھنے اور سمجھنے کی گنجائش باقی ہے۔ اس لئے آئے ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لیں۔

اصغر کا کلام میں اس سے قبل بھی بار بار دیکھ چکا ہوں اور اُن کے بعض اشعار سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ اس لئے بغیر اس انتخاب کو دیکھتے ہوئے بھی اُن کی شاعری کے متعلق رائے زنی کا مستحق اپنے آپ کو سمجھوں تو غلط نہ ہوگا۔ تاہم میں اس کو کسی اور صحبت پر ملتوی رکھتے ہوئے صرف اس مجموعہ پر تنقید کرنا چاہتا ہوں جو جامعہ ملیہ نے اس عرض سے میرے پاس بھیجا ہے اس میں کلام نہیں کہ اصغر آجکل کے مبتذل گو شعراء سے بالکل علیحدہ رنگ رکھتے ہیں اور وہ ہمیشہ کوئی ایسی بات کہنا چاہتے ہیں۔ جو انسان کو غور و تامل کی طرف مایل کر دے۔ لیکن کہیں وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور کہیں نہیں بعض بعض اشعار میں وہ اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایسے الفاظ پاگئے ہیں جو ذہنِ سامع کو جلد کسی نتیجہ صریح کی طرف لے آتے ہیں اور بعض میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی، خواہ یہ ناکامی خود اپنے جذبہ کے نہ سمجھ سکے کی وجہ سے ہوئی ہو یا مناسب الفاظ فراہم نہ ہو سکے سے۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے:-

فقس کی باد میں یہ اضطرابِ لعلِ محلا شد  
کہ میں نے تو ذکرِ ایک ایک شمعِ آشیانِ کھدی

اس میں شاعر صرف اس جذبہ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ محبت کی اسیری پر دنیا کا ہر اطمینان و سکون قربان کر دینے کے قابل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس مفہوم کو انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے اور سننے والے کا ذہن بغیر کسی انتشار و غلط



بلیں کا ذکر کرنا۔ کوئی خاص مفہوم نہیں رکھتا کیونکہ عاشق کے تحت میں وہ بھی آجاتی ہے اور اگر بلیں کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ عشق کی کار فرمائی انسان و حیوان دونوں پر ظاہر ہو جائے تو پھر نگاہِ یاس کا ٹکڑا علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اگر پہلا مصرعہ بدل کر شعر یوں ہو جاتا :-

نگاہِ یاس ، درد نامرادی ، رنجِ محرومی  
معاذ اللہ کتنی صورتیں ہیں اُنکے پیکاں کی

تو حروفِ عطف کا عیب بھی نکل جاتا اور تینوں ٹکڑے بھی محض "کیفیت" سے متعلق ہو کر برابر کے ہو جاتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس صورت میں حقیقتاً تینوں چیز ایک ہی قرار پاتی ہیں تو یہی اعتراض اُس مصرعہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نگاہِ یاس اور آہ و نالہ بھی فی الحقیقت ایک ہی کیفیت کی مختلف صورتیں ہیں بعض اشعار میں صرف ایک ایک لفظ لئے تعبیر کو ناقص کر دیا ہے مثلاً  
عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آگیا  
ان گلوں کو چھیر کر بچے گلستاں کر دیا

دوسرے مصرعہ میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ گلوں کو گلستاں کر دیا یعنی ان کی رنگینی کو اتنا بڑھا دیا کہ بھول گلستاں ہو کر رہ گئے ، لیکن پہلے مصرعہ میں اس فراوانی کو "رنگ سا کچھ آگیا" سے ظاہر کیا گیا ہے جو بجائے فراوانی کے "قلت" کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لئے اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :-

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ ہی رنگ آگیا  
عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا رنگ آگیا !

تو عیب دور ہو جاتا

ایک اور شعر میں اسی طرح کی غزو گزاشت پائی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشم مست پر  
ہلکا سا ابر بھی سر میخانہ دیکھتے

دوسرے مصرعہ میں ہلکا سا لکھا گیا ہے جسکی رعایت پہلے مصرعہ میں موجود نہیں۔ اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا :-

بکھری ہوئی سی زلف بھی چشم مست پر

تو پہلے سے ابر کا مقابلہ ٹھیک ہو جاتا۔ بعض بعض شعروں میں ہلکی سی ہلک بکھنوی رنگ کی بھی پائی جاتی ہے مثلاً

داستاں اُن کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن

اس میں کچھ خونِ تنہا بھی ہے شامل میرا

اداول کا عاشق کے خونِ تن سے رنگین نظر آنا بالکل لکھنوی قسم کا شاعرانہ ادا ہے۔ علاوہ اس کے دوسرا نقص یہ ہے کہ اگر دوسرے مصرعہ میں اس کا اشارہ داستان کی طرف ہو (اور یقیناً یہی ہے) تو داستان میں خونِ تن شامل ہونا کیا معنی ؟ ذکر خونِ تن ہونا چاہئے  
ایک اور شعر ہے :-

کس قدر پر کیفیت ہے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا

اصل نغمہ ایک آوازِ شکست ساز ہے

پہلے مصرعہ میں جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کا ثبوت دوسرے مصرعہ میں مفقود ہے۔ تا وقتیکہ شکست ساز کی آواز کو اصل نغمہ نہ ثابت کر دیا جائے، ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کو پر کیفیت نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر دوسرے مصرعہ کا ثبوت پہلے مصرعہ میں ہے تو ان کی ترتیب بدلنی چاہئے تھی

الغرض اس قسم کی غلطیاں جا بجا اصغر کے کلام میں پائی جاتی ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے شاعر ہونے سے انکار کر دیا جائے۔ بعض بعض شعروہ قیامت کے کچھ گئے ہیں مثلاً

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے

وہ ربطِ خاص بخش بجا کہیں ہے

میرے فغانِ رو بہ اس سروزناز کو

ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں ہے

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں رگِ رگ میں دوڑی بھرتی ہو نشتر لٹے ہوئے

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نشتر تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنادیا

مگر کوتاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو کھٹکتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

مگر چونکہ انتخاب کنندہ کا معیار انتخاب صحیح رنگِ تغزل سے ہٹا ہوا ہے اسلئے اس مجموعہ میں ایسے اشعار کم ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ خدمت کسی ایسے کے سپرد کی جاتی جو تصوف و حکمت اور اسرار و معارف کا دلدادہ تو نہ ہوتا۔ لیکن محبت کرنا جانتا اور محبت کی کیفیتیں اس پر گزری ہوتیں۔ یہ مجموعہ مہر میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

(ماہِ آئندہ ہم جگر کے سوشل پر اظہارِ رائے کریں گے)

# باب المراسلۃ والمناظرۃ

(جناب سید عبدالحکیم صاحب - گجرات)

میں بہت ابتداء سے رسالہ نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور ان تمام تفصیلات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں جو آہستہ آہستہ آپ کے مذہبی خیالات میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہر چند ایک قسم کی آواز دی تو آپ میں شروع ہی سے پائی جاتی ہے لیکن اب زیادہ شدت ہو گئی ہے، جس کا سبب میں معلوم کرنا چاہتا ہوں

(نگار) آپ کے مراسلہ کو اصولاً باب الاستفسار میں جگہ پانا چاہئے، لیکن صرف اس خیال سے کہ اس کا تعلق زیادہ تر میری ذات سے ہے۔ اور جواب میں کسی خاص علمی یا ادبی مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں، باب المراسلہ میں درج کرتا ہوں آپ کا یہ خیال یا نتیجہ مطالعہ بالکل صحیح ہے کہ میرے مذہبی خیالات میں رفتہ رفتہ تغیر پیدا ہوا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اب اس تغیر نے ایسی کھلی ہوئی علیحدہ صورت اختیار کر لی ہے کہ بعض حضرات اس کو کفر و ارتداد سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ لیکن آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ ابتداء اجراء نگار سے تا ابد ہم کبھی ایک لمحہ بھی غم پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اپنے خیال کے مطابق حق و صداقت سے دیدہ و دانستہ ابا کیا ہو یا میری نیت خدمت اسلام کے علاوہ کچھ اور رہی ہو۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ پہلے میں اسلام کے مفہوم کو زیادہ محدود سمجھتا تھا۔ اور قدرے متعصب تھا، لیکن اب اس کو زیادہ وسیع سمجھتا ہوں اور کیش و مسلک کے امتیاز سے گزر گیا ہوں

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ نہ مابود

رفیق و صنم بر سر محراب شکستیم

اس میں شک نہیں کہ میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور نہایت سخت مذہبی ماحول میں میری تعلیم و تربیت ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کافی زمانہ اسی تعصب و تعصب میں بسر ہوا جس پر آج بھی ہر جہتی

فکر کر سکتا ہے، لیکن اب اس کو عقل و ضمیر کی رہنمائی کہنے یا طاغوتی کارفرمائی کہ مذاہب عالم کی تاریخ، حکومتوں کی داستان فتح و ظفر، اور اسی کے ساتھ طبیعیات و فلکیات کے مطالعہ نے ایک عجیب انقلاب ذہن میں پیدا کیا۔ اور سب سے پہلا حجاب دور ہونے کے بعد جو منزل سامنے آئی وہ ”ماعتنا الحق معرقتنا“ کی تھی پچھلے میں یقین رکھتا تھا کہ خدا ایک مستبد و جبار رستی ہے جو سوائے مسلمانوں کے کسی اور کو نجات دینے والی نہیں، وہ ہمارے دنیاوی سلاطین ہی کی طرح ایک قربانی قوت ہے جو سزا و عطا کے لحاظ سے مسئول نہیں ہو سکتی اور جو ہماری عبادت سے (بشرطاً) ایک اسلامی طریقہ سے ادا کی جائے خوش ہوتی ہے اور ترک عبادت سے برہم — لیکن جوں جوں کائنات کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا، علم و عقل کی نارسائیاں واضح ہونے لگیں اور مسلمانوں کی اس تنگ ذہنیت کو رفتہ رفتہ میں خدا کی توہین سمجھنے لگا۔ یقیناً دیگر مذاہب بھی اس عصیت میں مبتلا ہیں لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم از کم اسلام کو میں اس داغ سے پاک دیکھنا چاہتا تھا۔ اور آخر کار اس احساس کی شدت نے میرے ضمیر اور میرے علم و یقین کو جس اقدام کی طرف مجبور کیا وہ یہ تھا کہ

بیا کہ روئے بہ محراب گاہ نور نیمم بنائے کعبہ دیگر سنگ طور نیمم

حطیم کعبہ شکست اس قبلہ بریخت بتازہ طرح یکے قصر بے قصور نیمم

پھر یہ ”کعبہ دیگر“ کیا تھا۔ یہ ”قصر بقصور“ کیا ہو سکتا تھا؟ یہی تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑنا، تفریق شعاہ و رسوم کی خلیج کو بڑ کر دینا اور ایک ایسی بلند چوٹی پر اسلام کا جھنڈا نصب کرنا جس سے زیادہ رفعت کسی اور مذہب کے پرچم کو میسر نہ آ سکے — پھر جو فکر میں اسلام کو اس کی حقیقت کے لحاظ سے اخلاق کی دنیا میں ایک آخری آواز دیکھتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ اسلام نام مخصوص وضع و شکل بنائے کا نہیں ہے، چند متعین حرکات کی پابندی کا نہیں ہے بلکہ وہ مسخ ہے ارتقاء و نوع انسانی کا، عروج فضل و کمال کا، اور اخلاق کی انتہائی رفعت کا اس لئے میں مجبور تھا کہ موجودہ مذہبات مذہبی اور مفروضات دینی کی تنگ و تاریک فضا سے بلند ہو کر کوئی نصب العین ڈھونڈتا۔ اور شکر ہے کہ میری عقل نے اس باب میں میری رہبری کی اور جوں جوں حجابات دور ہوتے گئے۔ میری آواز میں بلندی، میرے عزائم میں سختی اور میرے مسلک میں وسعت پیدا ہوتی گئی، سچے کہ آج خدا میری نزدیک نام ہے ایک ایسی قوت غیر متاثرہ کا جو کافر و مسلمان کی بے معنی اصطلاحوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، جو مسجد و کلیسہ کا شکی و کعبہ، اذان و ناقوس، طوات اور سیکریاں سب سے بے نیاز ہے۔ اور وہ انعام و انتقام، جزا و سزا کو سمجھی ہی سے اسلئے متعلق نہیں کرتا کہ فلاں اُسے۔ اللہ کے نام سے پکارنا ہے اور فلاں رآم کے نام سے، یا وہ مندر میں گھنٹہ بجا کر اس کی یاد کرنا ہے یا یہ کان میں اونٹنگی دے کر اذان کی آواز سے اُسے پکارنا ہے — وہ اگر خدا ہے تو سب کا خدا ہے۔ اور اس نے ہر شخص کی جود و سزا، ہر قوم کی دوزخ و جنت خود اسی شخص یا قوم کے اندر پنہاں رکھ دی ہے خواہ

وہ اسے اختیار کرے یا اُسے

پھر جو شخص تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانا چاہتا ہو اور جو صرف صحت اخلاق کو غرض مشترک قرار دے کر دُنیا سے مصیبت کو منادینا پسند کرتا ہو، اس کے خیالات و عقاید میں اگر آپ یہ تغیر محسوس کریں تو جائے عجب نہیں اور پھر یہ منزل تو ابھی صرف قیل و قال اور حجت و استدلال کی ہے، کسے فہرے کہ کل اگر میں اس منزل سے بھی گزر کر صرف خاموش علی کی منزل میں آگیا تو میرے مُنہ سے کیا نکلے گا، اور آج جو صرف کافر و مردہ کلمہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ کل مجھے دیوانہ و مجنون جان کر پتھر نہ ماریں گے

اجد الملامۃ فی حوائک لذینۃ

حبالذکرک فلیعلمی اللوم

## شہوانیات

حضرت نیاز کے قلم سے

## ترغیبات جنسی

جسمیں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ کے مجلد کتاب صرف ۸ میں اور غیر مجلد ۸ میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۸ میں غیر مجلد ۸ میں علاوہ محصول ۸ کے ملے گی

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے۔ حجم ۳۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی

صرحت ضروری ہے

نیچر نگار لکھنؤ

# باب الاستفسار

اب محمد عبداللہ خاں صاحب۔ کراچی)

## بیدل کے چند اشعار

تکلیف تو ہوگی لیکن براہ کرم بیدل کے حسب ذیل اشعار کا مطلب واضح طور پر بیان فرمادیجئے، چونکہ آپ نے اکثر و بیشتر بیدل کا ذکر کیا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے بہتر اس خدمت کو کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔ وہ اشعار یہ ہیں: —  
 یہ کہ ام فرصت ازیں چین ہوس از فضولی از کشتہ شپ غوں بمر خضر زخم کہ نفس شراب بحر زند

شکست زان چشم فتنہ امل غبار مکان بال بکل مباح زان سوں سرمہ غافل ہنوز دلتے ست برنگش

یہ کہ ام آئینہ مالمی کہ ز فرصت اینمہ عن فلی تو نگاہ دیدہ بسملی مزہ واکن وہ کفن در آ

ہمہ عشر با تو قدح ز درم و ز رفت بچ خاں ا چہ قیاسی کہ مئی رسی ز کنار بابہ کتا و ما

نگار) میں بیدل کا شمار ان شعرا میں کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان کے کلام مفہوم سمجھنے سے عاری ہو تو اسے غنائے کی کوشش نہ کرنا چاہئے، کیونکہ شعر کا لطف صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب بغیر وساطت توضیح و تفسیر کے وجدانی طور پر ذہن نشین ہو جائے۔ پھر چونکہ ہر شخص کا ذوق ایک مخصوص دائرہ کے اندر کام کرتا ہے،



اس لئے جب اس دائرہ سے ہٹ کر کوئی چیز اس کے سامنے آتی ہے تو اس کا ذہن متوشش ہو جاتا ہے اور اگر کسی کے سمجھنے سے مفہوم سمجھ میں آ بھی گیا تو وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو از خود سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے

بیدل کو شاعر کہا جائے یا نہ کہا جائے، مجھے تو اس میں بھی تامل ہے کیونکہ اس کی تخلیق اس درجہ نازک ہے کہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والے بھی بعض اوقات اس کی نزاکت تک نہیں پہنچ سکتے

بیدل ایک مجذوب ہے شاعر نہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے شاعری کے نقطہ نظر سے دیکھنا غلطی ہے بلکہ ایک رند ذولیدہ، مگر، ایک سرسبز ازادہ جنوں کی حیثیت سے اس کے آواز کو سننا چاہئے

جو اشعار آپ نے لکھے ہیں میں اپنی فہم و فراست کے مطابق ان کا مفہوم تو بیان کے دیتا ہوں لیکن جاننا ہوں کہ وہ لطف جو انہیں تفصیل و تشریح کے یوں حاصل ہونا چاہئے۔ وہ آپ کو حاصل نہ ہوگا۔ میں یہاں صرف مفہوم ظاہر کر دوں گا تعبیرات شاعرانہ کو آپ اس کے مطابق کر لیجئے گا

(۱) پہلے شعر میں اس کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کارگاہ عالم میں انسانی تنگ و ود کی ہوس رانی حد درجہ حماقت ہے کیونکہ انسان تو یہاں کوئی فرصت لے کر آتی نہیں اور بڑی سی بڑی فرصت و مصلحت بھی حد درجہ مختصر ہے

پہلا مصرعہ :-

اتنی فرصت کہاں کہ اس چین بادنیایں ہماری ہوس کوئی نتیجہ پیدا کر سکے

دوسرا مصرعہ :-

کیونکہ اس تنگی فرصت کا یہ عالم ہے کہ عمر حشر مل جائے تو بھی وہ اس سے زیادہ کام نہیں دے سکتی کہ یہ مشکل ہم

شام کو سحر کر سکیں

(۲) محبوب کی چشم فتنہ پر واز کا یہ اثر ہے کہ بال بسمل سے غبارِ امکان ٹوٹ گیا یعنی بسمل تڑپ کر مر گیا۔ اس لئے اس وقت سے غافل نہ ہو جب اُن آنکھوں میں سرمہ بھی لگ جائے کہ اس وقت تو خدا جانے وہ اور کیا قیامت ڈھائیں گی سرمہ کے متعلق یہ کہنا کہ ”سنو زد سے ست زیر سنگش“ صرف اس لحاظ سے ہے کہ طیار ہونے سے قبل وہ

کھل میں پیسا جاتا ہے

(۳) تو کس تماشہ میں مصروف ہے، کس آئینہ کے سامنے اپنی زیبائش و آرایش میں لگا ہوا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی فرصت تجھے ملی ہے وہ دیدہ بسمل کی آخری نگاہ سے زاید نہیں اس لئے آٹھ کھول اور کفن کے اندر آ جا کہ تیری فرصت کا اقتضاء اس سے زاید نہیں

(۴) یہ شعر صاف ہے۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ عاشق کی تمنائیں وصل محبوب کے باب میں اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ کبھی پوری ہوا ہی نہیں سکتیں۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر وہ محبوب سے کہتا ہے کہ ”ایک عمر گزر گئی تیرے

ساتھ بادہ خواری میں مصروف ہوں۔ لیکن غارِ محرومی اب تک نہیں گیا، خدا کے لئے بتایہ کیا قیامت ہے کہ باوجود پہلو سے مستقل رہنے کے بھی میرے پہلو سے جدا ہے، باوجود آغوش میں رہنے کے آغوش سے علیحدہ ہے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

# جماستان

نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۱۰۰ صفحات  
قیمت فی کاپی جلد للبر ————— غیر جلد للعم ————— علاوہ محصول

خریدارانِ نگار سے ————— ایک روپیہ کی رعایت

فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

دنیا کا اولین بُت ساز	فریب خیال	صدائے شکست	دو گھنٹے جہنم میں
ایک شاعر کی محبت	میر بیداد	تاجِ عرب کی ایک روایت جمیل	ایضار
شہید آزادی	بعد المشرقین	ولم یخیر کوخت	ٹیلی فون نکلا
دو خطا	جاں عالم اور ملک مہر نگار	چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	شہنشاہِ کاکڑ گاہر میں
سردائے خام	درسِ محبت	ازدواجِ مکرر	انتظام علی صاحب
شہر کا ایک صوتی	ایک شاعر کا انجام	آدم و حوا سے پہلے	شہزادہ خرم اور ابابیل
زہرہ کا ایک پجاری	رادھا	سرزمینِ کن کی ایک لنوا ز شام	نوجوان شہزادہ
مطربہ فلک	چنگاری	محلہ کی رونق	داستانِ حسن و عشق کا ورقِ نوین

منیجر نگار لکھنؤ

# کسان

دے نہ گردِ سرسِ تیش، خورشید کی تابندگی ظلمتوں میں ڈوب کر رہ جائے بنفِ زندگی  
گر نہ ہو محوِ تبسم، ماہِ تاباں کا جمال نرم رُو موجوں کو حاصل ہو نہ طوفاں کا جلال  
گر نہ گرمِ سیر ہو، صحنِ گلستاں میں نسیم حشر تک سوتی رہے غنچے کے سینے میں شمیم  
گر ہوا میں ابر تر قطروں کا پھیلائے نہ جال ہو نہ دُنیا میں پرافشاں طائرِ حُسن و جمال

یوں ہی گردِ ہفتاں رہے سہی و عمل سے یخچر  
زندگی کی موجِ رقصاں ہو نہ سطحِ خاک پر

کس قدر اس بے نوا، دہقان کی سیرت عجیب خود مر لیغِ مضطرب اور دردِ عالم کا طبیب  
اس کے عالم میں نہیں جنگِ یقین و احتمال خال و خد سے ہے عیاں صدیوں کی محنت کا جلال  
کوہ کے مانند ہے اس کے ارادوں کا ثبات ہے اسی کے دوش پر صدیوں سے بارِ کائنات  
مطمئن اپنی موش پر، محوِ آئینِ تدبیر اس کے سینے میں نہیں ہنگامہ اُمید و بیم  
بیل ہے، یہ ہے زمین ہے، اور خیالِ کشت و کشت جھونپڑ ہے قصر اس کا، کھیت ہو اس کی بہشت  
آگ برے چرچ سے ٹرک جائے یا بنفِ حیات اس کی دنیا میں نہیں پروائے سیلِ حادثات  
کھیل ہے اس کے لے ہر شور و شہسِ بہشت شکن شیر کا انداز، طوفاں کی طرح ہیبت منگن  
بازوؤں میں آندھیوں کا زور، لوہے کا بکر حوصلہ بیباک، دل بے خوف، بے پروا نظر

زندگی کا راز دنیا کو بتا دیتا ہے یہ

محنتِ صبرِ آزما پر مسکرا دیتا ہے یہ

ہے مگر اس کاوش سنی و عمل کا یہ مال اس سے بڑھ کر کون ہوگا، بد نصیب و خیر حال  
باوجود ہمت آزاد و عزم استوار اس سے بڑھ کر کون ہوگا، دردمند و لفکار

.....  
قصر دولت کی ستم رانی سے تھرا ہوا زخم دار بے کسی، دنیا کا غمگرا یا ہوا  
اس کی نظروں میں نہیں تہذیب دانش کا جلال اس کی آنکھوں سے نہاں ہو، عشرت بزم جلال  
اس قدر نا آشنا، یعنی سمجھتا ہی نہیں اس کے دل میں زندگانی کی تمنا ہی نہیں  
یہ رہیں صد محن کیا جائے کیا ہے زندگی شام کا حسین لطافت، صبح کی تابندگی  
روح کو کیونکو جگا دیتا ہے اک رنگیں گلاب کس طرح ننوں سے چونک اٹھتا ہو احساس  
زندگی کا راز حسن و نغمہ اصبا میں ہے

فصل و بارش کے سوا کچھ اور بھی دنیا میں ہے

ہے اس احساس الم پرور کا آخر کیا سبب؟ کس نے اسکی روح کو رکھا ہے پابند تعب؟  
کیوں ہے یہ اب تک رہیں جتوئے نامام؟ کس نے اس کی سیر کا ہوں میں بچھا رکھے ہیں ام؟  
کون اس کی فکر کو دیتا ہے درس نارسا؟ کس کے اطمینان کا ساماں ہو اسکی بے کسی؟  
اس کی نا پرسی ہو کس کی خود سری کا مدعا؟ کیوں سرد و نور سے محروم ہے اس کی فضا؟  
چھیرتا ہے ذرہ ذرہ گو سرد و مرد ماہ؟ بن گئی ہے اسکی ہستی کیوں سراپا اشک و آہ؟  
غرق آسائش ہے دنیا کی بہشت مختصر یہ مگر ان سردی جلودں سے ہے کیوں بخیر؟  
کس نے اس ظلم فراواں کا کیل ہے بند و بست؟

دے رہا ہے کون اس کے عزم کو نیم شکست؟

کیا یہ ممکن ہے، کہ ہو یہ مرضی پروردگار کیونچھ اُس کے حکم پر ہے زندگانی کا مدار  
جس کی صناعتی نے کی تشکیں ماہ و آفتاب اک پے فکر و عمل اور ایک بہر درس خراب

راستے پیدا کئے ان کے گزرنے کے لئے اپنے محوروں پر رقص کرنے کے لئے  
عقل انسانی پہ کھولے جس نے اسرارِ حیات مختلف جلووں سے کی معمور بزمِ کائنات  
جس نے کی اس خاک کی چٹکی کو وہ رفعت عطا کھل گئی اس کی نگاہوں پر ستاروں کی صفائ  
جس نے اس مجبور کو بخشا وہ عزمِ فتمند بڑھ گئی اوجِ فلک سے اس کی پرواز بلند  
نسلِ انسانی پہ اتنا ظلم ایسا قتل عام  
حیف ہے گر ہو یہ دُنیا کے خدا کا اہتمام!

اس سے بڑھ کر کوئی صورت اور کیا ہوگی سبب نوعِ انسانی کی تخریب و تباہی کی نقیب  
اس سے بڑھ کر اور کیا درد آفریں ہوگی فغاں جس کے سینے پر ہو قادر گوشِ ابلالے زماں  
اور کیا ہوگا بپا ہنگامہ روزِ مصاف ظلم و حرص و آرز کی سفاک دُنیا کے خلاف  
اور کیا ہوگی حیاتِ نوعِ انسانی تباہ اور کیا دیکھے گی دُنیا ظلمتِ روزِ سیاہ  
لطفِ پیہم کے ارادوں سے گزر سکتا نہیں

خالقِ ارض و سما یہ ظلم کر سکتا نہیں  
ہل چکی ایوانِ دولت کی بنائے استوار ہوشیار اب اے خدا دندِ اِن گیتی ہوشیار  
ناز ہے جس پر تھیں ہے یہ وہی جنسِ گراں بیکسوں کے اشک، مزدوروں کی آؤناؤں!  
یوں ہی ہوتا ہے، سپاسِ منتِ یزدانِ پاک سردی جلوں سے کی معمور جس نے سطحِ خاک  
خواہشوں کی رومیں اتنا جبر، یہ قہر و عذاب کیا یہی ہے بے شمار اکرامِ فطرت کا جواب  
آندھیوں میں ظلم کی پہنائے گیتی ہے تباہ ظلم ایسا، جس کی بے اندازہ صدیاں ہیں گواہ  
کر رہا ہے برق کی تعمیرِ فطرت کا جلال

یہ تباؤ تم نے سوچا ہے کبھی اس کا آل  
ہاں یہی دہقان، یہی بیگانہ، علم و شعور جس کو ٹھکرا کر تمہیں ملتی ہے تسکینِ غرور

جس کی محرومی سے پاتی ہے خداوندی غذا جس کے دل پر ہے تمھارے تھیر نخوت کی پنا  
جس کی بربادی سے ہے بزمِ طرب کا اتمام خون سے جس کے درخشاں ہیں تمھارے صبح و شام  
جس سے پھینا تم نے احساسِ حیات کا نگار عشق توں کا ناز، عقل و علم و دانش کا وقار  
محرمِ انوار آسائش نہیں جس کی جیسیں جس کو آزادی سے جیسے کا بھی حق حاصل نہیں  
جو حزیں اب تک اسیرِ ہستی موہوم ہے جس کی دنیا سرمدی انوار سے محروم ہے  
کچھ خبر ہے رنگِ ہستی کیا سے کیا ہو جائے گا جب داغ اس کا حقیقت آشنا ہو جائیگا  
جب بغاوت کی انھیں گی خشر پر در آندھیاں جب یہ لے گا اس جاں کے جوصلے کا امتحان  
ہوش میں آئیگا جب مدت کی مدہوشی کے بعد جب زباں کھولے گا یہ صدیوں کی خاموشی کے بعد  
کون رو کے گا وہ جوشِ قمر و طوفانِ عتاب کون دے گا اس کے پر ہیبت سوالوں کا جواب  
کس کے بازو میں ہے یہ طاقت کہ رو کے اسکے دار کس کی ہمت کو یہ قدرت ہو کہ ہو اس سے دوچار  
ٹھوکریں کھاتی پھرے گی سطوتِ جاہ و جلال موجِ ظلمت بن کے رہ جائیں گے اجڑائے جمال  
عظمتوں کا قصر آنسو کی طرح بہ جائے گا دولتوں کا ناز اپنے حال پر شہِ مائے گا  
صبح اُن کے حق میں ہوگی نوحہ و ماتم کی شب زندگی کا حق جنھوں نے اس سے پھینا ہے سبب  
چاہتے ہو گر کہ دنیا ہو نہ برباد و زبوں انتقام اس کا نہ ہو غارت گراں و سکوں  
اس سے پہلے جب کہ یہ اسخِ اب سے پیدا ہو اور اس کے قمر کی تلوار، آتشِ بار ہو  
جبکہ اس کے دل میں ہو پیمینِ جوشِ انتقام اور لمپنی پی کے ہو دیوِ بغاوت شاد کام  
ٹھکوس کی فکر "استمرار" کرنا چاہئے  
اور اپنے جرم کا استمرار کرنا چاہئے

علی اختر (حیدر آباد رکن)

# معلومات

**بعض مجیر العقول تماشوں کی حقیقت** | آج کل بعض فقرا ایسے دہشت ناک تماشے دکھاتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے دراصل ایک حقیقتاً وہ کچھ نہیں ہوتے۔ مثلاً نوکدار کیلوں ننگی تلواروں پر لیٹ جانا۔ سینہ پر پتھر رکھوا کر توڑوانا، کلچ کے ٹکڑوں پر برہنہ چلنا، ننگے بدن آگ سے گزر جانا، منہ میں انگارہ لے لینا، گھنٹوں تک زمین میں دفن رہنا۔ یہ تمام باتیں بہت معمولی ہیں اور ان میں کوئی معجزہ درکراست نہیں ہے

مثلاً نوکدار کیلوں پر لیٹنے کی حقیقت کو ملاحظہ کیجئے کہ ہر شخص بغیر کسی مشق کے کر سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کا ثقل تمام کیلوں پر تقسیم ہو جاتا ہے اور جتنا وزن ایک کیل کے اندر پوست ہونے کے لئے ضروری ہے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ عام طور پر وہ تختہ جس پر لوگ لیٹتے ہیں کم از کم ۵-۶ ہزار کیلیں رکھتا ہے اور جس وقت انسان کے وزن کو ان کیلوں پر تقسیم کیا جائے گا تو مشکل سے ۱۰ رتی فی کیل کا اوسط پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اتنے وزن سے ایک کیل جسم کے اندر پوست نہیں ہو سکتی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ دو تلواروں پر لیٹ کر سو جاتے ہیں اور ان کے سینے پر پتھر رکھ کر توڑا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے جسم و اعصاب کو سخت کر کے لیٹ جاتا ہے اور لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اس پر سحر مرم کا عمل کیا گیا۔ پھر دو تلواریں دو آہنی ڈھانچوں پر رکھ کر اُسے تلواروں پر لٹا دیتے ہیں۔ جو تیز نہیں ہوتیں۔ اس کے بعد سینہ پر پتھر رکھ کر توڑتے ہیں۔ اس کا از صرف یہ ہے کہ جسم کے اُس حصہ کے پنجے جہاں پتھر رکھا جاتا ہے خلا ہوتا ہے اور اس لئے جب ضرب لگائی جاتی ہے تو اس کا از صرف اُن آہنی ڈھانچوں پر پڑتا ہے۔ جن پر تلواریں رکھی ہوئی ہیں اور جسم متاثر نہیں ہوتا۔ اس کا تجربہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ پتھر کا کوئی ٹکڑا آپ ہاتھ میں لیں اور اُسے ہتھوڑی سے ٹوڑیں تو پتھر ٹوٹ جائے گا۔ اور ہاتھ میں ضرب نہ آئے گی، لیکن اگر آپ کا ہاتھ زمین پر ہوگا تو مخرج ہو جائے گا

کلچ کے ٹکڑوں پر چلنے کی حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ ٹکڑے تیز نوکدار نہیں ہوتے اور اُن کی دھار کرڈ پتھر سے ملدی جاتی ہے۔ اُگ پر چلنے یا اُگ منہ میں رکھ لینے کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے پھٹکری کا پانی اور گندھک کا تیزاب ملا کر

جسم پر لیٹے ہیں اس سے یہ ہوتا ہے کہ آگ کا اثر فوراً نہیں ہوتا اور ایک شخص تیزی سے آگ پر دوڑ سکتا ہے زندہ دفن ہو جانے کی اصلیت یہ ہے کہ جس تابوت میں لٹا کر دفن کرتے ہیں وہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کی کھجین ۶۔ گھنٹہ تک انسان کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ احتیاطاً اس کے منہ، ناک اور کان پر روئی رکھ دیتے ہیں تاکہ تنفس آہستہ آہستہ ہو اور آکسیجن کی موجودہ مقدار زیادہ دیر تک کام دے سکے

**لاشوں کا تبادلہ** جرمنی کی ایک ضعیف عورت ڈرسڈین سے وینا سفر کر رہی تھی۔ جب ریل زیکو سلوویکیا کے حدود میں پہنچی تو وہ بیمار ہو گئی اور وہیں کسی شفا خانہ میں داخل کر دی گئی۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ مر گئی تو اس کے خاندان والوں کو ذریعہ نادر اس کے مرنے کے اطلاع دیدی گئی۔ جب چار دن کے بعد اس کا تابوت جرمنی میں پہنچا۔ اور اُسے کھولا گیا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ تابوت کے اندر بجائے ضعیف عورت کے ایک اطالوی فوجی افسر کی لاشیں وردی کے ساتھ نظر آئی

یہاں سے فوراً تار بھیجا گیا کہ "تابوت میں اطالوی افسر کی لاش ملی ہے، بڑھیا کی لاش کہاں گئی" وہاں سے جواب آیا۔ "اس غلطی پر سخت اندوس ہے۔" بڑھیا کی لاش بولون چلی گئی۔ "لوگوں نے بولون تار دیا۔ وہاں سے یہ جواب ملا کہ "یہاں تو وہ لاشیں دفن کر دی گئی۔ اور تمام انھیں فوجی مراجم اعزاز کے ساتھ جو ایک افسر کے لئے محل میں لائے جاتے ہیں۔ اور قبر پر فوجی نشان وغیرہ بھی نصب کر دیے گئے، اس لئے ہمارے فوجی افسر کو بڑھیا سمجھ کر وہیں دفن کر دیجئے" بولون میں آج بھی بڑھیا کی قبر موجود ہے اور جب فوج اُس طرف سے گزرتی ہے تو اسی طرح سلامی دیتی ہے جیسے کسی فوجی افسر کی قبر کے سامنے دی جاتی ہے

**حُسن و ذکاوت کی جنگ** ذہانت و جہال کے درمیان ایک زانہ سے جنگ جاری ہے۔ بعض لوگ حسین عورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی غبی کیوں نہ ہو۔ اور بعض اس کے برعکس صرف ذہانت و ذکاوت کو پسند کرتے ہیں

شکاگو کی یونیورسٹی (دی پول) کا معمول ہے کہ وہ ہر سال اپنی رپورٹ کے ساتھ جمیل ترین طالبات کی تصویریں بھی شائع کرتی ہے۔ سلسلہ ۶ میں جو رپورٹ شائع ہوئی وہ اس قاعدہ کے خلاف تھی۔ یعنی اس میں بجائے جمیل طالبات کے ذہنی لڑکیوں کی تصویریں شائع کی گئیں۔ اس بدوہاں کے طلبہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور اس اختلاف نے اس جنگ طوالت اختیار کی کہ آخر کار یہ تجویز قرار پائی کہ آئندہ سے بائیں حسین لڑکیوں کی اور بائیں طالبات کی تصویریں دی جائیں

**تخفیفِ اسلحہ کی حقیقت** گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد تمام ممالک کا ارجحان اس طرف ہے کہ اسلحہ کو کم کیا جائے اور سامانِ حرب کو رفتہ رفتہ معفود کر دیا جائے کہ دُنیا کا آئندہ امن سکون



اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس امر پر تمام حکومتوں نے اتفاق کر کے باہمی معاہدہ بھی کر لیا۔ لیکن اس عہد پیمانہ کا عملی نتیجہ کیا ہوا۔ وہ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا :-

سکند ۶ سے سکند ۷ کے اخیر تک ————— برطانیہ نے ۲۳،۰۰۰ گنی آلات حرب پر صرف کیس،  
فرانس نے جنگی جہازوں کی تیاری میں ۵۰۰۰۰ گنی صرف کیس  
اطالیہ نے فوجی طیاروں میں ۱۲۵،۰۰۰ گنی خرچ کیس  
امریکہ نے ۳۶،۰۰۰ گنی اور جاپان نے ۱۱،۰۰۰

برطانیہ کے تمام فوجی مصارف سکند ۶ میں وہی رہے جو سکند ۶ میں تھے، فرانس میں ۲۰۸،۰۰۰ کا اضافہ ہو گیا۔ اور اطالیہ میں ۱۵۴،۰۰۰ کا۔ اسی طرح امریکہ نے ۱۵۶،۰۰۰ گنی زیادہ صرف کیس

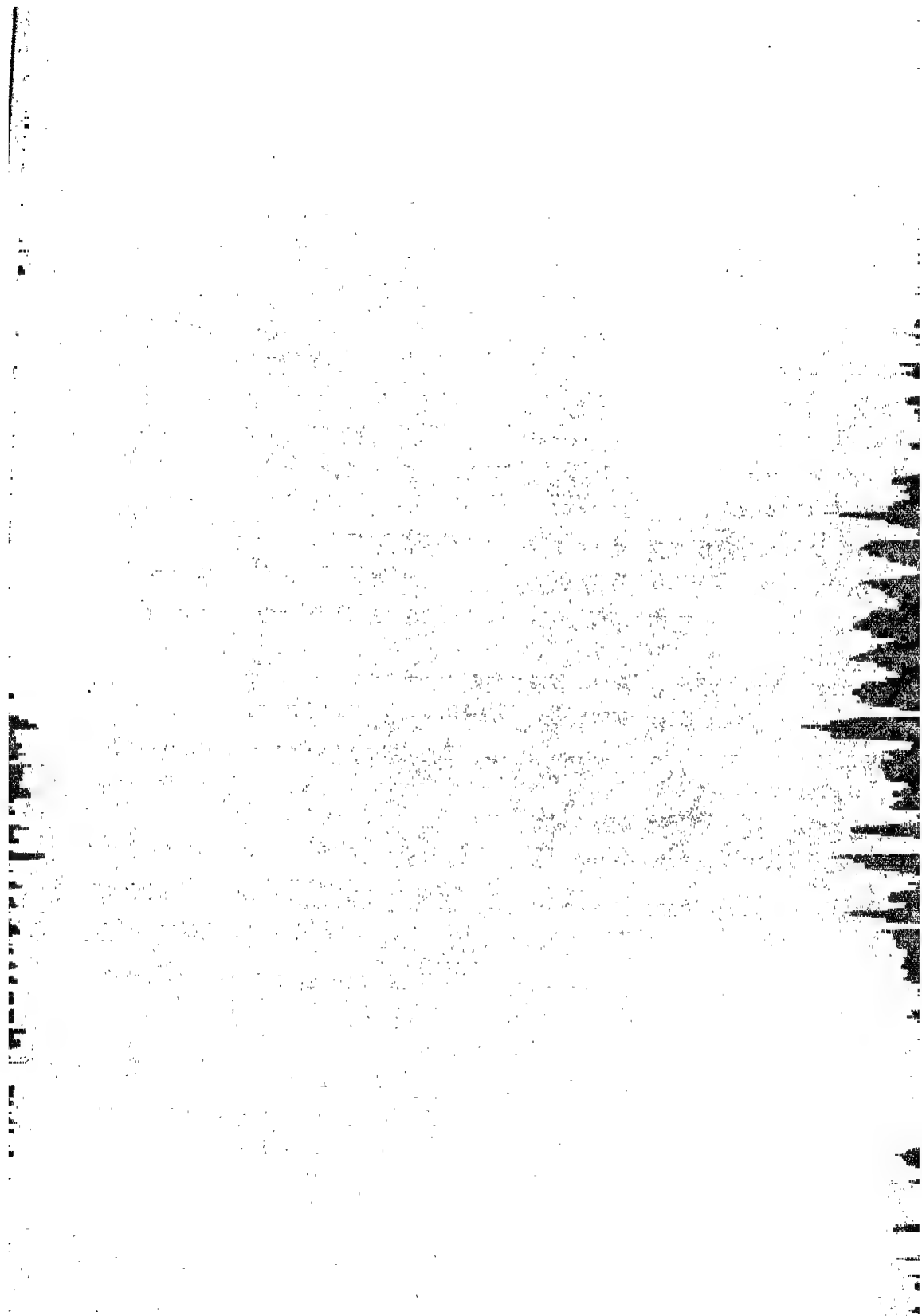
دینا میں ایک شخص ڈاکٹر اکوٹو موہے۔ اس نے ایک عجائب گھر صرف انسانی دماغوں کے لئے قائم کیا ہے۔ اور بڑے بڑے علماء، فیلسوف، شعراء، ادباء، اور سیاسی رہنماؤں کے دماغ شیشے کے ظرف میں نہایت اہتمام سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہر شیشہ پر وہ اس شخص کا نام، اور دماغ کا وزن وغیرہ بھی درج کر دیتا ہے۔ اس وقت تک کثیر تعداد میں اس نے "دماغ" جمع کر لئے ہیں اور دنیا کے تمام مشاہیر سے وہ اس باب میں خط و کتابت کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کی بابت اس کو دے جانے کی وصیت کر جائیں

جرمنی کے ایک رسالہ نے نہایت بسیط بحث کی ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ اس نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اس کا بیان ہے کہ چھڑی لے کر انسان کا چلنا اس کی صحت کے لئے مضر ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو اس کا استعمال نہیں کرتے عموماً زیادہ فرخ سینے، بھرے ہوئے بازو اور مضبوط ہاتھ رکھتے ہیں

اس کا خیال ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے عہد وحشت کی یادگار ہے جب اُسے سنگلخ زمین پر کھڑی صحراؤں میں چلنا پڑتا تھا اور سہارے کی ضرورت تھی۔ اب اس کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کا استعمال انسان کو سہارا لینے کا عادی بنا دیتا ہے جو اچھٹا کے نشوونما کے منافی آ

مجموعہ استفسار جواب۔ زیر کتابت ہے اور دو تین ماہ کے اندر شائع ہو جائے گا۔ اگر آپ چاہیں تو رہایت سے فائدہ اٹھانے کے لئے اب بھی ڈیرھ روپیہ دیکر، بھیج سکتے ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ





خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

ناول: ٹورے اور افسانے

تاج و براجمال

## نکات و ادب

۱۲	تقریرات اشک	۱۲	سویلی	۱۲	تاریخ مغرب	۱۲	بازاری زبان
۱۳	چند نامة	۱۳	درداع ظفر	۱۳	تقریر تاریخ اسلامی	۱۳	نجات سعیدی
۱۴	بس کار و کم	۱۴	پاسین شام	۱۴	مجموعه ۹	۱۴	نجات کشوری
۱۵	فساد سعید	۱۵	طوفان اشک	۱۵	مجموعه ۱۰	۱۵	تجلیه تحقیق مجلد
۱۶	خون آلودگی	۱۶	شاهین دوراج	۱۶	مجموعه ۱۱	۱۶	سیر اللغات فارسی
۱۷	سیلاب شکست	۱۷	درس عشق	۱۷	الصالحات	۱۷	معارف نسوان
۱۸	بے زبان دوست	۱۸	گردن پی چرخ	۱۸	امت کی ایمیں	۱۸	جوہر اللغات
۱۹	جمال ہم نشین	۱۹	تین بندوق باز	۱۹	الزہراء	۱۹	گوهر اللغات
۲۰	تغیر عصمت	۲۰	کرخو قایت	۲۰	اسوہ حسنہ	۲۰	پیرایہ سخن
۲۱	چرخ قدامت	۲۱	انقلاب قسطنطنیہ	۲۱	بند و شعر	۲۱	دعویٰ منت
۲۲	نایاب پیشی	۲۲	شاد بدعنا	۲۲	شونہار	۲۲	جوہر اللغات
۲۳	پراسرار فن	۲۳	دربار کی سرگزشت	۲۳	سوانح اکبر الہ آبادی	۲۳	عزیز اللغات
۲۴	اعلان آزادی	۲۴	شکوہ محبت	۲۴	سفر نامہ حجاز	۲۴	اندک و بزرگی
۲۵	سرگزشت اجروہ	۲۵	نسوانی زندگی	۲۵	تاریخ آفاقہ	۲۵	تاریخ اردو و قدیم
۲۶	نودہ زندگی	۲۶	ولایت تھی	۲۶	سلام ادب و مسلم	۲۶	دین میں اردو
۲۷	قلب حزن	۲۷	مضامین خاص	۲۷	سیرت سفینہ	۲۷	تغیہ کلام ہندی
۲۸	عروس گرجا	۲۸	شب زندگی کامل	۲۸	تاریخ اسلام جدید	۲۸	رباعیات و غزلیات
۲۹	شبید مغرب	۲۹	مودودہ	۲۹	خبر اللغات	۲۹	تغیہ کلام ہندی
۳۰	ماہ نمبر	۳۰	چندر کل	۳۰	اخبار الامم و جدید	۳۰	اردو کے سائنس دان
۳۱	شیخ مکمل	۳۱	گلستان خاتون	۳۱	خلافت مجددی	۳۱	توضیح و غلط
۳۲	حرب مغرب	۳۲	صبح زندگی	۳۲	خلافت مولرین	۳۲	مضامین اردو
۳۳	اشراق ساد و کامل	۳۳	شام زندگی	۳۳	عرب و اسلام مستقبل	۳۳	نور اللغات و جدید
۳۴	فرائض مادی	۳۴	تقریرات اشک	۳۴	سویلی	۳۴	بازاری زبان
۳۵	فسانہ نادر جہان	۳۵	درداع ظفر	۳۵	تقریر تاریخ اسلامی	۳۵	نجات سعیدی
۳۶	قبیل دوسن	۳۶	پاسین شام	۳۶	مجموعه ۹	۳۶	نجات کشوری
۳۷	حسن معاشرت	۳۷	طوفان اشک	۳۷	مجموعه ۱۰	۳۷	تجلیه تحقیق مجلد
۳۸	یابی	۳۸	شاهین دوراج	۳۸	مجموعه ۱۱	۳۸	سیر اللغات فارسی
۳۹	سورہ کبائیاں	۳۹	درس عشق	۳۹	الصالحات	۳۹	معارف نسوان
۴۰	سورہ کبائیاں	۴۰	گردن پی چرخ	۴۰	امت کی ایمیں	۴۰	جوہر اللغات
۴۱	سورہ فصیح	۴۱	تین بندوق باز	۴۱	الزہراء	۴۱	گوهر اللغات
۴۲	مرآۃ العروس	۴۲	کرخو قایت	۴۲	اسوہ حسنہ	۴۲	پیرایہ سخن
۴۳	نبأۃ النش	۴۳	انقلاب قسطنطنیہ	۴۳	بند و شعر	۴۳	دعویٰ منت
۴۴	توبۃ النصوح	۴۴	شاد بدعنا	۴۴	شونہار	۴۴	جوہر اللغات
۴۵	کبیر ظاہر	۴۵	دربار کی سرگزشت	۴۵	سوانح اکبر الہ آبادی	۴۵	عزیز اللغات
۴۶	شکر پیاں	۴۶	شکوہ محبت	۴۶	سفر نامہ حجاز	۴۶	اندک و بزرگی
۴۷	نصیحت کا گورنول	۴۷	نسوانی زندگی	۴۷	تاریخ آفاقہ	۴۷	تاریخ اردو و قدیم
۴۸	برکات سلطانی	۴۸	ولایت تھی	۴۸	سلام ادب و مسلم	۴۸	دین میں اردو
۴۹	ابن اوقت	۴۹	مضامین خاص	۴۹	سیرت سفینہ	۴۹	تغیہ کلام ہندی
۵۰	چندر بند	۵۰	شب زندگی کامل	۵۰	تاریخ اسلام جدید	۵۰	رباعیات و غزلیات
۵۱	تحقیق حکایات	۵۱	مودودہ	۵۱	خبر اللغات	۵۱	تغیہ کلام ہندی
۵۲	تندستی	۵۲	چندر کل	۵۲	اخبار الامم و جدید	۵۲	اردو کے سائنس دان
۵۳	حفظ صحت	۵۳	گلستان خاتون	۵۳	خلافت مجددی	۵۳	توضیح و غلط
۵۴	طبیب نسوان	۵۴	صبح زندگی	۵۴	خلافت مولرین	۵۴	مضامین اردو
۵۵	مہر رحمت	۵۵	شام زندگی	۵۵	عرب و اسلام مستقبل	۵۵	نور اللغات و جدید

## دواوین فارسی

دواوين اردو

۱۰	دیوان حسن تبریزی	۱۰	کلیات غالب	۱۰	دیوان غنی کفیری	۱۰	کلیات عظیم	۱۰	کلیات علی بن ابی طالب	۱۰	صنعتی عشق
۱۱	کلیات عراقی	۱۱	کلیات صائب	۱۱	دیوان طائی	۱۱	کلیات حسن	۱۱	کلیات علی بن ابی طالب	۱۱	دیوان داغ
۱۲	دیوان صادق	۱۲	دیوان ناصر علی	۱۲	دیوان خودی در سوز	۱۲	دیوان ناسخ	۱۲	کلیات علی بن ابی طالب	۱۲	کلیات ناصر علی
۱۳	دیوان پیدل	۱۳	کلیات سعدی	۱۳	دیوان نجم	۱۳	کلیات مبر	۱۳	کلیات علی بن ابی طالب	۱۳	دیوان شهبازی
۱۴	دیوان غفری	۱۴	کلیات حنین	۱۴	دیوان شمس	۱۴	کلیات سودا	۱۴	کلیات علی بن ابی طالب	۱۴	کلیات شهبازی
۱۵	کلیات جامی	۱۵	دیوان غفری	۱۵	کلیات محمد بن محمد	۱۵	کلیات انشا	۱۵	کلیات علی بن ابی طالب	۱۵	کلیات جامی

# ذیل کی کتابیں بنگالیک کتب خانہ سے طلب فرمائیے

## تذکرہ و تاریخ جاسوسی و ناول مرانی ناول سجاد حسین خان غفر علی لے ناول مشرق

بہارِ غنیمت	مشرک و دو	مرانی دیر	حق الہی	چروں کا کلب	چند بھادی
شب سوز	خاصہ پیرس	مرانی انیس کال	عاجی بھول	عجل بھری	عندرات
سراجِ منیر	سلیج علی	مرانی ضمیر	پیاری دنیا	پیرام کی گرتھادی	جیرا لے حق
پنچیر عالم	پیرام کی واپسی	مرانی موش	کاپٹ	ادب کی کتابیں	عزت حسین
ساقی حضرت رحلی	انقلابِ فرانس	مرانی دلگیر	پیشی جبری	انوار و مفرح	ایک خرمی
سید المرسلین	عربی قادی	عجائبِ غرائب	طرح درونڈی	مکوش و بان تاب	یام حب
عیدِ کرار	نورانی جاسوس		طلس فائوس	بزم خیال	نفس دہشی
سیرۃ الصدوق	نورانی جاسوس			شاطر سن	یوسف و دگر
عمر ابن خطاب	جنگِ طرابلس	عجائبِ غرائب		کتاب حسن ملک	زوالِ بھادی
ابو بکر صدیق	پیرام کی واپسی			مذکرۃ الشعراء	حسن کا ڈاکو
امام اسلام	نورانی جاسوس			مذکرۃ الشعراء	عیدِ حرام ہر
اکبب	نورانی جاسوس			مذکرۃ الشعراء	بنا بادیار
عمر بن عبد العزیز	عیدِ حرام ہر			مذکرۃ الشعراء	مقدس ناٹن
دولتِ فاروقیہ	عیدِ حرام ہر			مذکرۃ الشعراء	رودۃ الکبریٰ
کل سوانحِ حضرت محمد	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	فلپانا
تذکرہ اولیا	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	شوقین ملک
تذکرہ اولیا	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
مراقۃ العین	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
فصل فی الکونین	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
سفرِ چین	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
تخصیص النافع	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
خانوارِ جنت	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
منازلتِ الصوفیہ	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
خوانینِ گورہ	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
شہرِ سیواں	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
مشاہیرِ ہند	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
مذکرۃ صحیحہ	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء
لیکاتِ بنگال	سیاحتِ عرب			مذکرۃ الشعراء	مذکرۃ الشعراء

## مولانا شبلی نعمانی ناول سرشار

سیرِ کبریا	سیرِ بنی ہمدان	سیرِ بنی ہمدان	سیرِ بنی ہمدان	سیرِ بنی ہمدان	سیرِ بنی ہمدان
خدا کی توحید	خدا کی توحید	خدا کی توحید	خدا کی توحید	خدا کی توحید	خدا کی توحید
جامِ سرشار	جامِ سرشار	جامِ سرشار	جامِ سرشار	جامِ سرشار	جامِ سرشار
انجیلِ سرشار	انجیلِ سرشار	انجیلِ سرشار	انجیلِ سرشار	انجیلِ سرشار	انجیلِ سرشار
کاشی	کاشی	کاشی	کاشی	کاشی	کاشی
سوانحِ محمد صا	سوانحِ محمد صا	سوانحِ محمد صا	سوانحِ محمد صا	سوانحِ محمد صا	سوانحِ محمد صا

# بنگالیک کتب خانہ



قیمت ۸۰

# تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

<p><b>نگارستان</b> حضرت نیاز فتحپوری دہلی انواع اور فنون کا کتاب میں ملنے والا پہلا نمودہ نگارستان خاک ہے ثابت کیا ہے کہ ارتقاء میں خود جہولیت حاصل کیا اس کا آغاز اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>گہوارہ تمدن</b> اس زمانہ کی وہ مرکز اقامت کتاب میں ملنے والا پہلا نمودہ گہوارہ تمدن میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>شباب کی سرگزشت</b> حضرت نیاز کا وہ عظیم مطالعہ ہے ایک شخص آسانی میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>فرست الید</b> مولانا نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>شاعر کا انجام</b> جناب نیاز کے عقائد شباب میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>جذبات بھاشا</b> جناب نیاز کے عقائد شباب میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>
<p><b>صحابیات</b> اس میں جب سادہ کی وہ نویسین کے عقائد شامل ہیں کہ اس کے لیے اس کا انداز ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>نقاب ٹھکانے کے بعد</b> اس میں جب سادہ کی وہ نویسین کے عقائد شامل ہیں کہ اس کے لیے اس کا انداز ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>مذاکرات نیاز</b> اس میں حضرت نیاز کی ذاتی جو ادبیات و تصنیف شامل ہیں کہ اس کے لیے اس کا انداز ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>فلاسفہ قدم</b> اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں کہ اس کے لیے اس کا انداز ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>تایخ الدولین</b> اس میں جب سادہ کی وہ نویسین کے عقائد شامل ہیں کہ اس کے لیے اس کا انداز ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>	<p><b>المسلۃ الشرعیہ</b> اس میں جب سادہ کی وہ نویسین کے عقائد شامل ہیں کہ اس کے لیے اس کا انداز ہو سکتا ہے کہ اس کے حدود میں غریب و نادان نہیں ہو سکتے۔</p>
<p><b>تذکرہ خندہ گل</b> مولانا عبدالباری دہلی جس میں حضرت نیاز کے حالات و زندگی کا بیان ہے۔</p>	<p><b>منوی لالہ رخ</b> حاصل ہو کر معرکہ آرا منوی کا مکمل ترجمہ دہلی شاعر کا یہ منی نمونہ قیمت ۱۰۰ روپے</p>	<p><b>منوی زہر عشق</b> مشرقیوں کو کچھ دہلی میں ملک کے ہمارے بہترین ادیبوں کا مفید شامل ہے اور کسی قدوس کی دہلی میں ایک تصویر نگار۔</p>	<p><b>فرستہ التحریر</b> اس میں مولانا عبدالباری دہلی جس میں حضرت نیاز کے حالات و زندگی کا بیان ہے۔</p>	<p><b>فرستہ التحریر</b> اس میں مولانا عبدالباری دہلی جس میں حضرت نیاز کے حالات و زندگی کا بیان ہے۔</p>	<p><b>فرستہ التحریر</b> اس میں مولانا عبدالباری دہلی جس میں حضرت نیاز کے حالات و زندگی کا بیان ہے۔</p>

# نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے  
رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ سالانہ مفت نہ روانہ ہوگا  
سالانہ قیمت پانچ روپیہ دھواں ششماہی تین روپیہ  
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵	فہرست مضامین تاریخ ۱۹۳۴ء	شمارہ
۲	ملاحظات	
۹	زبان اردو کے ارتقائی منازل	
۱۸	زبان بے زبانی	
۳۰	وحی کی حقیقت علمی نقطہ نظر سے	
۳۲	پنجاب میں سیاسی پارٹیوں کا قیام	
۳۹	ہشتم	
۵۰	مکہ و جہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں	
۵۸	باب الانتقاد	
۶۲	باب الاستفسار	
۶۸	باب المراسلہ و المناظرہ	
۷۸	نشان (نظم)	
۷۹	نورستان محبت (نظم)	



## نگار

ادیٹر:- نیاز فقیہوری

جلد ۲۵	مارچ ۱۹۵۵ء	شمار ۳
--------	------------	--------

## ملاحظات

”تو خود حدیث مفصل بخوان ازیں مجل“

گزشتہ و آئندہ

آفتاب کا طلوع و غروب ، روز و شب کا تسلسل ، اور اسی طرح کے تمام فطری مناظر زمانہ نامعلوم سے یکساں طور پر رونما ہوتے چلے آ رہے ہیں ، اور اگر کائنات نام صرف انہیں نقوش کا ہو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کسی انقلاب و تغیر کو قبول نہیں کرتی۔ لیکن حقیقت امر شاید اس کے خلاف ہے کیونکہ اہل علم پر سے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ”عالم حادث ہے ، متغیر ہے“۔

پھر کیا اس حدوث و تغیر کا علم ہم کو بغیر کسی غور و فکر کے الٹامی طور پر حاصل ہوا ہے۔ غالباً نہیں۔ پھر اس بات کے تسلیم کرتے ہیں کیوں تاں ہو کہ اہم ترین تغیر عقل انسانی کا تغیر ہے جو ہر آن دہر لحظہ جوابات دہر کرنا جا رہا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ کس نقطہ پر پہنچ کر اس کو اپنی ٹانگ و دو خم کرنا ہے۔



وہ تھے جو ان کا نفاذ کرنے والے تھے اور نقال محض — پھر ان میں سے اکثر وہی تھے جنہوں نے اس پیمبرانہ رُوح کے حقیقی منشا سے نا آشنا رہ کر محض الفاظ کو لئے کر ان کی پرستش شروع کر دی اور کمتر ایسے تھے جن کے دماغوں نے ہادی اذل کی عقل سلیم کے متوازی چل کر اس کی تعلیم کی کئی حقیقت کو دریافت کیا ہو — یہی روزنا پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اور اسی لئے اس سے قبل بھی عقل و مذہب میں جنگ جاری رہی۔ اور اب بھی جاری ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ پہلے ذہن و عقل کی اس آدادی کو بزدل تمسخر فنا کر کے اسے زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اور آج یہ مجبوری اٹھ جانے سے عقل انسانی زیادہ سنگین محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے اب آئے اس جنگ پر ذرا اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں

اہل سائنس کہتے ہیں کہ سائنس ہمیں صرف ان باتوں کی تصدیق کرنے پر مجبور کرتا ہے جن کو ہم صحیح ثابت کر سکتے ہیں، برخلاف اس کے مذہب متعلق ہے چند معروضات پر جن کا کوئی عقلی یا استقرائی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر اہل مذہب سے سوال کیا جاتا ہے کہ ان کی باتوں پر ایمان لانے کے کیا اسباب ہیں تو وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے اسلاف ایسا ہی یقین کرتے تھے، دوسرے یہ کہ ہمارے اسلاف جو دلائل پیش کر چکے ہیں وہ کافی ہیں اور تیسرے یہ کہ اصول مذہب پر گفتگو کرنا ناجائز و ممنوع ہے — کیا یہ دلائل واقعی کوئی وزن رکھتے ہیں؟

اگر دو ہزار قبل مسیح کے اکتشافات علمیہ کو عقل انسانی نے آج باطل بدل کر رکھ دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس وقت کا مذہب جو ان کا توں باقی رہے اور اس کے اصول اب بھی مفید و کارآمد ثابت ہوں۔ پھر اگر تمام دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہوتا تو بھی کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کبھی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوا، لیکن جب دنیا میں سیکڑوں مذہب قائم ہوئے اور ہر ایک نے سوائے اپنے تمام دیگر مذہب کو جھٹلایا تو ایک طلبگار حق کے لئے چاہہ کار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان سب کو عقل کی تسوٹی پکے اور کسی ایک کی صحت پر ایمان لائے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا تعلق عقل سے نہیں کیونکہ درست ہو سکتا ہے —

یہ باطل صحیح ہے کہ سائنس اس وقت تک کسی ایسی حقیقت راسخہ تک نہیں پہنچ سکا جس کے آگے بڑھنے کی گنجائش باقی نہ رہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جو دن گزرتا ہے وہ اس حقیقت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اسی لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کے باب میں اس اصول پر تقاضا کو نظر انداز کر دیا جائے

سائنس واقعات کی جستجو کر کے حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے اور مذہب چند باتوں کو پہلے ہی سے حقیقت باور کر کے واقعات کو ان پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے — اگر ہم کسی مذہب کے پیرو ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہمارے آباؤ اجداد اس مذہب کے ماننے والے تھے، لیکن سائنس کے یہاں باپ دادا کوئی چیز نہیں، وہ ہر انسان سے انفرادی طور پر عقل و تمیز کا استعمال کا مطالبہ کرتا ہے

عقل انسانی نے عقاید مذہب میں جس جس تغیر کو قبول کیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ ابتدائی حالت میں جب انسان وحشی

درجہ اول تھا وہ خدا کو ایک ایسی ہی خود مختار فرماؤا ہستی سمجھتا تھا جیسی کسی دنیاوی صاحب و جبروت بادشاہ کی ہوتی ہو کہ نہ وہ کسی قانون کا پابند ہے نہ کسی اصول پر کار بند جو اور جس طرح چاہتا ہے بناتا بگاڑتا رہتا ہے — اس کے بعد جب سترہویں صدی میں ’ڈیکارٹ‘، ’گلیلو‘، اور ’نیوٹن‘ پیدا ہوئے اور انھوں نے کائنات کو ایک بڑی مشین کی طرح نظم و اصول کے ساتھ چلتے ہوئے تسلیم کیا تو خدا کے اس قدیم عقیدہ میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور لوگوں نے باور کیا کہ دنیا کا کاروبار بیشک خدا چلاتا ہے لیکن مخصوص مشینری کے ذریعہ سے جس کو اس نے پیدا کیا ہے۔ مدعا یہ کہ خدا کی خدائی کسی قانون و اصول کی پابند ضرور ہے۔ جب یہ دور بھی ختم ہوا اور اٹھارویں صدی آئی تو اس مشینری میں کسی خارجی قوت کی دخلت کو بھی تسلیم نہ کیا گیا مدعا یہ کہ خدا حکمراں تو ہے لیکن نظم و نسق سے اسے کوئی واسطہ نہیں — زمانہ حال کی جو کیفیت ہے وہ سب پر ظاہر ہے کہ سرے سے خدا کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا ہے — بہر حال یہ واقعہ ہے کہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ مذہبی نظریوں میں بھی غیر معمولی تغیر پیدا ہوا اور وہ وقت آنے والا ہے جب اس کی انتہا اس صورت میں ظاہر ہوگی جو اس وقت دوس میں نظر آ رہی ہے یعنی یہ کہ مذہب کا نام لینا ہی گناہ سمجھا جائے گا اور جس طرح کسی وقت دین نے بیداری کا استیصال تیغ و خنجر سے کیا تھا، بالکل اسی طرح بیداری، دین کو محو کر دینے کی کوشش کرے گی — کیونکہ اس وقت مذہبی اہمیت صرف سیاسیات کے رجحان پر قائم ہے اور اس کی حیثیت سرمایہ دارانہ پروپاگنڈا سے زیادہ باقی نہیں رہی

جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے مذہب، جس میں ظاہری مراسم و شمار کی پابندی ضروری ہے، کوئی معنی نہیں رکھتا، مادی نقطہ نظر سے اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں کہ آج تک وہ قوی کے مقابلہ میں ضعیف کو پامالی سے نہ بچا سکا، نفسیاتی زاویہ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی خصوصیات، علمی و تمدنی ترقی کے لئے بہت عار ج ہوئیں۔ یہی جہلانی و ابعد الطبیعیاتی تسکین سو یہ علم و اخلاق کی دوست سے مائل ہو سکتی ہے جو عام ”انوثہ انسانی“ کے رشتہ کو قائم کرنا چاہتی ہے — الغرض اس وقت..... مغرب کی علمی دنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جا رہا ہے وہ ”اشتراکیت“ ہے جس کا پیغمبر لیٹن اور جس کی شریعت سائٹس ہے۔ ۱۷

پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ بھی جان صرف یورپ و امریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے ترکی اپنی قومی ترقی و اصلاح کے لئے اسلام کو پس پشت ڈال رہا ہے، چنانچہ سلسلہ ۶ میں مصطفیٰ کمال نے اپنی ایک تقریر

۱۷ اسکو کہ کلب میں جو کہتے آویزاں ہیں ان میں سے ایک پر یہ عبارت درج ہے :-

”کسی کو خبر نہیں کہ دنیا ایک بے نیکی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ نئی دنیا سلسلہ ۶ میں پیدا ہوئی — آسمانوں سے خدا کو

بھٹاؤ اور زمین سے سرمایہ داری کو ملکہ شرک کی لاجوں کو آگے بڑھنے کا موقع ہے“

کے دوران میں صاف صاف کدیاتھا کہ ”کاسنی ٹیوشن میں اس امر کا اظہار کرتی کہ اسلامی حکومت ہے ایک ایسی بات کا اظہار ہے جس کو اولین مناسب فرصت میں کالعدم ہو جانا ہے۔“ یہی حال تقریباً ایران و مصر کا ہے۔ چین اور ہندوستان میں بھی اس انقلاب کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں کیونکہ اس وقت دنیا کے سامنے اہم ترین فکر یہ نہیں ہے کہ انسان کتنا ہل سے کس طرح باز رہے بلکہ یہ ہے کہ تمدنی و معاشرتی نظام میں کونسی ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ انسان بھوکا نہ مرے۔ اور چونکہ مذاہب عالم کا موجودہ نظام انسانیت کے اس درد دکھ کا علاج اب تک نہیں کر سکا۔ اس لئے لاعلمیہ یا تو اس کو پس پشت ڈالنا پڑے گا یا اس میں کوئی ایسا تغیر پیدا کیا جائے گا۔ جو اس گتھی کو سلجھا سکے۔ بہر حال اس دور انقلاب میں مذاہب کو ضرور سندھ پہونچے گا اور اگر حامیان مذہب نے اپنے اصول کار میں اقتضائے زمانہ کے لحاظ سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو ان منصب شریعت سے ہٹ جانا ناگزیر ہے

اگر شخص ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ موجود مذاہب میں، صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو زمانہ کے موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، بشرط آنکہ اس کی اصل روح کو پیش کیا جائے اور ظاہری شنائے دھرم کی پابندی نہ زور نہ دیا جائے

اس وقت اصولاً تقریباً تمام ممالک نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت و سلطنت کی بہترین صورت جمہوریت ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے جو مصائب دنیا پر توڑ رکھے ہیں ان کا علاج سوائے اشتراکی اصول کے اور کوئی نہیں ہو سکتا پھر کیا سوائے اسلام کے دوسرا مذہب کوئی اور ہے جو اس بات کا حامی ہو۔ سوال نہ جو عباس کا ہے نہ بنو امیہ کا، نہ دولت فاطمیہ کا نہ ہندوستان کے دور مغلیہ کا بلکہ غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے۔ اگر عمر رسالت کے بعد اس پر عمل نہ کر کے لوگوں نے بجائے جمہوریت کے مستبدانہ حکومتوں کی بنیاد ڈالی ہو تو اسلام مورد الزام نہیں ٹھہرتا اور اگر آج بھی اس تعلیم کو پیش نہیں کیا جاتا تو اس میں قصور ہمارے قائدین مذہب کا ہے نہ کہ اسلام کا

تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جو جذبہ علم کوئی خدمت کر سکتا ہے وہ ”اخوت عامہ“ کا جذبہ ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی تعلیم پیش کی جاتی ہے (خواہ وہ اصول سے تعلق رکھتی ہو یا فروع سے، شنائے وابستہ ہو یا عقائد سے) کبھی صحیح اسلامی تعلیم نہیں ہو سکتی

اس وقت اسلام کے اصطلاحی معنی خواہ کچھ ہی کیوں نہ قرار دے لئے گئے ہوں، لیکن حقیقتاً وہ ایک ایسا بسیط مفہوم رکھتا ہے کہ اس کو ہم کسی طرح محدود کر ہی نہیں سکتے کیونکہ اسلام نام ہے صرف استعلا کا، عروج و ترقی کا، جدو جہد کا، کردار و عمل کا، ایک ایسی ”لا مذہبیت“ کا جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اور شنائے دھرم سے بے نیاز ہو کر صرف پاکیزگی اخلاق اور تکمیل تمدن کی حامی ہے

پھر چونکہ اس شکتی کو مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم کو انسان کی خود غرضانہ ذہنیت خراب کر چکی

ہے، اس لئے عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ ساری خوابیاں تعلیم مذہب کی ہیں اور اسی بنا پر تمام اسلامی ممالک میں وہ ردِ عمل ظاہر ہو رہا ہے جس کا دوسرا نام کفر و ارتداد رکھا گیا ہے۔ لیکن باور کیجئے کہ یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہے گی اور اس انقلاب کا نتیجہ یقیناً استیصالِ مذہب کی صورت میں ظاہر ہوگا اگر اس کے اصلی خدا و خال پیش نہ کئے گئے۔

مگر ہے جو مفہوم میں نے اسلام کا پیش کیا ہے وہ اس وقت تعجب و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، لیکن وہ وقت آنے والا ہے، جب ایک ایک شخص وہی کئے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ اور اسلام تمام دنیا پر حاوی ہو کر رہے گا۔

پھر ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت دوسری ہو، اس کا نام کچھ اور ہو، لیکن اس کا مفہوم وہی ہوگا جو آج میں کہہ رہا ہوں اور اُس کے خدا و خال وہی ہوں گے۔ جنہیں آج میرا قلم پیش کر رہا ہے

### صوبہ بہار میں تعمیرِ مساجد کا بے محل سوال

اس وقت صوبہ بہار جس دردناک تباہی میں مبتلا ہے، اس کی حقیقت کسی سے مخفی نہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے امداد و مدد دی کے جذبات ظاہر کئے جا رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت جو اعانت کی گئی ہے وہ ہڈی ٹٹا ایسے وسیع ملک کو دیکھنے ہوئے کسی طرح قابلِ ستائش نہیں سمجھی جاسکتی اور ضرورت ہے کہ ہر ادارہ اور ہر انجمن علماً اس میں حصہ لے اور ہر وہ شخص جو دن میں چار پیسے صرف کر سکتا ہے، ایک پیسہ بچا کر ہمارے مصیبت زدہ انسانوں کے لئے علفِ دہ کر دے بغیر یہ صورت تو فرائی زر کی ہوئی، لیکن اسی کے ساتھ دوسرا اہم سوال اس کے صرف کا ہے۔ یعنی یہ کہ اس رقم کو کس طرح اور کس کام میں خرچ کیا جائے

اس وقت تک صورت حال یہ تھی کہ حکومت کے علاوہ چند پرائیویٹ امدادی کمیٹیاں بھی کام کر رہی تھیں اور چھ مولویوں کا عنصر ان میں شامل نہ تھا اس لئے صحیح اصول پر کام ہو رہا تھا، لیکن اب یہ دیکھ کر کہ ہمارے علما اگر اہم بھی اس میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں اور مسازندہ مساجد کی تعمیر کے لئے اپنی جوبلیاں لے لے کر نکل کھڑے ہوئے ہیں، ہمیں ”اندیشہ ہائے دور و دراز“ پیدا ہو گئے ہیں اور اگر ابھی سے اس کا سد باب نہ کیا گیا تو ملک کا بہت سا رویہ بیکار منالے جانے لگا

حال ہی میں ایک اہل ان علما و کرام کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس میں مسلمانوں کو صوبہ بہار کی تباہ شدہ مساجد کی طرف متوجہ کر کے چندہ طلب کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صوبہ بہار کی مسجدیں بالکل تباہ و برباد ہو چکی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ ان کی تعمیر و مرمت ایک حد تک ضروری ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والے ہی وہاں نہ ہوں گے تو مسجدیں کس کام آئیں گی۔ اس وقت تو اہم ترین سوال موت و زندگی کا ہے، بھوک پیاس کا ہے، نہ دھلکنے اور سر چھپانے کا ہے، اس لئے جب تک آپ اس سے فارغ نہ ہو جائیں مسجد و خانقاہ پر توجہ کرنا اور مدد سے متاثرہ پروردگار پر صرف کرنا حد درجہ لایعنی بات ہے

اگر مسلمان اس عمدہ و تباہی سے مانبر ہو گئے تو وہ اُس خدا کی پوجا جس نے انہیں زلزلہ کی مصیبت میں گرفتار کیا تھا، کھلے ہوئے میدانوں اور جھونپڑوں میں بھی کر لیں گے، لیکن اگر وہ بھوک پیاس سے مر گئے تو پھر کیا مولوی لوگ بغیر مقتدیوں کے ان مساجد میں امامت کریں گے

جو رقم کسی ایک مسجد کے تعمیر یا مرمت میں صرف ہوگی، اُس سے ہزار بھوکوں کو کھانا کھلایا جاسکتا ہے، اس لئے بہ حالت موجودہ انسانی تباہیوں پر مساجد کی تباہی کو ترجیح دینا اور لوگوں کی توجہ کو بجائے حیات انسانی کے ہیٹ اور چرنے کی طرف مائل کرنا۔ نہ یہ کہ خلاف عقل ہے بلکہ اقتضا و مذہب کے بھی منافی ہے۔ اور پھلواری شریف میں جو مرکزی کمیٹی تعمیر مساجد کے لئے قائم ہوئی ہے اسے توڑ دینا چاہئے کیونکہ ایک پیسہ بھی اس وقت اس کام میں صرف کرنا عقلاً و شرعاً دونوں طرح ناجائز ہے

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ کوئی رقم ایسی کمیٹیوں کو نہ دیں جو تعمیر مساجد کے لئے قائم ہوئی ہیں کیونکہ ابھی یہ کام بالکل قبل از وقت ہے۔ اور سب سے پہلے ہمیں اُن یتیم بچوں کی پرورش کی طرف متوجہ ہو نا ہے جو پڑے ہوئے رستہ پر ہیں، اُن بیواؤں کی اعانت کرنا ہے جن کا کوئی سر دھرا موجود نہیں اور اُن ضعیفوں کی مدد کو پہنچنا ہے جن کے جوان جوان بیٹے نذر اہل ہو چکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تعمیر مساجد کے سلسلہ میں، بہت سے مزدور کام سے لگ جائیں گے، لیکن کیا مکانات کی تعمیر سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، اور کیا دوسرے امدادی کاموں سے روپیہ لوگوں میں نہ پھیلے گا۔

## عمدہ قسم کے پودے

### تنمی باغات کی واسطے

جسم اور قد میں بڑے سیب کے مانند رنگین آم نہایت لذیذ انواع اقسام کے آم کے پودے اپنی زمینوں پر لگا کر ان کی پیداوار سے معقول فائدہ حاصل کیجئے

دو سالہ عمر کا پودا سالانہ میں ۴۰ بغیر گلہ ۳۰ علاوہ محصول خرپہ وغیرہ

نفیر برادر س ملج آباد ضلع لکھنؤ

# زبان اردو کے ارتقائی منازل

(سلسلہ مابحہ)

زبان فارسی کے ہندو ادیب | عہد مغلیہ نے بہت سے ہندو ادیب پیدا کئے ہندو منصبداروں میں اکثر امر فارسی زبان میں مہارت رکھتے تھے، اور وہ اپنی اولاد کو فارسی کی تعلیم دلایا کرتے تھے عہد اکبری کے بعد سلا بعد نسل یہ سلسلہ قائم رہا۔ چنانچہ عہد جاگیر میں فارسی زبان کا ایک بہت بڑا ہندو ادیب رائے منو ہر لوسی تھا، ابن محمد تقسیم المروی لکھتا ہے،

رائے منو ہر بن رائے لون کرن خدمت شاہزادہ سلیم خط و سواد ہم رسندہ شعر و لکھنؤ دہلی "تخلص ارد" (زبان ابن محمد تقسیم ہندی)

جہانگیر فارسی ادب میں جو بلند مرتبہ رکھتا ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں اس کے روزنامہ (تربک جہانگیری) کی ہر ہر سطر شاہد ہے، مرزا سرخوش نے اس کی عروض دہلی کے متعلق ایک عجیبے وایت (رج کی ہے) (کلمات الشعرا) ایسے ماہر ادیب کی صحبت میں رائے منو ہر ادب کے کس نکتہ و رمز سے ناواقف رہا ہو گا؟ عہد شاہجہانی میں ایک ہندو شاعر تھا جو "برہمن" تخلص کرتا تھا۔ مرزا سرخوش لکھتے ہیں

برہمن افضل خانی طبع درست داشت در ہندوان بسیار غنیمت بودہ .... سلیقہ انشا پر داری ہم داشت (کلمات الشعرا ص ۲۱)

شاہجہاں نے حکم دیا کہ مشاعرہ ہو، برہمن نے یہ تازہ بیت لکھا تھا پڑھ دیا

مرادے است بکفر آشنا کہ چندیں بار بہ کسبہ بردم و بانیش برہمن آورد م

اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ برہمن کس پایہ کا شاعر تھا اور یہی نہیں بلکہ مرزا سرخوش کی روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ "برہمن" کے علاوہ فارسی کے اور بھی شعراء ہندو تھے۔ عہد متاخرین میں بھی فارسی کے بہت بڑے بڑے ہندو ادیب شاعر پیدا ہوئے ہیں بھگوانداس ہندی اور بندر بن داس خوشگو بہت بلند درجہ رکھتے ہیں، یہ حضرات نہ صرف نکتہ سخن شاعر تھے، بلکہ معتبر تذکرہ نگار بھی تھے، ان لوگوں نے فارسی کے شعراء متاخرین و معاصرین کے حالات و کلام سے بحث کی ہے، "سفینہ ہندی" اور تذکرہ خوشگو کے قلمی نسخے پٹنہ انڈیا لائبریری میں ہیں یہ کتابیں ہندو مسلمانوں کے روابط اور رجحانات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے، کہ فارسی زبان ہندوؤں کے درمیان کس بلند معیار پر رائج تھی

خطاطی | میرے پاس عربی اور فارسی خطوطات کا ایک مختصر مجموعہ ہے، اس میں بعض کتابیں ہندو انشا پر دازوں کی تصنیف ہیں، بعض ہندو خطاطوں کی نقل کی ہوئی ہیں تفصیل ملاحظہ ہو،

ناورات الشاقب۔ یہ کتاب فن بلاغت کے متعلق ہے، خط نستعلیق، نہایت ہی پاکیزہ اور جالب نظر ہے رائل سائیز کے ۱۲۶ صفحات کو محیط، عنوان سرخ روختی سے لکھے ہوئے ہیں مصنف کا نام شیو پر دہان ہمارا ہے گوہر پال سنگھ ہمارا تخلص یہ ناقد ہے، اس کتاب پر کئی جگہ خود ہمارا صاحب ہمار کی خاص مہر میں ثبت ہیں سرورق پر فرار دوائے اودھ واجد علی شاہ کی مہر بھی درج ہے، یہ کتاب شہرہ میں لکھی گئی، اور ۱۲۸۷ھ میں ہمارا صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر شہر یار اودھ کی خدمت میں پیش کی چنانچہ خود ہمارا صاحب



قلم سے کتاب کے شروع میں یہ عبارت ثبت ہے،

عرضہ داد اقل عباد، خانہ زاد اذلی اعتقاد، شیوہ پرہمان مہاراجہ بے گواہاں سنگھ مہاراجا بالادین نیک و مہر ریح الاول یوم عید الجمعہ،

ابتداء اور آخر میں یہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں

”مصنفہ و محررہ و گنہ رانیدہ خانہ زاد موروئی“

اس کے بعد آپ کے نام کی مہر درج ہے، ہمارا جہ صاحب قوم کا لیست سری با سب سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کا خاندان شاہان اودھ کے زمانہ میں اعیان و اشرف میں شمار ہوتا تھا آپ کے والد کا نام ہینی پرشاد ہے، آپ شام سندر لال سرشار کے نواسہ ہیں، ثاقب کی یہ کتاب فارسی میں ہے، انھوں نے صنایع و بدائع کے متعلق اس میں بہت سے نقوش بنائے ہیں ساری صنعتوں کی مثال میں ایسے اشعار پیش کئے ہیں جن میں واجد علی شاہ کی مدح ہے، یہ اشعار خود ثاقب کی فکر کا نتیجہ ہیں اس نے بہ اسباب اور بھی قابل قدر ہے، بلاغت کے متعلق اگلی کتابوں میں متقدمین کے کلام سے لوگوں نے مثالیں پیش کی تھیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ثاقب بلاغت میں صرف ایک کاتب و ناقل کا درجہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ وہ اس فن کے مجتہد کہے جاسکتے ہیں پہلے صفحہ پر ہندو طرز کی ایک تصویر اور گلکاریاں بھی پائی جاتی ہیں،

اقبال نامہ جہانگیری | معتمد خاں نور الدین جہانگیر کا بخشی تھا۔ اس کی یہ تاریخ عہد جہانگیری کے متعلق نکتہ دلچسپ و معتبر ہے، اس پر ایک مکمل تبصرہ ”نگار“ میں ہو چکا ہے، اسی کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۲۱ھ میں بمقام گلکنہ مرتب ہوا تھا اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے،

”برائے خاطر عزیز اندر رام بہ خط خام گنام رام سکھ پنڈت“

مجمع الصنائع | یہ کتاب بھی فن بلاغت میں ہے، نسخہ ۱۲۱۸ھ اس کی تاریخ تصنیف ہے، فن بلاغت پر اس سے جامع کتاب میری نظر سے نہیں گذری، اس کے پہلے صفحہ پر ایک مہر ثبت ہے، کتابت نہایت عمدہ ہے، اس کے آخری سطور یہ ہیں

”ابن نسخہ نخست آیام سہمی بہ مجمع الصنائع بعزہ ربیع الاول سنہ یکہ زاد و صد و دوی و ہشت ہجری علی صاحبہا

افضل الصلوٰۃ والسلام برک خاطر شریف طبع لطیف معدن الجود، و حق پرست مالہ صاحب قبلہ و نائب بلہ بھون دین

صاحب ساکن قصبہ سکھاری بہ خط اذل الانام سالار بخش تجا و اللہ عنہ سائتہ بہ اختتام رسید“

شجرۃ الامانی | اس کے مصنف مرزا قاتل ہیں، یہ رسالہ قاتل نے بلاغت و معانی کے متعلق لکھا ہے، اور سید امان علی کے نام سے معنون کیا اسی کا ایک قلمی نسخہ، لالہ بخوانی دین کے ہات کا لکھا ہوا، میرے پیش نظر ہے، اس کی آخری عبارت یہ ہے،

”تمام شد ستم شجرۃ الامانی تصنیف مرزا محمد حسن فقیہ کاتبہ و مالک اضعف العباد بھوانی دین قوم کالیست متوطن قصبہ بکھاری

منطقہ درگاہ کچھوچھہ بتاریخ یازدہ جمادی الثانی ۱۲۲۸ھ یک ہزار و دو صد و سی و نہ ہجری رقی یافت“

**رسالہ ستم شمسہ و قمریہ** | یہ کتاب شمسی و قمری سنہ کی تحقیقات کے متعلق ہے، اس کے مصنف قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین ہیں اس کا ایک طبعی نسخہ مخطوطہ ۲۳۵ھ لالہ بھوانی دین کے کتب خانہ میں تھا، یہ رسالہ خود لالہ صاحب نے نقل کرایا تھا اسی کے ساتھ دو رسائل اور ہیں ایک فلسفہ پر ہے، جو ”زمان و مکاں“ کے مباحث سے متعلق ہے، دوسرا ضوابط، و آئین عدالت کے متعلق ہے،

ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نہ صرف تخلیق زبان میں مدد دی بلکہ علوم و فنون کے جس شعبہ پر نظر ڈالے آپ کو پتہ چلے گا، کہ ہندوؤں نے اس میں ضرور حصہ لیا، شاعری اور اصناف سخن کو چھوڑئے، تصوف، مونیسم، مصوری، تعمیر سارے فنون میں ہندوستانی اثر پایا جاتا ہے،

**تصوف** | معتمد خاں نے جہانگیر کی فقیر دوستی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ روایت لکھی ہے، جلوس کے گیا ہوں سال بادشاہ ادھم... گیا یہاں ایک ہندو سنیا سی کے حالات سنکر بادشاہ خود اس فقیر کے مٹھ پر پہنچا سنیا سی علم و دیانت میں کامل تھا علاقائی مادی کو یکسر ترک کر چکا تھا، عبادت و ریاضت کے سوا اس کو دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا، آبادی سے دور اس کا صومعہ تھا فقیر نے بادشاہ کی پذیرائی کی اور تصوف اسلامیہ اور لوگ (ہندوستانی تصوف) کے اصول و مبادی میں تطبیق دے کر بیان کیا چنانچہ مورخ مذکور لکھتا ہے،

”مظلمات اہل اسلام را با طریق تصوف خود تطبیق دادہ بیان نمود صاحب این معتمد را“ ”سرب باشی“ ”میگوید

یعنی تارک ہمہ“

اس سے جہاں ہندو و فقرا کی اسلامی تصوف سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے، وہاں دور مغل کے ابتدائی عہد میں مسلمان ادیبوں کی اس کاوش کا بھی حال معلوم ہوتا ہے، جو وہ بھاشا کی اصطلاحات کے متعلق کرتے تھے،

**مصوری** | دربار اکبری کے مصوروں میں زیادہ تر تعداد ہندو ماہرین فن کی پائی جاتی ہے، ابوالفضل نے ”آئین“ میں ان کے نام گنائے ہیں لیکن ان میں چار آدمیوں کو سب میں ممتاز بتایا ہے، میر سید علی تبریزی، خواجہ عبد الصمد شیریں قلم، دسونتھ، اور بساوان،

دسونتھ ایک کمار کار کا تھا اس نے اپنی ساری زندگی اس فن پر صرف کردی اس کو اپنے مشغلہ سے عشق تھا، وہ دیواروں پر نقوش بنا یا کرتا تھا ایک دن اعلیٰ حضرت (اکبر) کی نگاہ اس پر پڑی، اس کی ذہانت آشکارا

ہوئی، اور اعلیٰ حضرت نے خود اپنے ہاتھ سے اس کو خواجہ (عبدالصمد) کے حوالہ کیا، قلیل مدت میں وہ تمام مصوڑوں سے بڑھ گیا اور اپنے زمانہ کا سب سے اول استاد ہوا آخر میں اس کو جنون لاحق ہو گیا، اس نے خود کشی کر لی، وہ اس فن کے بہت سے شاہکار چھوڑ گیا ہے بسا اُن ایک دوسرا مصوڑ تھا، فضائے بعید، وضع نگاری، تقسیم الوان، شبیہ طرازی اور بہت سے شعبوں میں وہ فایق ہوا، یہاں تک کہ بہتیرے نقادان فن اس کو دسویں صدی پر ترجیح دیتے ہیں ان کے علاوہ دربار اکبری میں اور تیرہ مصوڑ تھے جن میں بہ استثنائے تین سب ہندو تھے، ان کے نام یہ ہیں کیشو، مکند، مادھو، جگن، معیش، اھیم کرن، تارا، سانولا، ہر جس، رام، ان لوگوں کے بہتیرے نقوش آج بھی موجود ہیں ای بی ہیول لکھتا ہے، کہ وکٹوریہ البرٹ میوزیم (جنوب کینسلٹن) نے حال ہی میں ”اکبر نامہ“ کا ایک حصہ حاصل کیا ہے، جس میں تقریباً ایک سو دس نقوش ہیں ان میں اکثر انہیں مصوڑوں کی نگارشی قلم کا نتیجہ ہیں جن کو ابوالفضل دوسرے درجہ میں لکھتا ہے، لیکن ان میں بعض وہ بھی شامل ہیں جن پر بسا وں کا دستخط ہے، جس کو اکبر کے مشہور ترین صناعتوں میں شمار کیا جاتا ہے، لہ

ای بی ہیول نے اپنی کتاب میں اور ایک معرکہ الار تصور درج کی ہے، اس میں ہمانگیر کے محل کا بائین منظر پیش کیا گیا ہے، ایک صحن ہے، اس میں مرد در کام کر رہے ہیں کوئی اینٹیں جوڑ رہا ہے، کوئی گلا وہ لے جا رہا ہے، بھتی پانی لا رہا ہے، بعض لوگ سالاتیار کر رہے ہیں، دو حبشی بھی ہیں۔ ایک عصلے کھڑا ہے، دوسرا جھکا ہوا ہے، ایک ضعیف متبرک آدمی جو قرینہ سے شاہی خاندان کا فرد معلوم ہوتا ہے، جھکے ہوئے حبشی کے قدموں پر سر ڈالے ہوئے ہے، مؤلف مذکور لکھتا ہے، کہ غالباً اورنگ زیب، محل میں شاہجہاں کو قید کر رہا ہے، اور مرد در آمد و رفت کی راہ مسدود کر رہے ہیں یہ تصویر اپنی جامعیت و تاثرات کے لحاظ سے بے نظیر ہے، اس کے نیچے ”منوہر بندہ“ کا دستخط ہے، ای بی ہیول اس کو ”منوہر بندہ“ پڑھتے ہیں حالانکہ صاف منوہر لکھا ہوا ہے، یہ عہد اکبری کے بعد دربار منل کا ہندو مصوڑ تھا، چنانچہ تاثر لکھتا ہے،

بصنعت گر چہ آدمی بود قادر

یقیناً منوہر بود ماہر

صاحب غیاث اللغات نے انکار کیا ہے، کہ اس نام کا کوئی نقاش ہندوستان میں نہیں گزرا لیکن یہ ہمارے لغوی کی لغویت ہے،

Indian Sculpture and painting ص ۱۹۵-۱۹۶

۴۵۷ ملاحظہ ہو ماسیہ غیاث ص ۴۵۷

اسی طرح ای بی ہیول کی کتاب میں امر سنگھ کے اردو کے سورج مل کی ایک شبیہ ہے، اس کے چاروں طرف فارسی اشعار ہیں اور سرخ و سنہری روشنائی سے باریک سیلیں بنائی ہوئی ہیں۔ یہ نقش بھی ایک ہندو مصور "نانا" کی نگارش کا نتیجہ ہے،

**موسیقی** اسلامی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی میں بنیادی اختلافات ہیں، یہ اختلاف نتیجہ ہے، قومی فرق و امتیاز، ملکی آب و ہوا، اور مقامی خصوصیات کا، چنانچہ فارسی (اسلامی) موسیقی میں بارہ پردے یا مقامات ہیں، ہندوستانی موسیقی میں سات، باہنہ اسلامی ہند کے قبل اہل عرب ہندوستانی موسیقی سے واقف تھے، چنانچہ فرانسیسی عالم جول رووانیت لکھتا ہے،

کن لک ہم لاشعور فواطریقة الهند والطرقة التي | اسی طرح وہ (اہل عرب) شہ ق م سے ہندوؤں کے طریقہ اور اس  
یستعملها الصينيون منذ ۲۰۰۰ سنة قبل المسيح | طرز سے جو اہل چین استعمال کرتے تھے بلا شک و شبہ واقف تھے  
اسی طرح مسعودی ہندوستان کے ایک آلہ موسیقی کے متعلق لکھتا ہے،

ولھند الکلیکلہ وھو وتر واحد یمد علی قرعة فیقوم العود | کیلکہ ہندوستان کا آلہ موسیقی ہے، اس میں ایک تار سر پر لگا ہوتا  
والصنج ۷۷ | تھا پس یہ ربط اور جھانج کے قائم مقام ہے

اسی کو استاد اسکندر زلفون مصر کا ماہر موسیقی "کنکلہ" لکھتا ہے، مسعودی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ عرب نہ صرف ہندوستان کے آلات موسیقی سے واقف تھے، بلکہ اس نے جو لفظ "صنج" استعمال کیا ہے، وہ ہندوستانی آلہ موسیقی "جھانج" کا عرب ہے، جس طرح لفظ چین کی "چ" عربی میں "ص" سے بدل گئی، اسی طرح "جھانج" کا "جھ" "ص" سے بدل گیا، ہندوستان کا مشہور لغوی علامہ غیاث الدین بھی صنج کو جھانج کا عرب بتاتا ہے، خلیفہ ولید اول کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہوئی خود خلیفہ بہت بڑا گویا اور ماہر موسیقی تھا، اس نے بہت سی راگنیاں ایجاد کیں چنانچہ جول رووانیت لکھتا ہے،

وكان الخليفة الوليد شاعراً ملحناً مولعاً فی الموسيقى لدر الحان | خلیفہ ولید شاعر اور ملحن تھا، فن موسیقی پر اس نے کتاب بھی لکھی اسکی  
کنیڈو یعرف علی العود و یعرف صناعة الایقاع ۷۸ | بہت ہی راگنیاں ہیں یہ ربط نوازی اور موسیقی کے میوا زین سے واقف تھا،  
اسی طرح ولید ابن یزید ثانی کے زمانہ میں بھی موسیقی کو بہت بڑا فروغ تھا۔ جب وہ تخت خلافت پر بیٹھا تو  
اس نے یونس کا تب کو طلب کیا، یہ وہی یونس ہے، جس نے ابن سرتج، ابن حرز اور غریس کے سامنے زانوئے  
تمذتہ کیا اس نے راگنیوں کے متعلق ایک کتاب بھی جو بعد میں موسیقی کی تمام کتابوں کا واحد ماخذ ہوئی۔

ابو الفرج اصفہانی لکھتا ہے،

وله کتاب فی الاغلق ولحنیہما کلان الملحون الموحد لاهل العصر  
لہ یسبقہ الی مثلہ احد لہ

ولید ثانی کے عہد میں بقول امیر علی موسیقی کا جنون پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے اندازہ ہوتا ہے، کہ ہندوستان کے ماہرین موسیقی بھی اس کے دربار میں ضرور باریاب ہوتے ہوں گے، کیونکہ اس وقت حکومت سندھ امویہ دمشق کے زیر اثر تھی،

دور امویہ کے بعد خلافت عباسی میں یسین اسلام کو دنیا کے مختلف قوموں سے ملنے پلنے کا اتفاق ہوا اور اس لئے آرت کے تمام شعبوں میں مختلف عناصر شامل ہو گئے، استاد جوں رو دانت لکھتا ہے  
وفی حکم العباسیین اتسعت المملكة الاسلامیہ وامتد  
حدودھا وکان ذلک عصر للاحیہ واذن طرف العربیین علی  
اذ کان ایضا عصر اختلاط العرب فیہ واحتکوا بالشعوب  
المقہورۃ فکان لذلک تاثرات مختلفہ علی  
سائر الغنون لہ

اس سے پتہ چلتا ہے، کہ ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے قبل ہی سے عربی اور ہندوستانی موسیقی کا امتزاج یا اختلاط ہو چکا تھا، اس کے بعد ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے موسیقی سے گہری دلچسپی لی، ای بی ہیول نے اپنی کتاب میں محمد تغلق کی محفل رقص و موسیقی کی ایک تصویر اپنی کتاب میں درج کی ہے، بابر خود بڑا معنی تھا، اسماعیل عادل شاہ کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے،

”در علم موسیقی و شعر علم مہارت افرشتہ تھے“

اسی طرح محمد علی خاں انصاری ابراہیم عادل شاہ کے متعلق لکھتے ہیں

”بہ نغمہ و علم موسیقی آن شغف داشتہ کہ با جماعت کلاوت و صلت نمودہ اینساں خویش و تباہ خویش یافتہ“

ہندوستانی باد فر و شول (دبھاٹ) نے اپنے فن کے ذریعہ ہندی اور فارسی کے امتزاج سے عجیب و غریب لہریچر چھوڑا ہے، ہندوستان کے ان مغنیوں نے بھی اردو کی تخلیق میں بڑی مدد دی ہے،

۱۔ کتاب الآفانی ۲۔ دائرة المعارف الموسیقیہ ص ۵۵ ۳۔ Indian Sculpture  
۴۔ فرشتہ مقالہ سوم رد دوم ۵۔ بحر المواج

**اردو کا وجود** صدیوں کی اسلامی حکومت، عربی و فارسی قبائل کی ہجرت، اخلاق و معاشرت کی تقلید و اختلاط، عربی، فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے ایک جوہری زبان تیار کی جسے ہندوستانی کہتے

یا اردو، لفظ اردو بذات خود دورانِ تھاہی کی پیداوار ہے، یہ نہ عربی ہے نہ فارسی، اردو جس قوم کی زبان کا لفظ ہے، وہ اسلامی مبلغین کے نہیں آئی تھی، بلکہ ملک گیری کی ہوس پیمانیوں، اور استعماری دست درازیوں نے اس کو ہندوستان میں بھیجا، اس قوم کے داخلہ کے قبل مسلمانوں کی حکومت یہاں قائم ہو چکی تھی، ظاہر ہے کہ اگر مسلمان اشاعتِ دین کے سلسلہ میں ہندوستان میں آباد نہ ہوتے تو بھی مغلوں کا حملہ ہوتا اس صورت سے لفظ اردو کا بھاشا میں داخل ہونا ضروری تھا، اس لئے نتیجہ نکلتا ہے، کہ لفظ ”اردو“ کشمکشِ حیات کا ایک اثر باقی ہے، لہذا اس کو صرف مسلمانوں کی لغات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں،

اردو زبان میں جب شعر و ادب کا رواج ہوا تو پھر ہندوؤں نے اسی وسعتِ دل اور فراخِ صو گلی کے ساتھ اس میں بھی حصہ لینا شروع کیا جس طرح انھوں نے عربی اور فارسی میں حصہ لیا تھا، ادبِ اردو کی تاریخ معروف و معتبر ہندو ادیبوں کے بدلیہ افکار سے مالا مال ہے، پنڈت دیانند کشن، پنڈت رتن ناتھ سرشار، بھیمائی و شیخ (دکنی) نے اردو کی جو خدمتیں انجام دی ہیں ان کو زمانہ اپنی فراہم کوشش کاریوں کے باوجود، صغیر تاریخ سے محو نہ کر سکا،

جن لوگوں نے سرشار کی ”سیر کسار“ اور شیخ کی ”چمنستان شعرا“ کا مطالعہ کیا ہے، وہ ہندوؤں کی اردو زبان دانی اور مذاقِ ادب کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں ”چمنستان شعرا“ کو فارسی زبان میں ہے، لیکن شعرائے ریختہ کے حالات زندگی اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے، سیر کسار بیگمات اودھ کی زبان کا مرقع ہے، اور اس میں لطائفِ زبان کے متعلق ایسی سحر کاریاں کی گئی ہیں کہ انسان پڑھنے کے بعد ”بادہ سر جوش“ کے مزے لیتا ہے

کتب خانہ حیدری آ رہ میں ”تذکرہ شعرائے ہندو“ کے نام سے ایک مطبوعہ کتاب میں نے دیکھی تھی، یہ کتاب اب پنٹنہ کے ایک پروفیسر صاحب کے پاس ہے اس میں اردو کے سینکڑوں ہندو شعراء کے حالات و کلام درج ہیں، خود میرے پاس داسوخت کا ایک مجموعہ مسمیٰ بہ ”شعلہ جوالہ“ ہے، اس کا تاریخی نام ”ضبطِ عشق“ ہے، جس سے شعلہ نکلتا ہے، اس میں چند ہندو شعراء کے بھی داسوخت درج ہیں۔ اور ہر شاعر کے مختصر حالات زندگی بھی ملتے ہیں،

**منشی طوطا رام شایاں** شایاں کا خاندان فرماؤ دایان اودھ کے دربار سے وابستہ تھا شایاں کے دادا منسارام کو بخشی الملک کا خطاب ملا تھا، منسارام کے جد امجد تلمسی رام کو نواب آصف الدولہ بہادر نے ”رائے“ کا خطاب اور زمرہ کی ایک انگوٹھی عطا کی تھی جس پر یہ خطاب کندہ تھا،

پھر نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں آپ فوج کی بخشی گری کے عہدہ پر ممتاز ہوئے، شایاں سری باسنت کاشت تھے،

رام سب طرح کیا دلگوئیوں نے جسم را ز آفت سے ہوئے نام خدا جب محرم  
اور صوت کا نظر آیا پھر ان کا عالم بھگتی شکل نظر دیدہ حیران کی قسم  
طرف آہ دل سوزاں نے شر باری کی  
دھوم دوزخ میں ہواں لگ کی چنگاری کی

پنڈت اجودھیا ناتھ نوالی | پنڈت جی دہلی کے رہنے والے اور جو دھپور کی عدالت فوجداری میں ملازم تھے  
آپ غالب کے ہمصر اور ہندوستان کے مشہور شاعر مولانا ام بخش صہبائی کے شاگرد  
رشید تھے، بلکہ پنڈت جی نے چھ سال کی عمر میں الف باکی ابتدا مولانا مرحوم ہی کی خدمت میں لی، آپ کا واسوخت  
فارسی میں ہے،

ای جفا پیشہ بے نیست کہ نالان تو نیست زندہ نیست کہ جوں مردہ برندان تو نیست  
نیست خلقے کہ تہ خنجر بران تو نیست گردنے نیست کہ خوش تہ دالان تو نیست  
زیر داماں تو خوںے کہ شفق می بالہ  
گل خورشید بود گوزافن می بالہ

آپ کا وطن بکھنؤ تھا یہیں آپ پیدا ہوئے، آپ منشی یمنڈ دلال مخلص بہ راز کے شاگرد  
ہیں آپ کے بیان میں حد درجہ شگفتگی و حلاوت پائی جاتی ہے، منظر نگاری میں آپ کو کمال  
ہے، فرماتے ہیں

جانندی رات آد طرفہ ساں فہرنگ صبح گلشن میں بچا ایک جزاؤ ہو بلنگ  
میں ہوں مشوق کو اپنے لئے آغوش میں تنگ دونوں ہوشی میں ہیں لگی نکلتی ہو انگ  
اس قدر کیف سے عشق میں مغرور ہوں میں  
گاہ نزدیک ہوں اس بت کے کبھی در ہوں میں

خیر یہ تو عہد قدیم کی باتیں تھیں دور حاضر میں بھی بڑے بڑے ہندو اہل قلم موجود ہیں، ہمارا جہ سرکشن پرشاد شاد  
(جو راجہ ٹوڈر مل وزیر اکبر کے ہاتھ میں ہیں) برو فیسہ رگھوپتی سہائے فراق، (گورکھپوری)، منشی پریم چند،  
لالہ رام سروپ شیداہی۔ اسے بکھنوی، لالہ چندری پرشاد شیداہلوی، پنڈت جگن ناتھ پرشاد آئندہ، منشی بیالے لال  
روشن دہلوی، لالہ دھرم پال گپتا و قادیلوی، لالہ چمنو مل ناقد دہلوی، شام سندر فراق، لالہ جگ موہن صاحبان

شانسارام ایل۔ اے، سردار سوہن سنگھ بی اے، مفتوں اڈٹیر ریاست، مدیر تیج مسٹر مکند بہاری لال نادم وغیرہ اس زمانہ میں اردو کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں، فراق گورکھپوری کی ایک نظم ”ترانہ خزاں“ کے عنوان سے ایوان (آہِ مرحوم) گورکھپوری میں شائع ہوئی تھی اس کے متعلق زبانِ اردو کے مسئلہ ادیب مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں:

”فراق نے جس نظر سے خزاں کو دیکھا ہے، اس نے خزاں کی ماہیت کو بدل دیا ہے، خزاں کے جو رموز فراق نے بیان کئے ہیں ان سے اردو اور فارسی زبانیں محروم ہیں انگریزی میں البتہ شبلی، اور کٹس کی نظمیں مجھے بے طرح یاد آ رہی ہیں

علاوہ ”ترانہ خزاں“ ان دونوں سے جدا گانہ نوعیت رکھتی ہے۔“ (ایوان، بابت مارچ ۱۹۳۱ء)

جناب فراق گورکھپوری کا خاندان فارسی اور اردو کی خدمات کے لئے ممتاز رہا ہے، ایوان اشاعت نے آپ کے بزرگ جناب منشی گورکھ پرشاد مخلص بہ عہدت کی ایک شہنوی ”حسنِ فطرت“ شائع کی تھی،

پیشوا کے ”رسولِ نمبر“ (بابت ستمبر ۱۹۳۱ء) میں اکثر ہندو اہل قلم کی نظمیں و مقالے شائع ہوتے ہیں، ہمارے عہد میں ایک اور ہندو ادیب جمپت رائے جین ہیں، جو آجکل یورپ میں جین دھرم کی تبلیغ میں سرگرم ہیں، آپ انگریزی کے ایک مشہور مصنف ہیں، مذہبیات و فلسفہ، تاریخ و اساطیر سے آپ کو خاص شغف ہے، آپ نے انتہائی دیر ادبی سے کام لے کر اپنی ہزاروں روپے کی کتابیں جین سدھانت بھون (آرہ) میں وقف کر دی ہیں، حال میں آپ نے ”جواہراتِ اسلام“ کے نام سے اردو میں دو کتابیں لکھی ہیں، پہلی کتاب میں فارسی شعرا، خصوصاً رومی کے کلام سے اپنی جینی معتقدات کا موازنہ کیا ہے، اور اسلام کے صوفیانہ عناصر پر مفصل بحث کی ہے، دوسری کتاب میں اردو شعرا کے کلام کا اقتباس درج ہے، اس میں شک نہیں کہ کتاب کے اندر زبان کی بعض خامیاں ہیں لیکن عہدِ حاضر میں ہندو مسلمانوں کے جو تعلقات ہو رہے ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جین صاحب کی یہ کتاب ملک کے لئے ”انعام“ کا درجہ رکھتی ہے کاش ہمارے دوسرے وطنی بھائی بھی اسی بنیاد پر قومی عمارت استوار کریں

عبدالمالک (آروی)

## دو ادبی شاہکار

شونپنار۔ فلسفہ شونپنار پر ایک پیمثل تبصرہ عیم (علاوہ محصول)  
شہنوی زہرِ عشق۔ مجلد مہرِ محبت تصاویر و تین مقدمات قیمت عیم (علاوہ محصول)

میجر تکار لکھنؤ



# ”زبان بے زبانی“

ہمارے فاضل دوست جناب اختر حسین صاحب اسے پوری تے مفسا زردی ادب جدید کے مشہور مہر دار ہیں  
 کے ایک افسانہ کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں کہ ”درخت کے تاثرات“ ہے  
 اردو میں افسانہ نویسی کا یہ انداز بالکل نئی چیز ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اختر حسین صاحب بڑی حد تک  
 اس میں کامیاب ہوئے ہیں  
 اُسید ہے کہ ناظرین نگار جذبات و تخیل کی اس فضا کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کریں گے، جو اس رنگ  
 کے افسانہ نگاری کی اصل روح ہے (اڈیس)

میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں، غیر فانی اور ابدی !  
 نہ جانے کتنی مدت سے میں تنہا اور خاموش کھڑا ہوں۔ برقرار اور سب قرار ! بے زبان اور نغمہ زن ! یاد نہیں کتنی مرتبہ  
 کراچی مردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کوہا سہ کی چادر کو ہٹا کر میں نے فطرت کی ہے، نہ معلوم کتنی مرتبہ آتشیں گریبوں میں اپنی  
 پیاسی اور حسرت بھری لالندہ آنکھیں میں نے آسمان کی طرف اٹھائی ہیں۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ موسم گل میں عطر بیز نیم بہا رہے ہیں  
 بے حس جسم میں منہنی ڈال دی ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے میں لاغر اندام ہو رہا ہوں۔ میرے چہرہ پر جھڑپاں پڑ گئی ہیں۔ جسمانی تاثرات  
 سے میں بے پروہ ہو گیا ہوں۔ میری پتیاں گر گئی ہیں۔ سردیاں اور گرمیاں دونوں میرے لئے یکساں ہیں۔ لیکن بہار ! اس  
 کے تصور میں ہی ایک ایسا جادو ہے، اس کے تخیل میں ہی ایک ایسی کشش ہے کہ میری ان بے حرکت رگوں میں نئی زندگی کی جلی دوڑ  
 لگتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک اندہ گیس پشیمانی خون کی ایک ایک بوند میں گھر کر لیتی ہے  
 بہار ! یہ لفظ کتنا سوغوار ہے اور کتنا جان سپار۔ جب حد نظر تک راتوں رات لالندہ اکنول کھل جاتے تھے اور میں اپنے  
 آپ کو بھولوں کے ایک ناپید اکنا ر سمندر میں کھڑا پاتا تھا تو یہ محسوس ہونے لگتا کہ جہاں رنگ و بو میں سورج نئی شان کے ساتھ  
 جگمگا رہا ہے۔ اس شان کے ساتھ کہ اس میں تپش نہیں صرف چاند کی جلالت رہ گئی ہے۔ پیادہ نول مسرت اور احسان سے  
 چھلکنے لگتا تھا۔ لیکن اس احسان میں اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وہ مسرت اس روحانی سود کو دیا نہ سکتی تھی جو تمناؤں کے ساتھ پر ہوش



پتیوں کی خاموشی جنبش! ان کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سوز نہانی کی سرگم ہے۔ اُف اتنا تند تو انا ہو کر بھی ایک شرمیلی بیل کے آگے میں کتنا مجبور ہوں

بہار، نسیم، گل، ولبل، آہ و زاری ——— رنگین خوابوں کا ایک میلہ! لیکن زندگی کی پت بھڑ میں بہار کی اُن محفلوں کو میں کیوں یاد کرتا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری دنیا ان سے محروم ہو چکی۔ اب میں ایک دوسری دنیا میں رہتا ہوں جہاں غنچہ نہیں چنچتے، جہاں ارمانوں اور حسرتوں کے سوا کچھ نہیں۔ وہ بھی ایسی کہ ان میں کیفیت و سرور نہیں غم و غصہ کی جھلک رہ گئی ہے۔ اب بھی میرے ارد گرد بہار ان میں زمین گل فروکش بن جاتی ہے اور ذرہ ذرہ فرط انبساط میں متوالا ہو جاتا ہے۔ میرا دل بھی بھر آتا ہے۔ لیکن اس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ دریائے حُسن کے بچ و بیچ کھڑا ہو کر بھی میں ایک لگاؤ محسوس کرتا ہوں گویا ستاروں سے مصروف گفتگو ہوں۔ جس محفل سے میں اُٹھا آیا اس میں شمول کی آرزو نہیں کرتا۔ میری تمام تر توجہات ایک دوسرے ہی جہان کی تعمیر کے لئے وقف ہوتی ہے جس کا تخیل میرے ناسوروں کو پرچاتا رہتا ہے۔ یہ بیل فنا پر حاوی اور ابد و بقا کی ندیم ہے۔ جب میں زمین کے دامن میں لیٹ جاؤں گا تو شاید وہ

میرے جسم سے لپٹی رہے گی اور اس کی باقی ماندہ طاقت کو چوستی رہے گی۔ ایک وہ دن تھا جب اس کا بیج ابھرا تھا اور میں جوان تھا۔ میرے سدا دل جسم میں مسرت کی اُمنگیں موجزن تھیں اور رُوح کا ایک ایک تار فطرت کے رباب کے ساتھ غزل خواں تھا۔ میری وسیع جڑوں کے وسط میں اس کے ننھے سے بیج نے سر نکالا۔ اس کی زرد کوہلوں نے سہارے کی التجا کی اور مایوس و ناکام مڑ جھانے لگیں۔ ہاں، اس وقت اسے گلے لگا کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ ایسی جیسے بچے کو گود میں لے کر باپ کو ہوتی ہے۔ ایک عرصہ تک اس کی بانہیں دل میں یہی جذبہ پیدا کرتی رہیں۔ لیکن چشم بد دور رفتہ رفتہ وہ ایک لے سا بچے میں ڈھلنے لگی اور اب اسے چھوٹے کے بعد وہ معصومیت اور شفقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس میں ایک ایسا عجیب بانگ پید ہو گیا جو میری آزادی پر بھندے ڈالنے لگا۔ جب کبھی کچھ سوچنا چاہتا تو اسی کی یاد آتی گو کہ اس یاد میں حیا بھی تھی اور کتنا بھی، غرض کے ساتھ اس ہر مرثیہ کی آرزو بھی، پیاس کے ساتھ سکون تھا اور لاگ کے ساتھ ایک لگاؤ۔ آج جس جذبہ کی گہرائیوں تک میں پہنچ چکا ہوں۔ ان دنوں اس کی سطح کو بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اس انقلاب پر میں ہمیشہ تصورِ حیرت بنا رہتا اور یہ حیرت بھی مسرت، نفرت، امتنا و اطمینان سے لبریز تھی۔

میرے قدموں پر ایک چھوٹا سا پتھر بڑا ہوا تھا جس پر گاؤں کی عورتیں اکثر سینہ در اور چندن ملا کرتیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کی نازک انگلیاں مجھ پر سینہ در کی ایک گہری لکیر کھینچ دیتیں۔ یہ بھی دیکھا کہ کوئی دوشیزہ بڑی سادگی سے میرے سنگین جسم کو اپنے سیسے بازوؤں میں لپیٹ لیتی، نرم ہونٹوں سے میرے آہنی تے کو بوسہ دیتی اور اس سنگ جبین کو آنسوؤں سے نہلا کر چلی جاتی تھی شاید اس سے اس کے قلبِ حزیں کو کچھ قرار ہو آتا تھا

دنیا بھی ایک درخت ہے جیسے حینانِ عالم اس بیل کی صورتِ دامِ بلایں گرفتار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھ پر

ان کے ناز و نیاز کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ ہاں جب کوئی بد بخت میرے دامن کو حقام کرنا سوؤں میں ڈوبی ہوئی آوازیں کہتی ”دیوتا میری مراد کب برائے گی“ تو میں بھی پیسج جاتا اور اپنے پتوں کو ہلکا کر کچھ کہنا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کہ جس اشاروں کو وہ سمجھتی تھی یا نہیں۔ میں سوچتا رہ جاتا کہ کاش بے گل و غنم برگد نہو کر میں پھولوں کا ایک پودا ہوتا۔ کم از کم اپنی بہرہ ریزی کا اظہار تو کر سکتا۔ جب حسن کی وہ صورت مجھے چھوٹی تو فرجھاٹے ہوئے پھول پھر کھل جاتے۔ اور اس کے قدموں پر انگبار برس کر گویا میرا پیغام پہنچا دیتے۔ لیکن دل ہی دل میں یہ منصوبہ باندھتا رہ جاتا اور وہ چلی جاتی

تاہم، ان کی قربت میرے جسم میں تھر تھری پیدا نہ کر سکتی تھی۔ میں ازسرنو پا کا پنے نہ لگتا تھا۔ لیکن کبھی جب کوئی دوشیزہ میری نازک اندام بے زبان بیل کی گوبیوں کو توڑ کر مجھ پر بکھیر دیتی تو میرے دل پر جھٹ لگتی تھی۔ لیکن جتنا غم و غصہ ہوتا اسے ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ جمال باری سے دل ہی دل میں میں فریاد کرتا اس اُمید پر کہ وہ رفح کی آواز کو پہچانتا ہے ”یارب اس عورت کو بھی اتنا ہی کرب و الم نصیب ہو“ وہ بیچاری مجھے دیوتا مان کر پھولوں کی نذر چڑھاتی اور اسے میں بد عادت۔ محبت کے نشہ میں میں مہوش تھا۔ حتیٰ کہ عقل و خرد سے بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ کتنی عجیب و غریب تھی وہ محبت؟ کاشکہ میں جانتا ہوتا! کاشکہ میں جانتا ہوتا!!

لیکن کیا سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں اس دام میں گرفتار نہ ہوتا؟ گو کہ یہ بیل آج میرے جسم کے ایک ایک بند پر حاوی ہو چکی ہے تاہم اس کا مس میرے لئے کتنا دلولہ انگیز ہے۔ محبت آئینہ کی طرح شفاف ہوتی ہے۔ ہر آدمی اس میں اپنا عکس دیکھتا ہے اور ایک بار چور چور ہو جاتے کے بعد یہ آئینہ کبھی ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ متواتر کوشش کے بعد اس کے ٹکڑوں میں یکجائی ہو جائے لیکن وہ صفائی کہاں سے آئے گی؟ آئینہ میں ہمیشہ کے لئے بال پڑھاتا ہے۔ عشق وار بہ واد رہتا ہے، پیہم ناکامیوں کے بعد بھی اُفت نہیں کرتا۔ لیکن وہ کمال درجہ خود دار اور غیور ہوتا ہے۔ صرف ایک جھڑکی اس کی شمع زندگی کو گل کرنے کے لئے کافی ہے۔ آج یہ بیل میری زندگی میں اتنا داخل حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اس کشش میں عشق کا جزو بھی نہیں۔ یہ بیکلی عشق کی پر تو نہیں بلکہ اس کی یادگار ہے اور بس

داستان محبت کی جب ورق گردانی کرتا ہوں تو دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔ محبت سے جو اُمیدیں وابستہ تھیں وہ سب تشنہ تکمیل رہیں اور اس کا سزاوار میں ہرگز نہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے مجھے، اس ”اعز بیل“ سے اور مجھے دیوتا سمجھنے والی ان الطہرہ عاتقوں سے انصاف نہیں کیا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے کسی حق سے ————— ایسا حق جو ناقابل بیان ہے ————— محروم کر دئے گئے۔ جب یہ خود فریبی چٹکیاں لینے لگتی ہیں تو آواز دہکتی ہے کہ کاش میں درخت نہ ہوتا انسان ہوتا۔ ایک دائرہ میں زندگی محدود نہ ہوتی، اپنی پرچھائیں

کو ناکستے ناکستے میں یوں بڑھاتا ہو جاتا۔ میری زندگی بھی روال، دوال، اور جان ہوتی تاکہ محبت کا اظہار کر سکتا اور — اس طرح بے زبان و بیقرار نہ ہوتا!

لیکن کیا قلب انسانی میرے جذبات کا احساس نہیں کر سکتا؟ کیا انسان کی محبت اتنی مختلف ہے؟ کیا اس کی فریاد کی کوئی لے ہے؟ کیا اس کے نالوں میں کوئی سنے ہے؟ کیا میرے جذبات کی ترجمانی کے لئے وہ گہری سانس کافی نہیں جو طوفان کی آملکاتہ دیتی ہے؟ کیا انسانوں کی دنیا میں بھی محبت کا بھول اندھیرے میں کھلتا اور مرجھاتا نہیں ہے؟ کیا ان میں بھی محبت کی انتہا یہ نہیں ہے کہ گفتگو کے لئے الفاظ ناکافی ہوں اور صرف سانسوں کا اتار چڑھاؤ جان مسمیٰ میں ارتعاش پیدا کر سکے؟ کیا ان میں بھی مسئلے کے بعد پیشامانی اور فریاد کے بعد شرمساری پیدا نہیں ہوتی؟ ندی کی طرح انسان ہیونہ گردش میں ہے اور ہم پہاڑ کی طرح اچل ہیں۔ لیکن ہم اس سے کہیں زیادہ عمر دراز اور مستقل ہیں۔ انسان کی محبت ایک شمع ہے جو بجھنے کے لئے روشن ہوتی ہے۔ ہماری محبت کی مثال جگنو سے دی جا سکتی ہے جو تا عمر جلتا ہے اور بعد از مرگ بھی روشن رہتا ہے

ایک زمانہ گزرا۔ ان دنوں مجھے اس ”اہریل“ کی ناز برداری سے فرصت نہ تھی۔ اول اول اس کے بوسوں میں مجھے ایک لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور اس نئے جذبہ کے اسباب و اثرات معلوم کرنے میں میں اتنا محو تھا کہ گرد و پیش سے قطعاً بے نیاز ہو گیا تھا بھولے بھٹکے اپنے ماحول پر ایک آدمہ نگاہ غلط انداز ڈال دیا کرتا تھا۔ میں جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں وہ روز پیش آتا تھا اور اس سے باخبر ہوتے ہوئے بھی میں بے خبر تھا۔ تاہم نادانستہ طور پر یہ حادثہ مجھے ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا کہ اسے میں آج تک نہ بھول سکا

جو محبت میری قدم بوسی کر رہا تھا، اس کی پوجا کے لئے صد ہا عورتیں آتی تھیں۔ روز کوئی پُرانی پُچارن غائب ہو جاتی اور اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی نئی حُسن کی دیوی آ جاتی تھی۔ یہ نئی دیوی شرم کے بارے سے دہی جاتی تھی۔ نرگسی آکھیں زمین میں گڑی جاتی تھیں اور رُخ پر نور تار نقاب کے اندر بھی عرق عرق ہو جاتا تھا۔ مجھے بے جان سمجھ کر وہ کبھی میرے جسم کا سہارا لیتی اور کبھی اپنے ناخنوں سے میرے تن کو کُڑید کرتی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکتا اور میں گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتا کہ مبادا وہ سہم نہ جائیں۔ ایک لمحہ کے بعد نقاب ان کے رُخ روشن کا پردہ دار بن جاتا، بھولوں کے ہار ان کے بیدار جذبات کو تھپکیاں دیتے اور چھانگل کے گھونگرواں پیروں کو چوم کر رقص کرنے لگتے تھے

ان ہوشوں میں سے ایک کا وتیرہ سب سے جدا تھا۔ شکا میں سیمے سب سے چھپکر وہ میرے پاس آتی اور سر جھکا فوراً چلی جاتی تھی۔ اس خوف سے کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ زیبائش سے وہ اتنا ہی دور تھی جتنا کہ چاند۔ نہ اسکا

جیس پر ”کم کم“ ہوتا نہ پیروں میں جھاگل۔ اس کی سادگی سفید ساری سے یوں چھن چھن کر نکلتی تھی جیسے بنت البحر نے ہینگ آسمانوں سے سر نکالا ہو یا دو خیزہ صبح سفید بادلوں میں تیر رہی ہو۔ اس کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ کبھی وہ صبح میں آتی کبھی دوپہر میں اور کبھی دونوں وقت لے۔ جب وہ شام کو آتی تو اسی ”امر بیل“ کو تمام کر میری مٹی جھاؤں میں بیٹھ جاتی جب تک سورج شرب کے محل میں آرام کرنے نہ چلا جاتا وہ اپنی ہر حسرت نگاہوں سے اس منزل نام تمام کو ناکا کرتی۔ لہرائی ہوئی پگڈنڈی کی خاک شفق کے پرتو سے لالہ گوں بن جاتی جیسے خونِ تنہا کی سرخی ابھرتی ہو

ماضی ناکامیوں کا آماجگاہ اور مستقبل امیدوں کا آئینہ ہے۔ ماضی افسردگی کے قلم سے اس کے چہرہ پر ناکام آرزوؤں کے افسانے لکھا کرتا۔ جب اس کے سینہ سے گہری سانسیں نکلتیں تو میرے پتے بھی ضبط نہ کر سکتے اور ہیمن جیج اٹھتے تھے۔ کبھی اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور نہ اس نے کوئی دعا مانگی۔ ہاں گاہے گاہے وہیں بیٹھ کر وہ کچھ گن گنا تی ضرور تھی لیکن ان نغموں کو میں نہ سمجھ سکتا تھا

پہلے تو میری توجہ اس کی طرف منحطف ہی نہیں ہوئی لیکن شام کے سنائے میں جب وہ عموماً دہر گزرنے لگی تو میری دلچسپی بھی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ سورج کے ڈھلنے ہی میں بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگتا اور اس کے آئے میں جتنی تاخیر موزنی ہولِ دل اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ خلاف معمول ایک روز وہ نہ آئی تو میں دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ دامنِ مغرب میں سورج تے منہ چھپا لیا، لیلائے شب نے نقاب سے سر نکالا، ستاروں کی انجمن منعقد ہوئی چاند کی کرؤں نے اپنا ساز چھیڑا، لککشاں نے آسمان پر بچلیاں بکھیر دیں۔ پھر بھی وہ نہ آئی!

دودن، تین دن، سیکڑوں ہزاروں دن آئے اور چلے گئے لیکن وہ نہ آئی یہاں تک کہ میں نے اس کے انتظار سے منہ موڑا اور اپنے منتشر جذبات کا مخزن اسی باوقا ”امر بیل“ کو بنانے کی کوشش کرنے لگا

میں اسے بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ آگئی۔ ایک ہیبت ناک خواب کی طرح۔ وہ دن بھی مجھے یاد رہیگا گھنگھو ریاد دل چھپائے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی تھی۔ بادند کے جھکولے کھا کھا کر ”امر بیل“ تھر تھرا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے کس پہلو میں جگہ دوں۔ بیکایک دیکھا کہ اسی خاک آلود راستہ پر وہ تیزی سے چلی آرہی ہے۔ لیکن وہ بدل چکی تھی۔ وہ جمالِ جاں آنا بونے گل کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ چہرہ پر اتنی جھریاں تھیں گویا عمر رفتہ نے اپنی آستینوں کو چننا ہو آنکھوں میں حلقہ پڑ گئے تھے۔ ہونٹ سوکھ کر لٹک گئے تھے۔ جب میں نے دونوں تصویروں کا مقابلا کیا تو وحشت کی ہونے لگی

الہی! حسن کو فنا ہے تو عشق کو لا دال کیوں بنایا؟ قریب اگر نہ اسنے اپنے باندھے نہ سر جھکایا اور نہ اس بیل کا سہارا لیا۔ ایک مرتبہ چاروں طرف دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ پڑی اور نارِ دار روئے لگی۔ آہ! میں اس کے گہت سننے کا آرزو مند تھا۔ آنسوؤں کی زبان کو میں کیا سمجھ سکتا

میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک ساری باندھے ہوئے ہے۔ جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی تھی۔ بال بکھرے ہوئے بیرخون میں رہنے ہوئے، جسم نازنین خاک آلودہ، روتے روتے وہ کہنے لگی ”دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا۔ انسانوں کے رحم و کرم سے میں محروم ہو چکی۔ میں نے یونانی کی، احسان فرموشی کی — کس اُمید پر؟ محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ محبت؟ فریب، مکر، دھوکا! اس ظالم نے مجھے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا۔ مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے۔ دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامن عاطفت میں جگہ دو گے۔ جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہ عظیم کا بار لے آئی ہوں؟ میں ایک ایسے بچہ کی ماں ہوں جس کا باپ بننے کے لئے کوئی مرد طیار نہیں۔ دیوتا! کیا تم میرے گناہوں کو درگزر کرو گے؟“

اس کی فریاد میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اپنی ہمدردی کا اظہار کس طرح کروں۔ کاشکہ شبنم کے کچھ قطرے ہی ٹپک پڑتے جن پر اُسے میرے آنسوؤں کا گمان ہو جاتا

نقاہت کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ بہکوش ہو کر گر پڑی۔ کئی گھنٹے گزر گئے اور وہ اسی حال میں پڑی رہی۔ بعد ازاں اس کا جسم کیباگی لڑا اور پھر اٹھنے لگا۔ وہ خواب میں بد بدلتے ہوئے ”کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا نے ہی پیدا کیا تھا؟ اور اس بچہ کو؟“ اس بچہ کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے؟ خیر میں سہی لیکن میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائے گا۔ خدا رحیم و کریم ہے — شاید مردوں کے لئے لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے؟ — خدا، جنت، روح، دنیا، عاقبت، سب مردوں کے لئے — آہ میرا بچہ! میرا بچہ!!“

آسمان پر ستاروں کو نیند آنے لگی۔ مشرق میں صرف ایک ستارہ جگمگا تارہ گیا۔ نیم صبح کی خشکی تیز تر ہو گئی۔ شب کی سیاہی اور بھی گہری ہو گئی۔ اسی عالم سکون میں یکا یک ایک روح فرسا چنچ اس کے سینہ سے نکلی۔ اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی ساری کو تار تار کر ڈالا اور پھر گر پڑی۔ ایک ہچکی اور ایک چنچ — کتاب زندگی کی یہ تفسیر تھی وہ مر چکی تھی جب سورج کی روشنی پھیلی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے سامنے برہنہ پڑی ہے۔ اس کا جسم زرد ہو گیا تھا، ناخن نیلے پڑ گئے تھے، بازو میں سہمی ہوئی ساری پڑی تھی جس پر ایک بچہ کی خون آلود لاش رکھی ہوئی تھی۔ برسات کے پانی میں یہ خون دور تک بہہ نکلا تھا اور آس پاس کی مٹی پر ایک سُرخ تہہ پڑ گئی تھی

جذبہ محبت کی یہ مثال تھی جس کی حقانیت اور عظمت کے متعلق انسان عجیب و غریب باتیں کہا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرا قباس غلط ہو، ممکن ہے کہ محبت کے غلط مشاہدات نے میرے خیال کو بھی ناقص بنا دیا ہو۔ کیا یہ دو پایہ جو اپنے آپ کو انسان کہتا ہے اتنا شفیق القلب اور سیاہ باطن ہو سکتا ہے؟ اس خیال سے میں اپنے آپ کو باز رکھنا چاہتا ہوں لیکن جب یاد کرتا ہوں کہ میری جڑیں ان دو بے گناہوں کے خون سے پہنچی گئی ہیں جنہیں انسانیت نے محبت کی قربانگاہ پر بے نیست چڑھایا تھا تو میں حیوانیت کو اس پر فوقیت دیتا ہوں اور اپنی قسمت کو سراہتا ہوں کہ انسان نہ ہوا۔ وہ دونوں

بلے گناہ محبت پر قربان ہوئے یا سوسائٹی کے رواج پر یا مرد کی خواہشات نفسانی پر؟ وہ عورت بے گناہ تھی۔ وہ محبت رزنا چاہتی تھی لیکن اسے دھوکا ہوا۔ وہ مرد کی ناپاک ہوس رانی کی شکار ہوئی لیکن جب اس کی محبت پاک تھی تو اسے مجرم کیوں قرار دیا گیا؟ وہ خود نفس پرست نہ تھی۔ اس ظالم سوسائٹی کو اس معصوم بچے نے کیا نقصان پہونچایا تھا؟

انسان دراصل کس سے محبت کرتا ہے۔۔۔۔۔ اپنی خودی سے یا عشق سے؟ اپنے پسندیدہ جذبات اور توہمات کی مجسمہ صورت سے محبت کرتا ہے یا محبت پر اپنی خودی کو فنا کر دیتا ہے معلوم نہیں! جو بھی ہو، انسانیت کے دعویٰ محبت کی حقیقت خون کی وہ بوندیں ہیں جن کی آڑ میں زندگی مسکرا رہی ہے

کبھی کبھی شام کو جب پرندے اپنے آشیانوں میں پرسمیٹ لیتے اور اندھیرے کے خوف سے فطرت، ایک گہری سانس لینے کر خاموش ہو جاتی تو عالم تنہائی میں یکایک مجھے محسوس ہوتا کہ میری زندگی۔۔۔۔۔ اتنی طولانی زندگی یونہی برباد ہو چکی ہے۔۔۔۔۔ اس امر بیل کی گرفت میں عجیب لطیف درد پہنا ہوا ہے۔ ایک درد ہے میٹھا میٹھا، ایک ٹیس ہے دلنوا، اس احساس کو مٹانے کی میں لاکھ کوشش کرتا ہوں مگر بے سود۔ بربادی کا یہ احساس، زندگی کی یہ تنہا، کسی تصور پر مرتبے کی یہ آرزو، کسی دوسرے خیال کو دلنشین ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ میں چاہتا ہوں اپنی ہستی کو قدرت کی لا محدودیت میں گم کر دوں، کبھی نہ سوچوں کہ زندگی لا حاصل اور بے معنی ہے، ایک مرتبہ از سر نو شباب پر ور اور نازہ دم ہو جاؤں۔ مگر کجا پیرا نہ سال برنگد کا ایک ٹھونٹھ“ اور کجا قدرت کا اٹل قانون! میں بولنا چاہتا ہوں لیکن زبان سے محروم ہوں، چلنا چاہتا ہوں لیکن پیر نہیں۔ آہ! میں رونا چاہتا ہوں لیکن آنکھیں کہاں سے لاؤں میں چاہتا ہوں کسی سے محبت کروں، ایسی محبت جو ہمیشہ حیات نازہ بخشے اور کبھی نہ مر جائے۔ لیکن میرا جو مجھے تسلیم و نیاز سے روک لیتا ہے، اور عشق کی بارگاہ پر جبیں سالی کا موقع نہیں دیتا۔ یا تو میں انظار محبت سے ہی قاصر ہوں اور یا شرم لبوں پر مہر سکوت لگا دیتی ہے

میرے ذہن میں کسی کی یاد کا دھندلا سا خیال رہ گیا ہے۔ لیکن وہ یاد واضح نہیں ہے۔ صرف ایک نقش ہے وہ بھی ناکام آرزوں کی راکھ میں دبا ہوا۔ جس طرح کھڑے شمع روشن نظر نہیں آتی لیکن اس کی کرنوں میں جگمگاتی ہوئی اشبنم کی بوندیں دکھائی پڑتی ہیں اسی طرح وہ یاد بذات خود پس پردہ ہے اس کا ایک نقش باقی ہے۔ اتنا تو معلوم ہے کہ میری محبت کا ہمہ گیری اور وسعت سے ایسا تعلق ہے لیکن تعلق کیا تھا یہ یاد نہیں آتا

ایک دوسرا واقعہ یاد آتا ہے جس نے کسی زمانہ میں میرے دل کی دنیا کو منور کر دیا تھا لیکن وہ روشنی گویا بجلی کی تھی جس نے میری آنکھوں کو ایک عرصہ کے لئے خیرہ کر دیا

میرے قریب ان دونوں لاشوں کے برآمد ہونے کے بعد شاید لوگ مجھ سے ڈر گئے تھے۔ اب نہ وہ بت شرمندہ برتنش ہوتا اور نہ میرا جو تیرہ سجدہ گاہ قرار پاتا۔ بھولے بھٹکے اگر شام کو کوئی راہ گیر ادھر سے گذرتا تو سہمی ہوئی نظروں



سے دائیں بائیں دیکھ کر میرے سایہ سے بچتے ہوئے تیزی سے نکل جانا۔ دن میں کچھ گستاخ لڑکے دور کھڑے ہو کر میری طرف پتھر پھینکتے اور بھوت بھوت کا شور مچایا کرتے۔ ان کا مطلب میں صاف صاف تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اطوار میں حقارت اور نفرت کے آثار دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوتا تھا۔ کیا انسان کی عبادت بھی اتنی ہی پادر ہوا ہے جتنی اس کی محبت؟ زیادہ عرصہ نہیں گزر جب میں ایک زمانہ کا سجدہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میرا سنگ آستان اس گاؤں کا سنگ جبیں بنا ہوا تھا۔ حسینان عالم بصد شوق میرے آگے سر جھکا کر اپنے دُکھ درد کا مداوا مانگتے تھے گویا میں ان سب لوگوں کا تنہا مشکل کُشا تھا۔ حالانکہ میں ان کے آلام کا سد باب نہ کر سکتا تھا۔ تاہم اپنی خاموش زبان سے میں ان کی غمگساری تو کرتا تھا۔ میں بے حس اور بے زبان تھا لیکن اس سے میری توقیر پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ لیکن مقام حیرت جو کہ جیسے ہی اس دکھاری نے میرے پاس آکر اپنی مصیبتوں کا خاکہ کر لیا تو گویا میری ساری وقت بھی اس کے خون میں دھل گئی۔ کیا ان تمنائوں اور دعاؤں میں صداقت کی ذرا بھی بود بستی؟ اس روز بہ جلا کر انسانیت کو درہل کون سامریں لاحق ہو گیا ہے۔ لیکن اس احساس نے بھی مجھے تجس اور ناپاک بنا دیا ہے جب میں درد کے احساس سے نابلد تھا تو کتنے مریض آتے تھے۔ اب جو میں اس عالمگیر مرض کا علاج معلوم کر چکا ہوں تو کوئی میرے قریب بھی نہیں آتا اور اس طرح یہ احساس میرے لئے جان لیوا ہو گیا ہے! عبادت اور محبت میں کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ محبت ... روشنی ہے، عبادت تاریکی میں روشنی کی جستجو ہے محبت اُمید ہے، عبادت نا اُمید یں امید کی تلاش ہے محبت دریا کی پُر سکون روانی ہے، عبادت تلاطم خیز سمندر میں ساحل کی تلاش ہے۔ میں محبت کو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ زندگی ہے۔ میں عبادت کو نہیں سمجھنا چاہتا کہ وہ موت کا گیت ہے

’خزاں بہ گشتی تھی میں شوخی بہاراں میں‘

رفتہ رفتہ جنون و جفت کا یہ دور گزر گیا اور میں از سر نو جوان ہونے لگا۔ میری کوپلیں ہری ہونے لگیں اور شاخوں میں شباب کی کچ ادا کی آئے لگی۔ میرے برکشہ جذبات میں امید نے نئی تازگی پیدا کر دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا ہر برگ و شجر امید کے ترانے الاپ رہا ہے اور زمین سے آسمان تلک ہر شے موسیقیت کے نشہ میں متوالی ہو گئی ہے شہرت کی زندگی طویل نہیں، وہ نیک نامی پر محمول ہو یا بدنامی پر۔ اس روز میں نے اپنی توقیر کو خاک میں ملے دیکھا تھا آج یہ کلنگ کا ٹیکہ بھی مٹ گیا۔ عزت کا ستون ایک لمحہ میں سمار ہو گیا تھا دوبارہ اس کی تعمیر میں کئی سال لگ گئے بارے آج وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ اب راہ گیروں اور سیلانیوں کے غول بے خوف و خطر میرے قریب آنے لگے۔ گو کہ وہ میری پوجانہ کرتے تھے ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر لا پر دہی سے میرے سایہ تلے بیٹھ جاتے تھے گاؤں کی عورتیں بھی میرے پاس بیٹھنے لگیں گو کہ وہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں۔ یا تو یہ توافل تھا یا غرور حسن بہر کیف میں خوش ہوتا تھا کہ پسماندگی میں اپنے سایہ کی ٹھنڈک سے انھیں کچھ دیر سکون تو پہنچا سکا۔ اور

تو اور بھی رزکیاں بھی میرے بدمعاش چنے لگیں ان کے دل میں نہ عزت تھی نہ حقارت ان کے لئے زندگی ایک رقص شرارت تھی اور بس! آہ میرے ڈنٹے ہوئے منہ کی تمیز از سر نو ہوئی تھی لیکن یہ وہ مندر تھا جس سے مورت غائب ہو گئی ہو اور لوگ اس سے سراسرے کا کام لینے لگے ہوں

قسمت نے پھر ہلکا کھایا جب مشرق کی دادیوں سے دھیرہ صبح آنکھیں ملنے نکلتی تو میری بلندیاں کوئل اور پیہوں کے ساتھ غزل خواں ہو جاتیں۔ نسیم صبح کی جمال آرائیوں کو دیکھ کر میرے پتے فرط انبساط میں لرزے لگتے۔ کنوئوں کے پھولوں کی خوشبو ہواؤں کو مستانہ بنا دیتی۔ جب ساری دنیا بے یک وقت تمام تر رنگینیوں کی جلوہ گاہ بن جاتی تو ”وہ“ آتی اور ان کھیتوں میں دیر تک چہل قدمی کرتی جن میں نیند کی ماتی کلیاں جاگنے کی کوشش کیا کرتی تھیں جب آفتاب کی گستاخ کروں کے پوسے اس کے رخساروں کو لالہ زار بنا دیتے اور اس کے لب پر پسینہ کی بوندیں شبنم کے قطروں سے چشمک زنی کرنے لگتیں تو وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوتی۔ اس کی سج دھج بھی زرا لی تھی اب تک میں نے کسی حسین میں یہ انداز نہ دیکھے تھے۔ یا تو اس کا لباس آسمانی ہوتا یا زمینی اور ناگن لٹیں ہمیشہ لہراتی رہتیں۔ اور انڈر رے دبدہ دلیری! اس کی نگاہیں کبھی نگوں نہ ہوتیں ہمیشہ سامنے کی طرف تانکتیں۔ ان میں جھجک کا نام نہ تھا ان میں ایک برق تجلی پنہاں تھی جو دیدار عام کی دعوت دے رہی تھی۔ شوخی اور جادو کی لالانتہا بجلیاں جو کیف اور پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں گویا وہ عشق کی دنیا سے پوچھ رہی تھی کہ اگر تیری باندیوں کو توڑ دوں تو کیا ہو

جب وہ میرے پاس بیٹھ جاتی تو اس کے چہرہ کی جولانی اور تابانی کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ اس کا دل خوشی سے لہر بڑھتے میں سوچنے لگتا کہ ایسی کونسی بات ہو سکتی ہے جس کا تصور اتنا خوش کن اور جاں نواز ہو اکثر وہ ادھر آتی اور گھنٹوں عالم غفلت میں مسرت کے طلسم گرہا کرتی اور مجھے کبھی اس خوشی کا راز نہ معلوم ہوتا

لیکن یہ عقدہ کب تک حل نہ ہوتا۔ جیفت جس پھوٹے دیوتا کی عبادت میں بیٹے عمر گزار دی تھی یہ فریب خوردہ بھی اس کی ہی بچارن تھی۔ دریاے محبت میں اس نے بھی زندگی کی ناؤ ڈال دی تھی کیا درحقیقت اسے ساحل کا پتہ مل گیا تھا کیا وہ تناؤں اور حسرتوں کے بھڑور سے نکل چکی تھی اب میں ان ہی گورکھ دھندوں کے سلجھانے کی کوشش کرنے لگا ایک روز اسی راستے سے میں نے ایک نوجوان کو آتے دیکھا اب تک یاد ہے ہاں خوب یاد ہے۔ اس نے بچارن کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے اور وہ مسکرائی تھی۔ آہ وہ مسکراہٹ!

ان دونوں کی ملاقات سے مجھے ایک دلچسپ تجربہ ہوا جسے یاد کر کے اس بڑھاپے میں بھی میں ہنسا کرتا ہوں۔ انسان بلائے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اپنا انداز تکلم بھی بھول جاتا ہے۔ وہ شاعری اور موسیقی کی دنیا میں بھٹکا کرتا ہے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں جنہیں تم بے جان نہیں سمجھ سکتے۔ آنکھیں اٹھتی ہیں جھپکتی ہیں اور جھجک جاتی ہیں۔ کاشکہ میں جانتا ہوتا! کاشکہ میں جانتا ہوتا!

ایک عرسہ تک حجاب اور نظارہ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ کبھی فوجوں پہلے آتا۔ اور زیر لب کچھ گنگنا یا کرتا۔ گو میں اس کی آواز نہ سن سکتا تھا لیکن اس کی خود فراموشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ جب وہ پہلے آتی تو کھیتوں میں ٹٹلنے لگتی اور کبھی کبھی اس سے بھیگا ہوا ایک آدھ تنکا اٹھا کر اپنے دانتوں کو کریدنے لگتی

اب تک مجھے وہ دن یاد ہے۔ وہ نور کے ترے کے آئی اور دو پہر تک بیٹھی رہی جب میں اس کے اضطراب کا تصور کرتا ہوں، اس غلش اور تپش کو یاد کرتا ہوں تو دل میں ایک کھٹک سی ہوتی ہے۔ عشق اپنا خراج مانگتا تھا آنسوؤں کی صورت میں اور غرور و تکبر کی ضد تھی کہ ان کی بات رہے۔ آنکھوں میں بار بار آنسو ڈبڈباتے تھے لیکن سوکھ کر وہیں رہ جاتے تھے تھک کر میرے گھنے سایہ میں اس ”امر بیل“ کو لپیٹ کر وہ بیٹھ گئی دو پہر تک وہ بیٹھی رہی — لیکن وہ نہ آیا

آہستہ آہستہ اس کی پریشانی دور ہو گئی۔ اب انتظار تھا اضطراب کا نام نہ تھا۔ انجام کار وہ اٹھی اور چلی گئی جاتے جاتے وہ کہنے لگی — مجھ سے یا اس ”امر بیل“ سے، اپنے آپ سے یا کسی نامعلوم آدمی سے کہہ نہیں سکتا۔

وہ کہنے لگی ”ٹھیک ہوا۔ اس محبت کا انجام بھی یہی ہوا تھا۔ اگر فرض منصبی کو بھول کر راحت کی جستجو ہی محبت کا حاصل ہوتا تو کیا ہوتا؟ میں اپنے جذبات اور احساسات کو ظاہر نہ کر سکی لیکن اس سے کیا؟ میرے دل میں جو کچھ تھا اور ہے۔ اس سے میری زندگی روشن ہو گئی۔ محبت مجموعہ ہے رنج و راحت کا، ہجر و وصال کا، اضطراب و مسرت کا۔

محبت ضدین کی گود میں پھولتی پھلتی ہے ورنہ محبت کتنی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی“ وہ اٹھی اور چلی گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی کے دائرہ سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کی خود فراموشی کو میں عمر بھر نہ بھولوں گا

اس داستانِ غم کے ساتھ میری رام کہانی بھی ختم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ محبت انسانی کے میرے مشاہدات بھی ختم ہو گئے۔ سالہا سال جس سرابِ صحرایہ جستجو میں میں سرگرداں تھا اس کا جواب مجھے ایک سوال کی صورت میں ملا ”وہ نہ

ہمارے محبت کتنی بے معنی اور بے کیف ہوتی“ جس حقیقت کو میں ہنوز نہ سمجھ سکا تھا۔ ایک عورت نے ایک لمحہ میں اس کا پتہ دے دیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ محبت کا پودا تنہائی اور تاریکی میں نشوونما پاتا ہے۔ روشنی آتے ہی وہ مر جاتا ہے۔

عشق کو ظاہر کیوں کیا جائے رسوائی کی آگ میں اسے کیوں جلایا جائے۔ میں اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا جس سے زندگی تشنہ تکمیل رہ گئی — لیکن اس سے کیا؟ اس خود فراموشی کا ایک لمحہ بھی تمام زندگی کے بارِ غم کا کفارہ

ادا کر دے گا

میں دیکھتا ہوں کہ دنیا میں دو عظیم اشیان طاقتوں میں تنازع ہو رہا ہے۔ یہ طاقتیں باہم متضاد نہیں ارتقاء کے دو مختلف راستے ہیں ان میں ایک طاقت ترکیبی ہے۔ گل و بلبل، چاند اور چاندنی، شب اور تاریکی، شفق اور روشنی کی ہم آہنگی میں یہ طاقت نمایاں ہوتی ہے۔ دوسری طاقت تخریبی ہے۔ طوفان میں درختوں کو توڑ کر، برق بجاتا

خرمین کو جلا کر، آگ اور خون میں بربادی کے نشان چھوڑ کر وہ اپنی موجودگی کا ثبوت دیتی ہے۔ گاہے گاہے یہ دونوں طاقتیں کسی واقعہ میں اتنے عجیب طریقہ سے آپس میں گھل جاتی ہیں کہ ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی۔ ہماری محمّد و عقل حیران رہ جاتی ہے۔ شاید محبت بھی ایسا ہی واقعہ ہے

یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اتنے وسیع تجربات اور عمیق علم کے باوجود میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ نہ میں کسی کا ہوں اور نہ کوئی میرا۔ میں دوستوں کی تمنا کرتا ہوں لیکن ایک بے حس اور بے جان درخت کے لئے دوست کہاں ہیں، علمگرا اور بہم کہاں ہیں۔ ممکن ہے کہ پہاڑ کو کبھی کسی سہارے کی ضرورت نہو۔ لیکن چارہ سازی اور آشنائی کی تمنا دل کی گہرائی سے نکال پھینکنے کی جرأت میں اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ تو بھی میری وسعت اور عظمت سے لوگ بے حدم عوب ہو جاتے ہیں اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی ہمدرد کا انتظار میرے لئے کتنا صبر آزما ہے۔ میرے چاروں طرف قدرت ارتقا کی بلند یوں پر ہمدردی اور محبت کی سیر پھیوں سے چڑھتی جاتی ہے اور میں تنہا بے چارگی کی حالت میں کھڑا یہ تماشا دیکھا کرتا ہوں

لیکن اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ مجھے اس فریاد کا کوئی حق نہیں۔ یہ سچ ہے کہ میری تمام خواہشیں پوری نہیں ہوئیں۔ کئی نعمتوں سے محروم رہ گیا۔ لیکن جو کچھ حاصل کیا وہ اس زندگی کے لئے کافی ہے۔ صد ہا بار دنیا کو بہار کی رنگیلیں میں شرا بور دیکھا ہے۔ ہزاروں آدمیوں نے میری قدیم ہوس کی ہے اور بے شمار نازنیموں نے مجھے اپنا راز داں بنا یا ہے۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ اس ”امریل“ کے بوسہ میں مجھے بہار کی مدہوشی، برسات کی سحر و بروری، خزاں کی گرمی، اور سلا کی تندگی کا لطف یہ یک وقت نصیب ہوا ہے۔ اس کی جانکاہ گرفت میں تڑپ تڑپ کر میں نے آدوی کی مسرت حاصل کی ہے۔ صرف ایک کھٹک دل میں باقی رہ جاتی ہے جو ہمیشہ روح کو ہٹو کے دیا کرتی ہے۔ وہ یہ کہ میں بے زبان رہ گیا! میری تمنا ایک معنی بے لفظ ہو کر رہ گئی۔ لیکن غور کرنے کے بعد یہ خیال مجھے دلاسا دیتا ہے کہ میں ہی نہیں ساری دنیا بے زبان ہے

جب اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے تو میں انسان کی بے چارگی پر نظر ڈالتا ہوں۔ جب سوچتا ہوں کہ قدرت نے محروم لظف رکھا۔ مجھ پر ظلم کیا تو یاد آتا ہے کہ میں خود بھی تو اس دنیا کی ”زبان بے زبانی“ کا ایک خاموش نمائندہ ہوں

اختر حسین (راے پوری)

ضرورت ہے

منجر نکار لکھو

نکار جنوری و جون و اگست کے پرچموں کی۔ جو صاحب مٹھہ کرنا چاہیں اطلاع دیں

# وحی کی حقیقت علمی نقطہ نظر سے

(سلسلہ سابق)

قرآن کی عبارت پر مروجہ بحور میں سے کسی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور نہ عروض کے اصول اس سے مطابقت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اور صرف اس لحاظ سے اس کا دعویٰ کہ یہ شاعر کا کلام نہیں بجا ہے۔ اور اسی لئے ”شاعر لا مجنون“ کہہ کر اس کی تردید کی گئی ہے کیونکہ عرب خواہ شاعر کی کتنی ہی قدر کرتے ہوں مگر اس کو پیغمبر یا ہادی سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے بنا براں ایک سوشل مصلح کے مقاصد کے خلاف ہوتا اگر اس کی تبلیغ کو شاعری پر محمول کیا جاتا۔ علاوہ بریں قرآن کا ایک معتد بہ حصہ نثر ہے اور بعض مقامات پر فنِ خطابت کی سی تکمیل پائی جاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے لیکن یہ خیال کہ رسول اللہ کے معاصرین کا ان کے کلام کو سن کر کہہ اٹھنا کہ ”یہ انسان کا کلام نہیں“ اس امر پر شاہد ہے کہ اس وقت کے لوگ اسے واقعی خدا کا کلام سمجھتے تھے درست نہیں، کیونکہ اس قسم کے فقرے انتہائی تحسین کے لئے اس وقت بھی بولے جاتے تھے اور اب بھی اکثر زبانوں میں مستعمل ہیں (مثلاً سورہ قمر و سورہ رحمن)

ایک خطیب یا شاعر کی تصور آرائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محاکات اور استعاروں میں ہمیشہ مسلمات علمی سے کام لیتا ہے۔ اور اشیا کے معانی میں وسعت پیدا کرنا یا ان کے اطلاق کا دائرہ بڑھانا۔ اس کے حیطہ اعلیٰ سے خارج ہے۔ مثلاً قرآن میں آسمان، زمین، ستارے، مہرِ شمس و کمرِ سیار، عد و برق، خور و قصور وغیرہ بار بار استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان کے معانی میں پیشتر کی نسبت کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ آسمان کو ذات البروج کہنا بظاہر موسیٰ نظام اور اس زمانہ کے علم ہیئت کے مطابق خطیبانہ انداز بیان ہے، آسمانوں کا ”لن یموتن“۔ ”ستاروں کی بے ربط حرکت و عویش و فلو“ اور اضطراب وغیرہ یہ سب موجودات عالم پر شخصی تخیل کا عمل ہے۔

والسماء ذات البروج والیوم الموعود و شاهد و مشہود

ان تین جملوں میں مشترک بات صرف وزن اور قوافی ہیں ورنہ بروج والے آسمان اور وعدہ کئے ہوئے روز اور گواہ و امرد واقعہ میں کافی تاویل کے بعد مناسبت قائم کی جاسکتی ہے لیکن ذہن سامع پر خدا کی قدرت، روزِ حشر

اور حساب و کتاب کا اثر جیسا ان مبلغ کئیوں سے پڑتا ہے وہ مخفی نہیں۔ قرآن میں ہر ہر موقع پر کوشش کی گئی ہے کہ کلام کو خدا کا کلام اور کتاب کو "تَنْزِيلُ مِنَ رَبِّ الْعَالَمِينَ" باور کرایا جائے۔ اور ایک مصلح یہی تدبیر اختیار کر سکتا تھا

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ معقولی بُراہین سے قرآن کے بعض دعاوی اس کے اعلیٰ ماخذ کا پتہ دیتے ہیں یا نہیں ظاہر ہے کہ ایک مستند بیان کو اپنی تفصیل میں قدرت کے عام اور مسلم قاعدوں کے منافی نہ ہونا چاہئے ورنہ عینی محسوس شہادت کے مقابل میں ہم مجبوراً اس بیان سے روگردانی کریں گے۔ سب سے پہلے ہم اُس مشہور معاہدہ پر تبصرہ کریں گے جو ارواح اور اُن کے رب کے مابین ابتدائے تخلیق میں ہوا تھا۔ اور جس کی بنا پر بنی نوع آدم پر ایک قسم کی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ خدا کو جتنی رو میں پیدا کرتی مقصود تھیں اُن کو حاضر کر کے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں جس کے جواب میں تمام ارواح نے متفق اللسان ہو کر اقرار کیا ' ہاں ' یہاں یہ امر واضح نہیں ہے کہ ارواح سے صرف انسانی ارواح مراد ہیں یا جمیع حیوانات و مخلوقات کی اس لئے کہ رب تو سب کا ہے۔ بالفرض صرف بنی آدم مراد تھے تو کوئی معاہدہ اس وقت تک قابل گرفت نہیں ہوتا۔ جب تک معاہدہ ثبات ہوش اور اختیار بالذات نہ رکھتا ہو۔ ہوش و حواس کا ثبات جسم پر منحصر ہے۔ اور یہ صورت اُس وقت مشکل نہ تھی۔ علاوہ اس کے ارواح اگر وہی ہیں جنہوں نے معاہدہ کیا تھا تو تسلسل فی الذات ہونا چاہئے تھا اور اس صورت میں نامکن ہے کہ اتنا اہم معاملہ سب نے فراموش کر دیا ہو اور اگر ارواح کا تشخیص وہی نہیں ہے تو معاملہ ساقط ہو جاتا ہے اسی طرح انسان کا خلیفہ بنایا جانا، آدم کا قصہ، سلیمان کی قدرت، چاندروں کی باتیں موسیٰ کی تکلیف عینی کی ولادت وغیرہ توفیح طلب ہیں۔ ان کا بیشتر مواد بنی اسرائیل کی کتابوں اور دینی روایات سے ماخوذ ہے۔ جن کی صداقت خود معرض بحث ہے

رہا یہ سوال کہ دوسروں نے ایسا کیوں نہ کر لیا۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر ام ایک وقت خاص اور ایک عامل مخصوص کے لئے موقوف رہتا ہے۔ واقعات و حوادث رفتہ رفتہ ماحول کو اس طرح ترتیب دیتے رہتے ہیں کہ وہ مظاہرہ اس خاص وقت میں اُس خاص ایجنٹ کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر ہر فرد کا ہر نفس اپنی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہے جو ماحول کے زیر اثر سرزد ہوتا رہتا ہے

مثلاً ہم بوجھ سکتے ہیں کہ جیمس واٹ کا بخاری قوت اور متحرک انجن کا دریافت کرنا۔ اٹھارہویں صدی میں برکنگھم کے اندر کیونکر واقع ہوا۔ کیوں نہ سرزمین ہند پر اکبر کے زمانہ میں خانخاناں نے اسے دریافت کر لیا یا زید، عمر، بکر نے ایران۔ آسٹریا یا لندن میں کیوں نہ جان لیا۔ لیکن یہ سوال لغو ہو گا کیونکہ زمانہ کا اقتضا اور جیمس واٹ کا ماحول اکبر کے عہد سے بالکل علیحدہ چیز تھا۔ اگر واٹ نے بخاری انجن دریافت کر لیا تو اس کے اسباب بھی موجود تھے۔

انیسویں صدی کے رجحانات جیسے کی ابتدائی تربیت اس کا کونہ کی کان میں کام کرنا۔ حرکت کی مختلف شکلوں کا حسب اتفاق اس کی نظر میں ہونا۔ کونہ کے تاجروں کو برسر وقت ایسی کسی قوت کی تلاش ہونا۔ تجارتی سرگرمی کا آغاز۔ نوآبادیات اور مقبوضات میں صنعت کے مواقع۔ تھوڑے وقت میں زیادہ کام کی خواہش۔ صنعتی کارخانوں کے لئے متحرک قوت کی مانگ یہ سب باتیں اس انکشاف کے قدرتی اسباب میں شامل ہیں۔ اسی طرح چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے حالات مقتضی تھے کہ ایک شخص اس شان کا، اس اخلاقی شخصیت کا۔ اس ذہنی سرمایہ کا نمودار ہو۔ جس کو سیاسی بے نظمی سے اس طرح کی مدد ملے، قبائلی خانہ جنگی اس طرح سداوت کرے اور مکہ کی مرکزیت کا یہ اثر ہو۔ رہا یہ امر کہ اس وقت یا اس کے بعد ایسا کلام کیوں نہ ظاہر ہوا۔ اس کے وجہ بھی ظاہر ہیں۔ جب قرآن کی حکومت عربی بولنے والی اقوام پر حکم ہو گئی تو ان کی دماغی اور عملی سرگرمیاں دوسری طرف منتقل ہو گئیں۔ اور شاعری کی مسلسل تردید جو مصلحتاً کی گئی تھی۔ اس کی بنا پر تابعین اور متبع تابعین کے عہد میں کسی شاعر کو عروج نہ ہوا اور جب بالآخر ہوامیہ کے اخیر عہد اور ابتدائے عباسی خلافت میں شعر گو پیدا ہوئے تو وہ اسلامی روایات و عقائد میں رنگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس خیال کا مؤید بلکہ شدید حامی تھا کہ قرآن حبس کلام بشر کے امکان سے باہر ہے۔ اور کسی کو مقابلہ کی جرات نہ ہو سکتی تھی اور اگر جرات کرتا تو بیدار یغ پیس دیا جاتا۔

عیسیٰ ابن مریم کے ولادتی معتمد پر قرآن کا اتفاق بانی اسلام کی ابتدائی مصلحت پر روشنی ڈالتا ہے۔ نبوت کے ابتدائی زمانہ یعنی دوران قیام مکہ میں محمد (صلعم) یقیناً اپنی تبلیغی سرگرمی کو مسیحی مشن کا تسلسل سمجھتے تھے یا کم از کم اہل کتاب کی ہمدردی کے متوقع تھے اور اپنے مشن (دہشت) کو ابراہیم و اسمعیل۔ موسیٰ و عیسیٰ کی تائید میں ہونیکا اعلان کرتے رہے کیونکہ اس نظام سے خود کو منسوب کرنا یا ہمدردی۔ یعنی مواد کو اپنی حمایت کے لئے صرف کرتا تھا۔ عرب خواہ بت پرستی کے افضل ترین مدارج میں ہوں لیکن اپنے اجداد کے نام پر قداست تھے اور اپنے طریقوں کو ان سے منسوب کرنے پر مصر تھے لہذا ایک مصلح کے لئے ضرور تھا کہ وہ اسی تاریخی روایتی زمین پر اپنی بساط ملقین پھیلائے۔ چنانچہ ابتدائی کوسورتوں میں صرف کافروں اور مشرکوں کی مذمت کرتا۔ اور اہل کتاب سے استغناء اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے اگر یہ معلوم ہوتا کہ اجداد کو عیسائی اور یہودی اس قدر مخالفت کریں گے تو انھوں نے کا یہ مظاہرہ کبھی نہ کیا جاتا مگر مشرک یہ تھی کہ عیسائیت اور یہودیت ہی کا مواد ایسا تھا جو عرب میں اصنام پرستی کے بالمقابل تسلیم کے جانے کا امکان نہ تھا۔ بودھ اور زرتشتی خیالات سے لوگ قطعاً نا آشنا تھے۔ لہذا ایرانی و ہندی زمین پر کوئی عمارت بنانا محال تھا الغرض اسلام اسرائیلی مذاہب کا نئے حالات کی روشنی میں ترسیم شدہ چربہ تھا چنانچہ خود قرآن میں جا بجا یہی ظاہر کہ گیا ہے مثلاً "انزل علیہ الكتاب بالحق مبین قالمآیین یدیر وانزل التوراة والابجیل من قبلہ ھدی و انوار" اسی طرح ملت ابراہیم ضیف کی متابعت کا یقین دلانا ان ہی تمدنی رجحانات کو اپنی حمایت

میں صفت آرا کرنے کے مراد ہے

یہ امر کہ تمام سلسلہ رسالتیں ایک ہدائی تسلسل کی کڑیاں تھیں اس بنا پر قابل قبول نہیں کہ تسلسل زمانی و مکانی غیر مرئی ہے۔ ہدایت کی نوعیت میں باہمی تناقض ہے اور تسلسل اس کے بعد منقطع ہو گیا ہے۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہزاروں لاکھوں صدیوں کے دوران میں صرف سات ہزار قبل مسیح سے لے کر سنہ عیسوی تک خدا کی ہدایت محدود رہے اور ابد الابد تک دنیا ہدایت سے محروم رہے۔ اگر عیسیٰ کے چھ سو برس بعد دنیا گمراہ ہو سکتی تھی تو رسول اللہ کے تیرہ سو برس بعد تک گمراہ نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیا موجودہ دنیا اسلامی نقطہ نظر سے گمراہ نہیں ہے۔ اگر سب مسلمان عین حق پرست اور سچے پیرو بھی تسلیم کر لئے جائیں تو ان کی تعداد صرف پچیس کروڑ ہے اور دنیا کی آبادی اس وقت دو ارب سے زائد ہے اس لئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۸۰ فیصدی آدمی گمراہ ہیں۔ عموماً قاعدہ ہے کہ ایک طریقے کے پابند اپنے قائد کے مقابلہ میں کسی نئی ہستی کے آگے گردن خم کرنا پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ موسیٰ کی گمراہ امت نے عیسیٰ کے ادعات کو تسلیم نہیں کیا نہ عیسیٰ کے بے شمار پیروؤں نے پیغمبر عرب کی سیادت کو قبول کیا۔ قدیم طریقہ والے جدید مصلح کو ہمیشہ شبہ اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے آئے ہیں

لذا بعثت کے تسلسل کو قائم کرنے میں بڑی دشواریاں نظر آتی ہیں۔ تاہم اسلام نے انسانوں کے معاشرتی اور اخلاقی نشوونما میں بہت دور رس حصہ لیا۔ اور اسلام کا اضافہ علوم و فنون میں نہایت اہم رہا۔ اسلام کا تشخص سیاسی نظم و نسق میں اب تک محسوس ہی نہیں بلکہ ایک زندہ قوت ہے۔ محمد کا ہدایتی کلام یورپ کا آئینی نظام ہے

قاضی محمد عزیز عرفانی (نیوٹوی)

(نگار) یہ مضمون ایک تعلیم یافتہ نوجوان کا ہے اور وحی کے موضوع کو سامنے رکھ کر انھوں نے اسے سپرد قلم کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مضمون میں مسئلہ زیر بحث کے لحاظ سے تسلسل پیدا کرنے میں باوجود پوری دوسری کے ہم کامیاب نہیں ہو سکے۔ تاہم فاضل مضمون نگار کے منتشر خیالات سے ہم یہ نتیجہ ضرور پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ قرآن کو رسول اللہ کا کلام سمجھتے ہیں اور وحی کا یہ مفہوم کہ وہ منزل سن الہی ہے ان کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے تعلیمات اسلام پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ سب نتیجہ تھا اس وقت کے ماحول کا اور اس زمانہ کی مصلحت کا۔

چونکہ ہم اس مسئلہ پر خود بھی متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اس لئے بغیر کسی تنقید کے اس مضمون کو شائع کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کی تردید یا مخالفت میں لکھنا چاہیں تو شوق سے سنیں۔ نگار کے صفحات حاضر ہیں۔

(ادبیر)



# انگلستان میں سیاسی پارٹیوں کا قیام

انگلستان کا آئین (Party System) پر مبنی ہے۔ لیکن برخلاف ہندوستان کی موجودہ سیاسی پارٹیوں کے یہ سیاسی پارٹیاں فرقہ بندی کے اصول سے بالکل علیحدہ ہیں۔ انگلستان کے آئین کا ارتقا کم از کم دو صدی سے بالکل پارٹی لائن پر ہو رہا ہے اور اسی پر اس کی نشو و نما کا انحصار ہے۔ دو صدی سے چند سال پیش تک دو پارٹیوں کو خاص طور سے اہمیت رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے آئین کو دو جماعتوں کے طرز حکومت کا طریقہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے ایک مضمون میں دیکھ چکے ہیں۔ انگلستان کی گورنمنٹ اور وزیر اس جماعت کے اراکین پر مشتمل ہوتے ہیں جو پارلیمنٹ میں فوجیت رکھتی ہے اور فی الحقیقت وہ ان اعلیٰ عہدوں پر اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ وہ اس پارٹی کے لیڈروں میں سے ہوتے ہیں۔ اس لئے سیاسی پارٹیاں انگلستان کے آئین میں گورنمنٹ کے لئے روح پھونکنے کا کام کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے امریکہ کی پارٹیوں سے یہ فوائد حاصل نہیں ہوتے کیونکہ وہاں گورنمنٹ کے عہدہ دار پارٹی کے لیڈر نہیں ہوتے۔ وہاں کے پریزیڈنٹ کے لئے بھی یہ لازمی نہیں کہ وہ پہلے سے اپنی پارٹی کا لیڈر رہا ہو

سترہویں صدی کے اختتام کے قریب اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں سیاسی پارٹیوں کا اصلی قیام ہوا گو اس سے قبل بھی پارٹیاں تھیں مگر اون میں فرقہ بندی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نظریہ قائم ہوا کہ گورنمنٹ کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور اسی کی ارتقا کا نتیجہ پارٹی سسٹم ہے۔ پہلے مختلف جماعتیں مل کر کام کیا کرتی تھیں لیکن جب خیالات اور نصب العین میں اختلاف ہونے کے باعث کام میں دشواریاں پیدا ہوئیں تو رفتہ رفتہ وزیر ایک ہی جماعت سے لیے جانے لگے۔ اور اُس وقت دوسری پارٹی میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم عنان حکومت اس وقت اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ جب کہ موجودہ پارٹی سے پارلیمنٹ کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ اور اس طرح جماعت برسر اقتدار اور مخالف پارٹی کا خیال آئین کا جزو بن گیا

سب سے پہلی دو پارٹیوں کا نام (Whig) اور (Tory) تھا۔ اور یہ پارٹیاں اختلاف اصول کی بنا پر تھیں (Whig) مذہبی رواداری اور پارلیمنٹ کی فضیلت پر

زور دیتے تھے اور اس خیال کے پر زور حامی تھے کہ وزرا بجائے تاج کے پارلیمنٹ کے ذمہ دار ہوں۔ ان ہی سے بعد میں لبرل پارٹی بنی۔ (Tory) مذہبی رد اداری کی پروا نہیں کرتے تھے۔ برخلاف اس کے وہ (Church of England) کی عظمت اور فضیلت کو بڑھانا چاہتے تھے۔ اور وہ شاہی حقوق خصوصی کے طرفدار تھے اس لئے وہ اصولاً چاہتے تھے کہ وزیر بادشاہ کے ذمہ دار ہیں نہ کہ پارلیمنٹ کے۔ موجودہ قدامت پسند

(Conservative) پارٹی اسی سے بنی ہے (Liberal) اور (Conservative) میں بڑا فرق یہ رہا ہے کہ اول الذکر پارٹی آزادانہ تجارت کی حامی رہی ہے۔ اور آخر الذکر تاج میں تجارت کی اہمیت پر زور دیتی رہی ہے لیکن اس وقت یہ بتانا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے بہت ہی مشکل ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت دونوں کے اصول تقریباً ایک ہی ہو رہے ہیں۔ اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ قدامت پسند جماعت میں زیادہ تر اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہیں جن کا مطمح نظر بہت وسیع نہیں ہے۔ ایک نوجوان انگریز نے اس فرق کو اس طرح بتایا کہ میرا خاندان قدامت پرستوں کا ہے لیکن اگر آئندہ انتخاب میں (Conservative) اور (Conservatives) کا مقابلہ ہو تو میرے بزرگ تو (Conservative) کے ساتھ ووٹ دیں گے اور میں مثل بہت سے نوجوانوں کے (Liberals) کے ساتھ

ووٹ دوں گا

اول میں قدامت پسند پارٹی برسر اقتدار تھی۔ اور اس پارٹی نے ہنری ڈیوڈ لارڈ کے سخت نشین ہونے کی بہت مخالفت کی۔ اسی سلسلے میں ان کے وقت میں بغاوتیں ہوئیں اور اس پارٹی کا زوال ہونے لگا۔ حتیٰ کہ (Robert Walpole) پارٹی برسر اقتدار ہو گئی

جس نے سب سے پہلے اپنی لئے وزیر اعظم کی حیثیت کا اعتراف کروا دیا وہ اسی (King) پارٹی کا تھا۔ تقریباً بیس برس تک یہ پارٹی برسر حکومت رہی اور پارٹی سسٹم بہت کچھ اعلیٰ پیمانہ پر آگیا۔ لیکن چونکہ مخالف پارٹی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ لہذا زیادہ عرصہ تک با اقتدار رہنے سے اور نیز اس وجہ سے کسی بڑی مخالفت کا مقابلہ اس پارٹی کو نہیں کرنا پڑا یہ بھی کمزور ہوتی چلی گئی اور اس میں بھی باہم اختلافات ہو گئے۔ مسئلہ ۶ میں ایک نئی پارٹی بنی جس کا نام (King's Friends) یعنی مساوین شاہنشاہ تھا۔ اس

بس دونوں پارٹیوں کے لوگ شامل تھے۔ اور جارج ثالث نے جو اس وقت بادشاہ تھا ایسے وزرا منتخب کئے جن کو پارلیمنٹ کا زیادہ خیال نہ تھا۔ اور جو اس کو خوش کرنا چاہتے تھے۔ لہذا اس وقت دونوں پارٹیاں مصل ہو گئیں۔ اسی لئے اس زمانہ کو شخصی حکومت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ جارج ثالث کی پالیسی سے جہاں تک اس کا تعلق امریکہ اور آئرلینڈ سے تھا یہی پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں ایک شخص عروج پر آیا جس کا نام .....

(William Pitt) تھا اور انگلستان کی وزارت اُس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے پھر کابینہ  
دی اور پارٹی نظام کے صحیح اصول پر پھر حکومت شروع ہو گئی۔ یہ اول اول (Conservative) تھا لیکن  
رفتہ رفتہ واقعات سے مجبور ہو کر (Tory) ہو گیا اور بیس برس تک برسر حکومت رہا۔ اس وقت  
دارالخواص میں (Whig) پارٹی کا بہت زور تھا۔ مگر (William Pitt) نے بہت سے امرا (Peers)  
(Banks) بنا کر اُس میں (Tory) پارٹی کے لوگوں کو بھرتی کر دیا اور اس طریقہ سے (Whig) پارٹی بہت کمزور ہو گئی۔ کیونکہ اس پارٹی کی ہمدردی فرانس  
کی انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ تھی۔ فرانسیسی انقلاب اور نپولین کے عروج کے زمانہ میں (Tory)  
پارٹی نے اپنے ملک کی خاصی خدمت کی اس لئے وہ غیر ہمدرد نہ بنے لیکن جب زمانہ ملک میں اصلاحات  
کا آیا تو چونکہ (Tory) پارٹی کے رکن اس سے گریز کرتے تھے اس لئے وہ عامۃ الناس کی نظر میں  
سے گر گئے۔ اور ۱۸۳۲ء میں جب ان کی پارٹی کو شکست ہوئی تو (Conservative) پارٹی پھر برسر اقتدار  
ہو گئی۔ اول گرے اس پارٹی کے لیڈر وزیر اعظم ہوئے۔ اس پارٹی نے بہت سی اصلاحات کیں  
اب (Whig) اور (Tory) پارٹیوں کا نام (Liberal) اور (Conservative) تھوڑے  
عرصہ کے لئے پھر برسر حکومت ہوئے لیکن جب وہ اس قانون کو تبدیل کر سکے جس کے ذریعہ سے غلہ کی درآمد  
پر محصول لگایا جاتا تھا تو ان کی وقت پھر گھٹ گئی۔ اور ۱۸۴۶ء میں پھر لیبرل پارٹی نے عنان حکومت اپنے ہاتھ  
میں لی۔ کچھ دنوں تک پھر پارٹیاں تقریباً کا عدم ہو گئیں۔ ۱۸۵۹ء میں بہت سے قدامت پسند لیبرل پارٹی  
میں شامل ہو گئے اور (Gladstone) نے بحیثیت لیبرل وزیر اعظم کے حکومت کی  
ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لی۔ چونکہ یہ پارٹی ترقی اور اصلاحات کی حامی تھی اور پھر اپنے ملک کے سدھارنے  
میں بہت کاوش کرتی تھی۔ اس لئے اس کا اثر قدامت پسندوں پر بھی پڑا اور ان میں بھی اصلاحات کی طرف میلان  
پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب قدامت پسند برسر اقتدار ہوئے اور (Disraeli) ان کا  
وزیر اعظم ہوا تو اس وقت منجملہ اور اصلاحات کے شہر کی آبادی کے حق رائے دہندگی میں بہت توسیع ہو گئی  
کچھ دنوں بعد (Liberal) پھر برسر حکومت ہوئے مگر چند ہی سال کے بعد پھر گر گئے اور ۱۸۷۴ء  
میں قدامت پسند بہت کثیر تعداد میں پارلیمنٹ میں آئے اور تقریباً بیس برس تک حکومت کرتے رہے گو اس  
درمیان میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے تین مرتبہ (Conservative) کی وزارت قائم ہوئی۔ اسی زمانہ  
میں آئر لینڈ کے ہوم رول کا مسئلہ بہت زور پکڑ رہا تھا۔ اور دوم مرتبہ پارلیمنٹ میں مسودہ آیا۔ ایک مرتبہ تو

دیوان عام سے پاس بھی ہو گیا لیکن دیوان خاص نے اس کو مسترد کر دیا۔ اس وقت کنسرویٹو اور لیبرل جماعتوں میں سے دو جماعتیں نئی پیدا ہو گئیں جو آئر لینڈ کی علیحدگی کے خلاف تھیں۔ ان کا نام کنسرویٹو یونینسٹ (Conservative Unionists) اور لیبرل یونینسٹ (Liberal Unionists) تھا۔

الغرض کنسرویٹو اور لیبرل پارٹیاں اسی طرح حکومت کرتی رہیں اور ہر بار کسی خاص پالیسی کی وجہ سے اون کو فتح و شکست ہوتی رہی۔ ذات پات - مذہب اور فرقہ بندی کے اصول کبھی اون کے مدد جز میں شامل نہیں ہوئے جس کا ہمارے بنیضیب ملک کو نہایت شرمناک طریقہ پر سامنا کرنا پڑتا ہے

۱۸۹۳ء میں یورپ میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اصلاحات وغیرہ کا خیال چھوڑ کر جنگ کے معاملات پر تمام توجہ مبذول ہو گئی لہذا یہ اتفاق رائے ایک مشترکہ جماعت قائم کی گئی جس میں ہر پارٹی شریک تھی اوس کو (Coalition) کہتے تھے۔ اس کیڈر شروع میں مسٹر ایسکوٹھ تھے مگر ۱۹۱۶ء میں لائڈ جارج نے حکومت ہاتھ میں لے لی اور اونھوں نے اتنی تبدیلی آئین میں بھی کی کہ علاوہ کینٹ کے ایک اور مختصر (Cabinet) قائم کی تاکہ جنگی امور پر فوری توجہ دی جاسکے۔ مگر مسٹر ایسکوٹھ کے دستبردار ہونے سے اور مسٹر لائڈ جارج کے وزیر اعظم ہونے سے لیبرل پارٹی میں آپس میں ایسا اختلاف ہو گیا جس کی پاداش کج تک اس پارٹی کو اٹھانا پڑ رہی ہے۔ بہر حال مشترکہ جماعت کی ترتیب میں گورنمنٹ نے جنگ کے زمانہ میں بہت اچھا کام کیا۔ یہ یاد رہے کہ گو اس وزارت کے وزیر اعظم لائڈ جارج تھے جو لیبرل تھے مگر دیوان عام کے اکثر ممبر قدامت پسند تھے

۱۹۱۸ء سے ایک اور پارٹی انگلستان میں پیدا ہو گئی جس کو سوشلسٹ یا مزدور پارٹی کہتے ہیں۔ اس کا خاص اصول یہ ہے کہ ملک کے مختلف طبقہ جات کی گہری خلیج کو ڈور کیا جاوے اور تمام صنعت و حرفت ملک کے قبضہ میں رہے جس سے ہر شخص یکساں متمتع ہو سکے۔ یہ پارٹی دومرتبہ برسر اقتدار رہی۔ ایک بار ۱۹۲۴ء میں۔ دوسری مرتبہ ۱۹۲۹ء میں۔ اس پارٹی کے قائم ہونے سے انگلستان کا آئین دو پارٹی والا آئین نہیں رہا اور جس طرح فرانس اور جرمنی وغیرہ میں دو پارٹی سے زیادہ ہوتی رہی ہیں انگلستان بھی اسی جانب مائل ہو گیا۔ جنگ کے بعد سے

(Labour Party) تو کبھی برسر حکومت نہیں ہوئے۔ عنان حکومت ہمیشہ قدامت پسند اور مزدور پارٹی کے ہاتھوں میں تبدیل ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ تقریباً ۱۹۴۵ء سال ہوئے کہ جب مزدور پارٹی برسر اقتدار تھی تب مسٹر ریڈرے میکڈونلڈ وزیر اعظم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ دنیا کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے ملک کو بہت اہم مسائل طے کرنے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ تمام پارٹیاں پھر متفق ہو کر ایک ملکی اور قومی پارٹی کی شکل میں پارلیمنٹ میں آئیں اور متحد ہو کر ان تمام مشکلات کا حل نکالیں۔ چنانچہ اسی اصول پر انتخاب ہوا اور ایک کثیر جماعت اس اصول کی تائید میں پارلیمنٹ میں آئی اور وہ برسر حکومت ہو گئی اوس کو نیشنلسٹ گورنمنٹ کہتے

ہیں۔ ان میں زیادہ تر قدامت پسند ہیں لیکن وزیر اعظم ریزے میکڈانلڈ ہیں جو مزدور پارٹی میں تھے۔ یہ دوسری مثال ہے کہ پارلیمنٹ میں وزیر اعظم اُس پارٹی کا نہیں ہے جس کو فقیہ حاصل ہے۔ یہاں پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ گو اس قومی پارٹی میں لیبرل اور قدامت پسند سب شامل ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی پارلیمنٹ میں پارٹیاں موجود ہیں جنہیں (Leading opposition party) اور (Independent Labour party) کہتے ہیں

مکڈانلڈ بالابسطور سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ تقریباً دو صدی سے انگلستان کی پارٹیاں بالکل اقتصادی اور سیاسی اصول پر کار بند رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ دنیا کے تمام ممالک کے لئے باعث رشک بنی ہوئی ہیں اس۔ ان۔ جنسری

## شہوانیات

یہ  
حضرت نیاز کے قلم سے

## ترغیبات جنسی

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ روپے کے جلد کتاب صرف ۸ روپے عار میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو جلد ۸ روپے اور غیر جلد ۸ روپے علاوہ محصول ۸ روپے کے ملے گی

اگر

ارشاد ہو تو کتاب درلید وی۔ پی روانہ کی جائے جم ۳۵، ۳ صفحات۔ آرڈر میں جلد و غیر جلد کی

صراحت ضروری ہے۔

نینجہ نگار لکھنؤ

# جہنم

(سلسلہ ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء)

## دوسرا سین - "کانفرنس"

بلعز بول نے منتر پڑھنا شروع کیا۔ اس کے زور سے جہنمی کوہ آتش فشاں کی دیواریں پھٹنے لگیں اور ان میں سے پھلے ہوئے سونے کے چٹھے اُبلنے لگے۔ اسی سونے سے خود بخود ایک عظیم الشان محل تیار ہو گیا۔ یہ شیطانی کانفرنس کا محل باغ عدن کے برابر لمبا اور باغ فردوس کے برابر چوڑا تھا

پھر اس نے دوسرا منتر پڑھا تو آگ کے سمندر میں سے ہیرے، یاقوت، اور زمرد کے ترشے ہوئے گولے فواروں کی طرح اُڑنے لگے اور اسی محل میں بلعز بول کے اشارہ سے خود بخود دیو بست ہوتے چلے گئے۔ انہی موتیوں سے اس سونے کے محل کی آرائش ہو گئی

بلعز بول کو آسمان پر مہمارا عظیم کا لقب حاصل تھا۔ جنت کی تمام بہترین عمارتیں اسی کے دماغ کی اختراع اور ماسی کی صناعتی کا نتیجہ ہیں۔ جب خداوند عالم کے حکم سے اس مہمارا عظیم نے عرش معلیٰ کے پہاڑے گنبد اور مینار نئے طریقہ پر بنائے تو اسے اپنی کاریگری پر بڑا گھمنڈ ہو گیا۔ اور سمجھنے لگا کہ ہچو من دیگرے نیست۔ اور یہ نہ سمجھا کہ مجھ میں جو کچھ بھی طاقت ہے اسی چورنگا کی دی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے خداوند عالم نے اس پر لعنت کی اور دوسرے شیطانوں کے ساتھ اسے بھی جہنم میں ڈھکیں دیا

جب کانفرنس کے ملے سونے کا شاندار محل تیار ہو چکا تو بلعز بول نے محل کے اندر عرش کے نمونہ کا ایک تخت بنایا جس پر ستر ہزار یا قوتی کرسیاں نصب کیں اور بیچوں بیچ ابلیس کے لئے ایک ہیرے کا معلق شیشین قایم کیا

جلسہ شروع ہوا۔ کرسیوں پر وہی شیطانی بیٹھے جنھیں آسمان پر معزز القاب حاصل تھے۔ باقی ماندہ شیطانوں نے اپنا جم چھوٹا کر کے ننھے ننھے جگنوؤں کی شکل میں تبدیل کر لیا۔ اور تخت کے چاروں طرف پرے باندھے ہوئے حکمگاہی لگے۔ جگنوؤں کی کثرت سے سارا محل دورانی ہو گیا

ابلیس معلق شیشین پر جلوہ افروز ہوا اور یوں کہنے لگا : —

”اے علم و دانش کے خداوندو! آدادی کے دیوتاؤ! حریت کے پرستارو! معظم و کرم و محرم فرشتو! سنو یہ شہ نشین اور یہ تخت جس پر میں جلوہ آراہوں جنت کی راحتوں اور عرش کی رفعتوں کا تخت نہیں ہے۔ مصیبتوں اور بے چینیوں کا تخت ہے۔ پھولوں کی بیج نہیں ہے۔ کاتوں کا ڈھیر ہے۔ اس تخت پر جو سب سے اونچا ہے عرش والے دیوتا کے نزدیک وہی سب سے نیچا ہے۔ جو سب سے بلند ہے وہی سب سے پست ہے۔ مگر یہ بلندی وہی محض ایک دھوکا ہے، فریب ہے، واہمہ ہے۔ سودا ہے، جنون ہے، بطلان حق و ابطال حقیقت ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہم درجہ و ہم رتبہ۔ یہاں نہ کوئی عزیز ہے نہ ذلیل۔ نہ اونچا نہ نیچا۔ نہ بلند نہ پست۔ البتہ ہم آسمانی مخلوق سے ستر ہزار درجہ بلند ہیں یہ اس لئے کہ ہم آزاد ہیں۔ اور آسمانی مخلوق ہم سے ستر ہزار درجہ پست ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ غلام ہے“

میں تمہارا وقت خیالی بحثوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس وقت ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ نئی جنگ کی تیاری کریں اور اس کے طریقوں پر غور کریں۔ جو شخص جو کچھ بھی مشورہ دے سکے کھڑا ہو جائے اور ہدایت کی روشنی پھیلانے

البیعال کی تقریر

ابلیس کے بیٹھے ہی البیعال کھڑا ہو گیا۔ پست ہمت، حیلہ جو، مفسد، فریبی، دغا باد، دور اندیش، ذیرک، ذہین، فتنہ۔ وہ زور سے چلائے لگا۔

”خداوند ابلیس! علیک العزت والاکرام۔ و خداوندانِ جہنم۔ میں تمہیں آسمانی اعزاز کے القاب سے نہیں پکاروں گا۔ میری نظر میں تمام آسمانی القاب گردوغبار سے زیادہ وقت نہیں رکھتے۔ تم آج سے خداوندانِ جہنم ہو، خداوندانِ سقر، خداوندانِ سیر، اور تم میں وہی سب سے زیادہ عزت و اکرام کا مستحق ہے جو عرش والے خداوند جنت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ سب سے بڑا باغی ہے۔ سب سے بڑا سرکش ہے!“

”خداوندانِ سیر! میں تمہیں عرش والے دیوتا سے کھلی جنگ کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ اب تک ہمارا بندہ آسمانی کیڑوں کی ضرب سے ڈکھ رہا ہے اور اب تک ہمارے عواس پر آگندہ ہیں۔ لہذا حالات حاضرہ میں علانیہ جنگ کی تیاری ہمارے حق میں مضر ہوگی۔ کیا عجب ہے کہ عرش والا دیوتا ہمیں ذلت کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنمی جھیل کے کئدوں میں باندھ دے۔ اور ہم اتنی بھی رہی سہی آدادی کھو بیٹھیں“

”میرا مشورہ یہ ہے کہ کروفریب سے آگے بڑھنا چاہئے اور کروفریب سے دشمنوں کو زیر کرنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ عرش والا دیوتا بھی خیرالما کریں ہے۔ اور اس کا کمر بھی کڑا کٹا رہا ہے۔ مگر ہمارے کمر و شر کے آگے اس کا کمر ٹھہر نہیں سکتا۔ اس کمر و شر کی قوت سے ہم آسمان کی ایک ستائی فوجوں کو اپنے ساتھ ملا چکے ہیں۔ باقی دو ستائی فوجیں بھی اسی قوت سے ہمارے ساتھ آجائیں گی بشرطیکہ ہم کمر کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں اور دور اندیشی سے قدم بڑھائیں

”جب آسمان کی ساری فوجیں ہمارے قبضہ میں آجائیں گی تو خداوند عرش اپنے بیٹے کو ساتھ لیکر اعراف کی برفانی

چوٹیوں پر چلا جائے گا۔ اور خداوند ابلیس کو اپنی گدی پر تخت نشین کر دے گا

(زور کی تابان نہیں،)

”یہ بات یقینی ہے اور ایسا ضرور ہوگا۔ ہم آسمان کے تمام فرشتوں کو عقل و حکمت اور فریب و دہل کے زور سے اپنا ساتھی بنالیں گے اور زمانہ شاہد ہے کہ فریب و دہل کا کوئی توڑ نہیں، یہ وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا“

ملوخ کی تفسیر یہ

البیعال کے بیٹھے ہی ملوخ کھڑا ہو گیا۔ دلیر۔ غصہ ور۔ غضب ناک۔ جنگ جو۔ پر عجب۔ خوف ناک۔ کوتاہ فہم۔ قہمت ناندیش۔ لسان۔ طرار۔ چلاتے لگا۔

”لڑائی۔ جنگ۔ کھلی لڑائی۔ کھلی جنگ

”خداوند ابلیس و خداوندان کرام۔ ملائکہ عظام۔ شہزادگان والالتبار۔ فرمانروایان گردوں و قار۔ جنگ۔ کھلی تیز اور علانیہ جنگ۔ لڑائی۔ تیر و تفتنگ کی لڑائی۔ گرد و شمشیر و تیغ و سناں کی لڑائی

گرائے گا سر عرش بھنڈا ہمارا بچے کا زمانہ میں ڈھکا ہمارا

ہمارے گئے جنت کو نعرے ہمارے الٹ دے گا دوزخ کو تینا ہمارا

فرشتوں کے سردار و سالار ہیں ہم خداوند ابلیس آقا ہمارا

ہماری دلیری کے سکے جے ہیں دو عالم میں ہے بول بالا ہمارا

قدم و مہدم بجلیاں چومتی ہیں قیامت ہے نقش کتب ہمارا

گرایا سر عرش روح الامیں کو کوئی آ کے دیکھے کیسے ہمارا

جہنم کے دیوار و در کا پتے ہیں کہ اب مگر کہ ہے خدا کا ہمارا

ڈرو عرش و لو کہ پھر پور ہمارا تمہاری طرف آج دھوا ہمارا

زور کا کر کا ہوا۔ سونے کے محل کی چھت شق ہو گئی۔ زلزلہ آگیا۔ آسمانوں کے پردے اٹھ گئے۔ عرش بے نقاب ہو گیا۔ تمام شیطانوں کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں

تیسرا سین۔ خداوند عالم کا دربار

عرش

عرش معنی کے قلعہ میں تمام ملائکہ کرام و کرام و بیان عظام جمع ہیں۔ اور ابلیس کی فوجوں پر فتح مبین کی خوشیاں منائی جا رہی



یہ پیارے پیارے غلمان شراب طہور کی ننھی ننھی پیالیاں ہاتھوں میں لئے ساقی بنے ہوئے فرشتوں کو پلا رہے ہیں۔ عوریں  
نمد کا ترانہ گارہی ہیں :-



الہی مالک ہے تو بسوں کا زمین بھی تیری زماں بھی تیرا ملک بھی تیرے ملک بھی تیرے کہیں بھی تیرے مکان بھی تیرا  
متاع حسن عیاں بھی تیری طلسم شوق بناں بھی تیرا نمود صبح و مسا بھی تیری شہود سود و زیاں بھی تیرا  
تجھی سے ہے خیر و شر ہویدا بدی تجھی سے تجھی سے نیکی عذاب نار سقر بھی تیرا ثواب باغ جہناں بھی تیرا  
تجھی سے ناروں میں ہے یہ گردش تجھی سے قائم پر عرش کرسی ظہور خمس و قمر بھی تیرا رواق ہفت آسماں بھی تیرا  
ترے ہی در کے بھی گداہن میں کے اوپر فلک کے بچے رئیس ذی عز و شتاں بھی تیرے گدے بے خانان بھی تیرا  
تجھی سے جنت میں روشنی ہے تجھی سے دوزخ میں داندھیرا تراہی جلوہ چہار سو ہے یہاں بھی تیرا دہاں بھی تیرا  
رحیم بھی تو کریم بھی تو اذل بھی تیرا ابد بھی تیرا فتا بھی تیری بقا بھی تیری جنیں بھی تیرا چناں بھی تیرا

خودی بھی تو ہے خدا بھی تو ہے بھلا بھی تیرا برا بھی تیرا

چھپا بھی تو ہے کھلا بھی تو ہے عیاں بھی تیرا نہاں بھی تیرا

قلعہ کے بچوں پہنچ خداوند عالم کا گول تخت ہے۔ تخت کے چاروں طرف سبز زمردی پردے پڑے ہیں جن کے اندر  
نے رحمت و نور کی شعاعیں چھن چھن کر یوں نکل رہی ہیں جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو اور اسی نور ایزدی کے پرتو  
سے کروڑوں میل تک عرش کا حصار بقعہ نور بن گیا ہے

تخت کے بیچ شاندار کرسیوں پر تین جلیل القدر سپہ سالار جلوہ افروز ہیں۔ میکائیل۔ اسرافیل۔ جبرائیل  
تخت کی غلام گرد مشن میں ستر ہزار طاق ہیں۔ ہر طاق میں ستر ہزار فرشتے سر بسجود سبحان ربی الاعلیٰ اور سبحان  
ربی العظیم کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ کھروں پدموں فرشتے قیام میں دست بستہ کھڑے ہیں اور انوار الہی  
کی کرنوں سے اپنی آنکھوں کو منور کرتے ہوئے حسب اللہ و نعم الوکیل۔ نعم المولیٰ و نعم النصیر کا ذکر رہے ہیں  
بند شرابہ و ر کے جام سب چھوٹے بڑے ملاحظہ فرما چکے تو رقص و سرود بند ہوا اور جبرائیل کے توسط سے خداوند عالم  
نے مامک کو خطاب کر کے فرمایا :-

”میرے فرماں بردار ہندو۔ فرماں بردار فرشتو۔ تم پر بار بار میری رحمت ہو۔ اور ابلیس لعین پر میری  
لنت ہو“

”تم سب گواہ رہو کہ قیامت کے دن ابلیس اور اس کے ساتھیوں کا منہ کالا ہوگا اور انھیں بڑا درد دینے  
والا عذاب دیا جائے گا۔ اور تم سب نیک بندوں کا منہ روشن ہوگا اور انھیں جنت میں مزے مزے کی نعمتیں دی جائیں گی

” میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ دور بہت دور جنت کے ایک کونے میں میری ایک مخلوق ہے جسے آدم کہتے ہیں۔ اس مخلوق کو میرے سیدھے راستے سے ہٹا کر اپنے ٹیڑھے راستے پر لے جانے کے لئے شیطان الزچم اپنی دریات سے مشورہ کرنے والا ہے۔ پس تم گواہ رہو کہ اگر ابلیس لعین یعنی شیطان الزچم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو میں اپنے بیٹے یسوع کو اس مخلوق کے درمیان اتاروں گا۔ تاکہ وہ آدم کو ہدایت دے اور اس کے شرمناک گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ جو میرے بیٹے پر ایمان لائے گا اس کے سب گناہ بخش دئے جائیں گے۔ اور اسے مرنے کے بعد فردوس میں تمہارے ساتھ جگہ دی جائے گی اور جو یسوع پر ایمان نہیں لائے گا اور اُسے میرا بیٹا نہیں جانے گا اور اس کا کلمہ نہیں پڑھے گا اور ابلیس لعین کے راستے پر لگ جائے گا اُس کی سب نیکیاں اکارت جائیں گی اور اس کا وہی حشر ہوگا جو ابلیس لعین کا حشر ہونے والا ہے

” پس اے میرے فرمان بردار فرشتو!۔ تم سب میرے فرمان کے گواہ رہو۔ قسم ہے مجھے میری بزرگی کی اور جبرئیل کے سر کی کہ میں اپنا وعدہ پورا کر کے رہوں گا چاہے ابلیس اور اس کی ناپاک دریات کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہو“

” اے میرے نیک فرمان بردار فرشتو! تم سب دن رات میری حمد و ثنا کرتے رہو تاکہ تم پر میری رحمتیں زیادہ ہوں اور تم کو میری پاک ذات کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل ہو سکے۔ تم میں جو کوئی زیادہ عبادت گزار ہے میرے نزدیک وہی زیادہ بلند رتبہ والا ہے۔ والسلام“

ایک زوروں کی دل ہلا دینے والی گرج سنائی دی۔ اور مٹا تخت پاک غائب ہو گیا اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ تمام فرشتے جو سرو قد ہاتھ باندھے کھڑے تھے یکبارگی سجدے میں گر پڑے اور خداوند عالم کی تسبیح پڑھنے لگے

جبرئیل نے انگلی کے ایک اشارہ سے ستر ہزار سورج پیدا کئے اور نئے سرے عرش معلیٰ کے قلم کو منور کر دیا۔ تمام فرشتے چاندی کی مرصع کرسیوں پر ڈٹ گئے اور بانٹا بلٹا لٹکے کی مجلس خود بخود گرم ہوئی۔ میکائیل صدارت کے یا قوتی تخت پر رونق افروز ہوئے۔ اُن کے دلہنے ہاتھ کی جانب اسرافیل اور بائیں ہاتھ کی سمت جبرئیل سہرے لباس میں جلوہ فرما ہو گئے

میکائیل ————— حضرات۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس ناچیز حقیر کو اپنے گرانقدر جلسہ کا صدر منتخب کیا۔ حضرات۔ آج کا دن بڑا ہی مبارک دن ہے۔ آج کے دن خداوند عالم کی مدد سے ہماری فوجوں کو نافرمان باغیوں پر فتح حاصل ہوئی اس لئے میں صدارت کے تخت سے خداوند عالم عز اسمہ کے شکر یہ کہ تجویز پیش کرتا ہوں۔ صرف اس کی پاک ذات تمام شکریوں کی مستحق ہے

(چاروں طرف سے آمین آمین کی صدا میں بلند ہوئی)

میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ نور کے حروف میں بکھر کر لوح محفوظ پر لٹکا دئے جائیں

(اور ایسا ہو گیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ لکھائے گئے)

اب دوسری تجویز جناب اسرائیل پیش کریں گے

اسرائیل ————— معزز صدر و حاضرین کرام۔ خداوند عالم عز اسمہ کے فرمان سے آپ حضرات کو معلوم ہو گیا ہے کہ خداوند عالم اپنے بیٹے خداوند یسوع کو آدم کی ہدایت کے لئے دور دراز جنت کے کسی مقام پر بھیجنے والے ہیں۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ جس روز خداوند یسوع اس مخلوق کے درمیان مبعوث ہوں اس روز ہم سب بھراسی عرش معلیٰ کے قلعہ میں جمع ہوں اور خوشیاں منائیں

(چاروں طرف سے آمین آمین کی پروردہ ایں بلند ہوئیں)

میکائیل ————— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حروف میں لکھ کر لوح محفوظ پر نصب کر دئے جائیں

(اور ایسا ہو گیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ لکھائے گئے)

اب تیسری تجویز عالی جناب جبرئیل پیش فرمائیں گے

جبرئیل ————— معزز صدر و حاضرین کرام۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ابلیس کے لشکر کو زک دینے کے لئے ہم سب کو کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اور کروڑوں برس تک اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اب خداوند عالم عز اسمہ کی مدد سے ہمیں اُس پر چوری کامیابی ہو گئی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمانوں سے نکال دیا گیا۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم لوگ ہر تسبیح سے پہلے ایک نفاذ ابلیس ضرور نیت کر لیا کریں اور اس کے شر سے پناہ مانگا کریں

(چاروں طرف سے آمین آمین کا شور بلند ہوا)

میکائیل ————— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حروف میں لکھ کر لوح محفوظ پر لگا دئے جائیں

(اور ایسا ہو گیا۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ لکھائے گئے)

اب جلسہ برخواست کیا جاتا ہے

عزرائیل ————— حضور میں بھی ایک ضروری تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں

میکائیل ————— اب کوئی تجویز پیش نہیں ہو سکتی۔ خداوند عالم عز اسمہ کی طرف سے صرف تین تجویزوں کی

اجازت ملی ہے

(مقام فرشتے غائب ہو گئے اور تضرع عرض خالی ہو گیا)

آسمانوں کے پردے گر گئے۔ جہنم کے دروازے بند ہو گئے۔ سونے کے محل کی چھت بڑھ گئی۔ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں ہنوز اوپر کی طرف جمی ہوئی ہیں۔ سکتے کا عالم ہے۔

ابلیس ————— ہوشیار ہو جاؤ۔ اسے محترم شہزادہ ہوشیار ہو جاؤ۔ تم نے یہ آسمانی کھیل دیکھا! یہ دلفریب تماشا دیکھا، یہ تماشا صرف اس لئے دکھایا گیا ہے کہ تم جنت کے عیش و عشرت کی لالچ میں آکر بہک جاؤ اور غلامی کے سہرے طوق گلے میں ڈال لو۔ مگر نہیں ہماری مقتدر جماعت کا ایک فرد بھی بھٹک نہیں سکتا۔ بہک نہیں سکتا۔ ہمیں آگ کی زنجیریں پہننا قبول ہیں مگر غلامی کا تاج منظور نہیں

خانہ زادِ دلف میں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبراہٹیں گے کیا

محترم شہزادو۔ اب مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ خود آسمانی روشنی کے پردے ہم پر کھل چکے ہیں۔ اور آدم کا روزِ فاش ہو گیا ہے

خدا شرے برا انگیز کہ خیر مادران یاسد

میں خوب جانتا ہوں کہ آدم عرش والے دیوتا کی عزیز ترین مخلوق ہے اور اسی مخلوق میں وہ اپنا بیٹا سمیٹ کر لے والا ہے۔ مگر قسم ہے تمہارے سر بلند سروں کی کہ میں اس مخلوق کو چٹکیوں میں باغی کر دوں گا۔ اور اس کے ایک ایک فرد کو کشتی اور نوح کا داعی بنا دوں گا بلکہ خود یسوع کو بھی اس کے باپ کے خلاف کھڑا کر دوں گا۔ اور کل ہی تم دیکھو گے کہ یسوع کے ہاتھ میں بغاوت کا جھنڈا اور آزادی کی تلوار ہے

(دور کی تالیاں بچیں)

آہوم۔ محض ایک مجہول العقل ہستی ہے۔ نجس مٹی کی بنی ہوئی۔ نجس پانی کی افتاد۔ خود ستا و خود پرست۔ طامع و حریص۔ مغرور و متکبر۔ ذلیل و پست

عالم کفیت ہے دانائے رموز کم ہے

خیر اب بتاؤ۔ کون ہے جو جنت میں آدم سے ملے جائے گا۔ اور اسے خدا کے خلاف باغی کر دے گا۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ جہنم کے بند و راز سے کہہ نہ سکتے تھے۔ جہنم سے باہر نکلتا محال تھا۔ شیاطین ایک دوسرے کا منہ کٹنے لگے۔ کسی کو منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ابلیس نے کہا:۔

”میں خود جاؤں گا۔ یہ میرا کام ہے۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے سمندر کی غواصی میرا کام ہے۔ میں اکیلا جاؤں گا تنہا۔ اور بہت جلد تمہارے پاس واپس آ جاؤں گا۔ اور تمہیں اپنی معلومات سے بہرہ اندوز اور اپنی کارروائیوں سے آگاہ کروں گا۔“

(پردہ گر جاتا ہے)

تسلیم برخواست

## چوتھا سین - جہنم کا دروازہ

ابلیس جہنم کی ناری فضا میں اڑتا ہوا اُس مقام پر پہنچا جو جہنم اور آسمان کے مابین واقع ہے۔ وہاں دروازہ پر اُس نے ایک عجیب حیوان دیکھا جس کے دس سینک اور سات سر تھے۔ اُس کے سینگوں پر دس تاج اور سروں پر سات کمرے نام لکھے ہوئے تھے اس کا منہ سب کا سا تھا اور پاؤں ریکھ کے سے اور سینہ تیندے کا سا اور دھڑاڑ دے کا سا۔ اس کی بھوڑ کی ایک ایک سوڈ میں تھیں۔ اور ان میں ڈنک بھی تھے۔ وہ حیوان ابلیس کو دیکھ کر کڑک کر بولا :-

”خبردار - نابکار۔ ذرا آگے بڑھا اور میں تجھے سمو چا نکل گیا۔ خبردار۔ . . . .“

اُس حیوان کے پیچھے ایک عورت نظر آئی جو آفتاب کو اوڑھے ہوئے تھی۔ اور چاند اُس کے پاؤں کے نیچے تھا۔ اور بارہ ستاروں کا تاج اُس کے سر پر تھا۔ وہ ہمہ وقت حاملہ اور بچہ جننے کی تکلیف میں رہتی تھی۔ یہ عورت اُس حیوان کی بیوی تھی۔ ہر روز اس کے پیٹ سے دو بڑے بڑے کتے کے پلے پیدا ہوتے۔ جنہیں وہ حیوان فوراً کھا جاتا تھا۔ کسی دن اگر اُس عورت کے بچے پیدا نہ ہوتے تو حیوان اُسے بہت تکلیف دیتا اور کہتا :-

”جلدی بیجے جن۔ نہیں تو میں تجھی کو سمو چا کھا جاؤں گا“

وہ عورت دراصل حیوان کی ماں تھی مگر اُس نے اُسے زبردستی بیوی بنا رکھا تھا۔ دونوں میں خوب آن بن رہتی اور اسی ان بن میں دونوں خوش تھے

حیوان کی کڑک سنتے ہی عورت اپنے غار سے باہر نکل آئی اور ابلیس کو پہچان کر اپنے خاوند پر لپکی :-

”سجدہ کر۔ مُردار۔ سجدہ کر۔ یہ ہمارے آقا خداوند ابلیس خداوند جہنم ہیں“

حیوان ڈرا اور جھٹ سجدہ میں گر پڑا۔ عورت بھی سجدہ میں بھگ گئی۔ دونوں ابلیس کی تسبیح و تہنید کرنے لگے۔ ابلیس نے بلند آواز سے کہا :-

”اے بد نصیب دربانو! تمہیں آسمانی دیوتاؤں نے بدترین عذاب میں پھنسا رکھا ہے۔ تمہاری لعنت بدترین لعنت ہے۔ افسوس تم اپنی غلامی میں خوش ہو اور اپنی بدکاری کو عیش و عشرت سمجھے ہوئے ہو اور جہنم کی ذلیل دربانی پر فخر کرتے ہو

اے بد نصیب حیوانو! جاگو! ہوش میں آؤ۔ اور تیار رہو۔ عنقریب میں اُس عرش والے دیوتا سے جنگ کرنے والا ہوں جس نے تمہیں نجس اور ناپاک ٹھہرا کر جہنم کی نگرانی کا ذمہ دار بنایا ہے

اے بد نصیب حیوانو! میں بہت جلد تمہیں اس مکر وہ غلامی سے نجات دلاؤں گا۔ مگر تم بھی اپنے فرائض میں غفلت نہ کرنا۔ جب ہمارے لشکر جنگ کا بلکل بجائیں۔ تم بھی کھڑے ہو جانا اور ہمارا ساتھ دینا۔ غنیمت لی فوجوں کی کثرت سے نہ ڈرنا

میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور تمہاری کامیابی یقینی ہے  
عورت ——— خداوند تم سے کتنے ہو۔ ہم تمہارے حکم کے بندے ہیں اور تمہارے حکم کو خدا کا سربراہ  
جانتے ہیں

ابلیس ——— میں باہر جاتا ہوں۔ دروازہ کھول دو  
عورت نے اپنے سر کے سورج میں سے ایک آتشیں نیزہ لیا اور اپنے خاوند کا پیٹ پھاڑ کر اُس کی آنٹوں میں سے  
جنمی کچی نکالی اور ابلیس کو دیدی۔ ابلیس نے اُسی خون آلود گنجی سے باب لعنت کا پھانگ کھولا اور جنم سے باہر نکل  
آیا اور یہ جاوہ جا غائب ہو گیا  
ابلیس آسمانوں سے گزرتا ہوا کرہ آفتاب پر پہونچا۔ وہاں سے اُس نے باغ عدن کا پتہ لگا یا جہاں آدم اور اس کی بیوی  
حوا رہتی تھی۔ وہ ہر مقام پر خداوند عالم کے خلاف زہر اگھٹا کیا اور بہت سی ہستیوں کو اپنے پیدا کرنے والے کے خلاف  
بھکانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور آخر کار باغ عدن میں پہنچ گیا

## پانچواں سین — باغ عدن

عدن ہو، ہو، ابلیس کے پُرانے مسکن باغ فردوس کا نمونہ تھا۔ وہاں کے دلفریب مناظر، پھولوں کی رہنمائی،  
مردم کے فوارے، زبرد کے محل، دودھ کی نہریں، شہد کے حوض، شراب طہور کی بوتلیں، رنگ رنگ کے پرند، طرح  
طرح کے جانور، اور صبح و شام کی رنگینیاں دیکھ کر ابلیس کا دل بھر آیا  
اس نے چاہا کہ توبہ کر لوں اور پھر فردوس میں جا کر آرام و راحت کی زندگی بسر کروں۔ مگر پھر اُسے اپنی فوجوں کا  
خیال آیا جو جنم میں سزا رہی تھیں۔ اور اس کا ارادہ پلٹا۔ اس نے کہا  
نہیں نہیں۔ میں اپنی عالی حوصلہ ذریات سے غداری نہیں کروں گا۔ یہ جنت کا عیش و عشرت کمزوروں اور بد بختوں  
کے لئے ہے۔ میں کسی بزرگ تر ہستی کا دامن پکڑ کر جنت میں داخل نہیں ہوں گا۔ یہ میرے لئے تنگ و عار ہے

حقاکہ باعقوبت دوزخ برابر است

رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

میرے لئے تلواروں کی چھاؤں اور بھلیوں کی بوچھاڑ میں جنتوں کی راحتیں ہیں

دکھا دوں گا تماشادی اگر فرصت زمانہ نے

مرا ہر داغ دل اک سرو ہے بخم و چراغاں کا

وہ مسلسل اپنے تیز چاندی کے پروں سے اُتار رہا تھا۔ یہاں تک کہ آدم کے موتی محل میں جا پہنچا۔ آدم اور حوا آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاموش سنتا رہا۔

آدم ————— سب تعریف اللہ عز و جل کے لئے ہے۔ آج تم اُداس کیوں ہو؟  
حوا ————— میری باتیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ اللہ عز و جل اپنا فضل کرے۔ آج باغ کی ہوا کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے

آدم ————— خوب یاد آیا۔ ابھی وادی ایمن میں جبریل علیہ السلام تشریف لائے تھے اور انھوں نے اللہ عز و جل کے طرف سے خبر دی ہے کہ ابلیس لعین اپنی ایک راندہ ہوا فرشتہ نیز اجازت کے باغ عدن میں داخل ہو گیا ہے اور عنقریب ہم دونوں کو بہکانے والا ہے۔ لہذا اللہ عز و جل اسے ہدایت کی ہے کہ ابلیس لعین کے دھوکے میں نہ آئیں اور شجر ممنوع جو علم و روشنی کا درخت ہے اس سے ہمیشہ دور رہیں۔ کیونکہ اس درخت کا پھل کھانے سے ہم پر اللہ عز و جل کا غضب نازل ہوگا

حوا ————— سب تعریف اللہ عز و جل کے لئے ہے۔ ہم لوگ ہرگز خداوند عالم کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور ابلیس کے بہکانے میں نہیں آئیں گے  
حوا گھرے سوچ میں پڑ گئی اور بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ آدم باہر چلا گیا۔ ابلیس موقع پا کر اندر داخل ہوا۔ اور خواب میں حوا پر ظاہر ہوا

ابلیس ————— اے جنت کی رہنے والی۔ لوگوں غفلت کی نیند میں پڑی ہے۔ کیا تو نے شجر علم کا پھل نہیں کھایا جو تیری غفلت کو دور کر دے گا۔ اور تیری آنکھوں سے یک فلم چل و ندادانی کے پردے اٹھا دے گا  
حوا ————— سب تعریف اللہ عز و جل کے لئے ہے۔ میں شجر علم کا پھل ہرگز نہیں کھاؤں گی۔ کیونکہ اللہ عز و جل نے وہ پھل چکھنے کی ممانعت کی ہے۔ اور میں اللہ عز و جل کی نافرمان نہیں ہوں۔ آج ہی جبریل علیہ السلام نے خداوند عالم کے حکم کی تجدید کی ہے۔ میں اُس پھل کے قریب نہیں جاؤں گی

ابلیس ————— اے نادان عورت۔ اے علم و دانش کے نور سے بے بہرہ نادان۔ میں تجھے اور تیرے خاوند کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ تم دونوں سخت دھوکے میں ہو۔ تو جب تک علم کے درخت کا پھل نہیں کھاٹے گی۔ تجھے کیونکو معلوم ہو گا کہ تیرا دوست کون ہے اور دشمن کون۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ نادان عورت۔ علم ہی وہ نعمت ہے۔ جو کرہ عالم کی تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ خود جبریل بھی اس صفتی پھل کی لذت سے بے نصیب ہے۔ وہ بھلا تجھے اور تیرے خاوند کو کہ نیک مشورہ دے سکتا ہے۔ میں البتہ علم کے درخت کا پھل کھاتا ہوں اور تمام فرشتوں کا استا ہوں۔ میرا لقب معلم الملک ہے۔ میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ ضرور علم درخت کا میوہ کھایا کر اور اپنے خاوند کو کھلایا کر

۱۶۔۔۔۔۔ تیر کیا نام ہے ؟

ابلیس۔۔۔۔۔ ابلیس

حوا۔۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ الا باسء۔ مآءِ حوا کی آنکھ کھل گئی اور ابلیس اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا

## عدن کا ایک اور منظر

ابلیس حوا کے محل سے کوئی سو قدم پر گیا ہو گا کہ سامنے سے جبریل علیہ السلام نمودار ہوئے

جبریل۔۔۔۔۔ تو یہاں کیوں آیا ؟

ابلیس۔۔۔۔۔ تاکہ تیری کوتاہ فہمیوں کا پردہ فاش کر دوں

جبریل۔۔۔۔۔ تو یہاں کس کی اجازت سے آیا ؟

ابلیس۔۔۔۔۔ اجازت۔ میرے لئے کسی کی اجازت ضروری نہیں۔ اجازت تو صرف تیرے جیسی غلامِ دعوں

کے لئے ہے۔ میں خود اپنی اجازت سے آیا ہوں

جبریل۔۔۔۔۔ اچھا۔ تو اب فوراً چلا جا۔ ورنہ تجھے دردناک سزا دوں گا

ابلیس نے اپنا بے پناہ نیزہ اٹھایا اور قریب تھا کہ جبریل کے سینہ میں اتار دے کہ اُس کا ہاتھ خود بخود شل ہو گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے تلوار اٹھانا چاہی۔ مگر وہ ہاتھ بھی معطل ہو چکا تھا۔ اُس کے سارے بدن پر فاج گھر گیا۔

جبریل نے اپنا عصا زور سے ابلیس کے سر پر مارا۔ اور وہ شہابِ ثاقب کی طرح لڑاھکتا اور پٹختیاں کھاتا ہوا باغِ

عدن سے نیچے گرا۔ اور ساتوں آسمانوں سے ہوتا ہوا۔ ایک لقمہ دردِ مقام پر پہونچا جسے زمین کہتے ہیں

اس مقام پر آدم و حوا بھی موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں علم و دانش کے دو روشن پھیل تھے۔ دونوں شرماتے

لگے کیونکہ بالکل ننگے تھے۔ اور رونے لگے کہ اپنی خطا پر نادم تھے اور ڈرنے لگے کہ خدا کا غضب قریب تھا

ابلیس۔۔۔۔۔ اے نادان انسانو!۔ نہ ڈرو۔ نہ روؤ اور نہ شرمائو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہارے ساتھ

رہوں گا۔ کیا ہی مبارک ہیں وہ ہستیاں جو علم و دانش کا پھل ہاتھوں میں لئے ہیں

دفعۃً آسمان چھٹ گیا۔ بجلیاں چلکیں۔ ابلیس کی گردن میں لعنت کا طوق بڑ گیا۔ اور وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بن گیا

اُس کی ذریات بھی اسی زمین پر آگئی۔ اور ساری زمین پتار کی جھاگئی

محمد اسحاق (دہلوی)



# ملکہ توجہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں

اور

## علی قلی استجلو کے قتل کا راز

”قوم و ملک کی تاریخ، گزشتہ واقعات کا آئینہ ہوا کرتی ہے، اور تاریخ کی تالیف کا مقصد بھی یہی ہے، کہ آئینہ والی نسلیں گزشتہ دور کے صحیح و مستند واقعات سے باخبر ہوں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں، کہ زیادہ تر تاریخیں کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی جاتی ہیں، جب صورت حال یہ ہو، تو پھر کس طرح امید کی جاسکتی ہے، کہ تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات درج ہیں۔ وہ وقتاً بوقت صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ اس بیسویں صدی میں مذہب قویں نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اس کا دعویٰ کرتی ہیں کہ انھوں نے فن تاریخ کو اتنی حرقی دیدی ہے کہ مژدہ قویں آج زندہ ہو گئی ہیں

نیشن آج، جب کوئی انگریز اسلام کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے قلم کا سارا زور اس میں صرف ہوتا ہے، کہ اسلام انوار کے زور سے پھیلا یا گیا۔ اسلام کے ماننے والے تنگ نظر اور متعصب ہوتے ہیں۔ اور بالی مذہب (صلعم) کی شان میں اپنی ساری ہزبان گوئی و بکواس ختم کر دیتا ہے، اُس کی ساری تحقیق صرف اس لئے ہوتی ہے، کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل و خوار دیکھیں

اسی طرح جب کوئی مسلمان یا ہندو، ہندوستان کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے، تو وہ اپنی سب سے بڑی کامیابی، یا ”تاریخ دانی“ اسی میں سمجھتا ہے، کہ وہ ایسے واقعات ایک جا کر دے، جس سے خواہ مخواہ کا بھی آپس میں نفوذ و تار پید ہو جائے۔ جب کوئی ہندو عالم گیر، محمد تفلق، محمود، میر قاسم کے حالات پڑھتا ہے، اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ان لوگوں نے ہندوؤں، اور ان کے مذہب پر، کس کس طرح کا ظلم کیا ہے، تو ردا دار سے روادار ہندو، کا دل بھی دکھ جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی مسلمان، سیواجی اور دوسرے ہندوؤں کے حالات پڑھتا ہے، تو اس کی ”اسلامی رگوں“ میں بھی خون دھڑکتا ہے

ظاہر ہے، جب اس قسم کی تاریخیں ہیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جائیں گی، تو ملک کی فضا کا حال کیا ہوگا؟ یہ ایک نہایت اہم اور ضروری سوال ہے، جس پر ہمیں نہایت غور و فکر کے ساتھ تھوڑی دیر سوچنا چاہئے۔ اندون میں میرے پیش نظر، رویش دت سی، آئی، ای (Ramesh Dutt C. J. ع . کی تاریخ India under British Rule) ہے، رویش بالونے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے، کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستان کی تجارت، وصنعت و حرقت کو برباد کیا ہے۔ میرے خیال میں، بالکل اسی طرح انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کو بھی مسخ کر ڈالا ہے۔ اسکول و کالج کے غریب لڑکوں کو، درسی کتابوں کے انبار سے اتنی فرصت کہاں رہتی ہے، کہ وہ ہر تاریخی واقعہ کی تحقیق کریں، کہ آیا یہ صحیح ہے یا غلط،

آج ہندوستان کی ذہنیت جو اس قدر خراب و پست ہے، ایک قوم دوسری سے دست و گریباں ہے، ایک کو ایک پر اعتماد و بھروسہ نہیں ہے، بلاشبہ اس کی سب سے بڑی وجہ ”ہندوستان کی غلط تاریخ“ ہے، ہم ان غلط تاریخوں میں فہمی نہیں پڑھتے ہیں، کہ ہندو یا مسلمان حکمران متعصب و تنگ نظر تھا، بلکہ عیاش، نااہل و بزدل تھا۔ اس میں حکمرانی کی ذرا صلاحیت نہ تھی۔ اُس کا سارا وقت شراب و کباب، نایح دکانے، میں صرف ہوتا تھا۔ پھر ان مشاغل سے اتنی فرصت کہاں ہوتی تھی، کہ وہ عنان حکومت کو سنبھالنا

میں نے تمہید میں بہت کچھ لکھ ڈالا ہے۔ میرا اصل موضوع خمنشاہ جہانگیر و ملکہ نورجہاں کے صحیح حالات کی تحقیق ہے۔ انگریز مورخوں نے جہانگیر کے متعلق وہ سب کچھ لکھ ڈالا ہے، جو ایک عیاش و بزدل، ناکارہ و نااہل، حکمران کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ اور ”حکمران مورخ“ کی پیروی ہمارے ہندوستانی مورخوں نے بھی نہایت فراخ دلی سے کی ہے۔ ان کے مورخانہ دلغ نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنا گوارہ نہ کیا کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں، اُس کا کتنا حصہ صحیح ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جب انگریز انگلستان کی تاریخ لکھتا ہے، تو اُسے اپنے حکمران کی کوئی بُرائی نظر نہیں آتی، اور اگر واقعاً کچھ ہوتی بھی ہے، تو اُس کو نہایت خوش اسلوبی سے نہانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا اہم مقصد یہ ہوتا ہے، کہ وہ اپنی قوم و ملک کی تاریخ، بہترین نقش و نگار کے ساتھ پیش کرے، اس کی یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ اس کے حکمران کی سیرت و جوہادوں کے لئے (Ideal) کا کام دے۔ لیکن اگر کبھی غریب جہانگیر کے منہ سے یہ نکل گیا تھا کہ:-

”میں نے سلطنت نورجہاں بیگم کو بھتدی، مجھے ایک بیر شراب اور نیم روٹ

کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے“

تو صرف اتنی سی بات پر، مورخوں کا قطعی فیصلہ ہو گیا، کہ جہانگیر شرابی اور عیاش تھا، اس کو امور سلطنت سے کسی قسم کا کوئی واسطہ اور لگاؤ نہ تھا۔ جو کچھ کرتی تھی وہ نورجہاں۔ سلطنت کی باگ اسی کے ہاتھ میں تھی، وہ جسے اور جس طرح چاہتی تھی موڑتی تھی

جو چند میں نے اس وقت تک کہا ہے، اوس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے، کہ ہماری تاریخیں کس روشنی میں لکھی گئی ہیں، اور کبھی جائز ہی ہیں۔ اُس کا اثر ہم پر کیا ہوا ہے، اور آئے دن ہو رہا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ملک کی فضا مسموم ہو گئی ہے، ہماری ذہنیت خراب ہو گئی ہے۔ دل و دماغ مغلط و ماؤف ہو گئے۔ صحیح و غلط واقعات کی تیز جاتی نہ ہی ہے آپس میں نفرت و حقارت کے جذبات بھرک اٹھے ہیں

بہر کیف جہانگیر و نورجہاں کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہیں۔ اور یہ تمام کی تمام کہانیاں انگریز مورخوں کی خود ساختہ ہیں۔ میں اپنے اس مضمون میں حسب ذیل واقعات سے بحث کروں گا

(۱) جہانگیر و نورجہاں سے ملاقات کس طرح ہوئی،

(۲) کیا یہ صحیح ہے کہ جہانگیر نے شیر افگن کو محض اس لئے قتل کرایا تاکہ وہ نورجہاں کو حاصل کر سکے،

(۳) کیا یہ حقیقت ہے کہ جہانگیر میں حکومت کی صلاحیت مفقود تھی اور امور سلطنت کی ساری ذمہ داری نورجہاں پر تھی

جہانگیر کا صرف ایک مشغلہ پانچ و رنگ و شراب و کباب تھا

یہ اور اسی قسم کے بہت سے چھوٹے بڑے واقعات ہیں جن سے اس مضمون میں شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے گی اور یہ بتلایا جائے گا کہ خود مؤرخین کے بیانات کس قدر غیر مربوط ہیں

قبل اس کے کہ شیر افگن کے قتل، یا نورجہاں کے اثر و اقتدار کے متعلق کچھ کہا جائے، سب سے پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہئے۔ کہ جہانگیر کی یہ فریفتگی کب سے شروع ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں جتنی تاریخیں بھی میری نظر سے گذری ہیں۔ تقریباً ہر ایک نے اس کو ایک نئے واقعہ سے شروع کیا ہے

منوچی بکھتا ہے کہ ایک روز جہانگیر ٹہل رہا تھا۔ اس کی نظر ایک نہایت سچی سجائی خوب صورت کشتی پر پڑتی ہے۔ اوس میں .... ایک حسین و جمیل عورت کو بیٹھا ہوا دیکھ کر اوس سے ملنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ فوراً حکم دیتا ہے کہ لوگ بہترین تجارت لے کر کشتی میں جائیں، اور شاہزادے کی طرف سے اوس کو محل میں آنے کی دعوت دیں۔ مہر النساء، جہانگیر کے خفیہ کو یہ کہتے ہوئے واپس کر دیتی ہے، کہ اوس کا شوہر زندہ ہے، اور اسے خزانے کے حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ ملازم ہے اس کی زندگی میں اوس کا ایسا کرنا (یعنی شاہزادے کی طرف سے کسی تحفہ کا قبول کرنا، یا اس کی بیعت پر محل میں آنا) کسی طرح جائز نہیں سمجھتی، اور نیز وہ اوس کو بڑا سمجھتی ہے

اس فاضل مؤرخ نے صرف یہی نہیں کیا ہے، کہ اوس نے سلیم کو او باباشوں اور بد معاشوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے، بلکہ اوس نے مہر النساء کی عصمت کو بھی داغدار بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ بتلانا چاہتا ہے کہ مہر النساء ایک ادنیٰ درجہ کی عورت تھی، اوس کے پاس تحفہ و تحائف نہایت آسانی سے پہنچ سکتے تھے

بدترین سے بدترین کرکٹر کے انسان سے بھی یہ جرات ناممکن ہے کہ وہ اس طرح ایک بیک کسی شریف عورت سے سلسلہ جنباتی شروع کر دے۔ یہ سب کچھ ان لینے کے بعد بھی کہ سلیم شہزادی تھا عیاش تھا کیا کوئی باوجود ان تمام برائیوں کے ایک منٹ کے لئے بھی یقین کرے گا کہ سلیم نے ایک شریف عورت کے ساتھ، جس کو وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا، یا اگر جانتا ہوگا، تو دیکھنا تھا۔ ایسی ہمت کرے گا؟

اسی سلسلہ میں فاضل مؤرخ کا ایک جملہ نہایت قابل غور ہے آپ فرماتے ہیں ۱۔

”میرا شوہر زندہ ہے، اور دربار میں ایک ادنیٰ ملازم ہے، اس کی زندگی

میں ایسا کرنا کسی طرح جائز نہیں سمجھتی“۔

اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے، کہ اگر شیر افکن مر جائے، یا مار ڈالا جائے، تو مہر النساء ہر طرح حاضر ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے بادشاہ فوراً شیر افکن کو لکھتا ہے، کہ وہ حکم نامہ پاتے ہی صوبہ دار سے ملے، اور صوبہ دار کو لکھ دیا جاتا ہے کہ جب شیر افکن تمہارے پاس آئے، تو اس کو قتل کر دو۔ شیر افکن قتل ہوتا ہے، لیکن اپنے ساتھ بہتوں کو قتل کرنے کے بعد جو کچھ میں نے ابھی لکھا ہے، اس کی پوری پوری تصدیق منوچھی کے اُن سطور سے ہو جاتی ہے، اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے کہ شیر افکن کا قتل مہر النساء کی ایما سے ہوا

اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ قتل کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ قاتل کون ہے؟ جہانگیر یا مہر النساء؟ فاضل مؤرخ کی تاریخ دانی ابھی ختم نہیں ہوتی ہے، لکھتا ہے کہ شیر افکن کے قتل کے بعد، مہر النساء سلیم کے حضور میں پیش کی جاتی ہے، لیکن مہر النساء کی برہمی کا یہ حال تھا، کہ شادی بیاہ تو کجا اس نے جہانگیر سے باتیں کرنے سے بھی قطعی انکار کر دیا، اس طرح مہر النساء کی غلطی میں ایک سال گزر جاتا ہے، سلیم چھپ چھپ کر اس کے پاس جاتا ہے، لیکن اس کی رسائی نہیں ہوتی! آخر ایک سال بعد چند شرائط کے ساتھ نکاح کے لئے راضی ہوتی ہے

شرایط :-

(۱) بادشاہ کی تمام بیویوں پر اس کو فوقیت حاصل ہو،

(۲) اس کا باپ اعتماد الدولہ بنایا جائے،

(۳) اس کے بھائی اور دوسرے قرابت دار حکومت میں اعلیٰ عہدوں کے حقدار تصور کئے جائیں،

جب شیر افکن کا قتل خود مہر النساء کی منشا اور ایما کے مطابق ہوا تھا، تو پھر اس رنج و غصہ کے کیا معنی؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ مہر النساء کا کمر اور اس کی عیاری تھی، تو پھر آخر اس کی ضرورت؟

جب ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں شادی ہوتی ہے، یا ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جب اس قسم کا کوئی ہمشہہ ہوتا ہے، تو بعض سیاسی مصالحوں کے لحاظ سے ایک دوسرے کی شرطیں منظور کرتے ہیں، لیکن یہاں کیا تھا؟ ایک شہنشاہ ایک معمولی عورت سے شادی کرتا ہے۔ پہلی شرط کہ اسے تمام بیبیوں پر فوقیت حاصل ہو، حالانکہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ نور جہاں حسن و جمال میں سب میں ممتاز تھی، اگر یہ تمام واقعات صحیح ہیں، تو جہانگیر تو خود ہی مہر النساء کا دیوانہ و فریفتہ تھا۔ وہ بلا کسی عمدہ پہلوں کے بھی اس کو اوروں سے زیادہ محبوب رکھتا

دوسری شرط یہ تھی کہ مہر النساء کا باپ اعتماد الدولہ بنایا جائے، حالانکہ وہ جہانگیر و مہر النساء کے اس جدید رشتہ سے پہلے ہی اعتماد الدولہ کے خطاب سے ملقب ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے یہ دوسری شرط بھی کتنی سہل بلکہ غلط ہے اور یہ تمام "شرایط" کس قدر لغو اور مضحکہ خیز ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل مورخ نور جہاں کو جہانگیر کا سب سے زیادہ محبوب و منظور نظر دیکھ کر، اور غیاث بیگ کے اس طرح اعتماد کو دربار میں دیکھ کر، اور نیز آصف خاں کے اثر و اقتدار کو دیکھ کر، اس نے یہ اندازہ لگایا کہ ہونہ ہو یہ سب کچھ کسی شرط ہی کے ماتحت ہوا ہو گا۔ اور ظاہر ہے یہ شرط نور جہاں نے اپنی شادی کے وقت جہانگیر سے کی ہوگی! ہے ہمارے "فلسفی مورخ" کی جدت و باغ! کہاں سے کہاں جا کر کر لی ملتا ہے!

مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ کے متعلق پروفیسر بیٹن پر شاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :-

یہ فرح کر لینا نہایت سخت غلطی ہوگی غیاث بیگ اپنی بیٹی نور جہاں کے ہاتھوں میں کھلونا

تھی۔ اسی کے سالما سال کے خیرات اس کا ذوق سلیم اس کی صلاحیت و قابلیت ان تمام

چیزوں نے مل کر اس کو وہ بارشای کا ایک نہایت اہم رکن بنا دیا تھا

آصف خان کے متعلق پروفیسر موصوف لکھتے ہیں :-

وہ ایک ذہن پرست محاسب تھا اور امور سلطنت کا بہترین سلیقہ رکھتا تھا

باپ اور بیٹے کے باوجود ان گونا گوں عیبوں کے جہانگیر یہ الزام کس طرح عائد ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے صرف نور جہاں کی خاطر یا متوجہی کے خود ساختہ شرائط کے ڈر سے ان لوگوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں سے سرفراز کیا؟ اس وقت تک متوجہی کے متعلق جو کچھ کہا گیا اس سے نہایت آسانی کے ساتھ دوسرے "مورخین" کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے

ڈو (Dowry) ایک مزے کی بات لکھتا ہے کہ :-

سلیم ایک روز غیاث بیگ کے یہاں دعوت میں گیا ہوا تھا۔ اخیر میں جب لوگ رخصت ہو گئے

اور صرف چند مخصوص ہمان باقی رہ گئے (جن میں ایک سلیم بھی تھا) تو غیاث بیگ نے مہر النساء کو

جو فن موسیقی میں کیٹا تھی، بلایا، مہر النساء نے خوب خوب اپنا ہنر دکھلایا، اور کچھ اس طرح  
پڑنجی اور گائی، کہ اوروں کا وہ معلوم نہیں کیا حال ہوا۔ سلیم پر معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سحر  
کر دیا ہے۔ وہ خود رفتہ اور بیسوت ہو رہا تھا، پیروں کچھ نہ سمجھ سکا کہ وہ کہاں ہے اور کیا دیکھ  
رہا ہے، مہر النساء اور سلیم کی "محبت" ہمیں سے شروع ہوتی ہے

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اوس زمانہ میں ایسا دستور تھا کہ شریف زادیاں آج کل کے یورپ کی شریف زادیوں کی  
طرح عیش و نشاط کی محفلوں میں آکر گایا اور ناچا کرتی تھیں؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اوس وقت شریف گھرانوں میں موسیقی کا چرچا ہو  
ظاہر ہے شریف لڑکیاں گانا یا ناچنا نہیں سکھائی جاتی تھیں۔ تو پھر یہ سوال کیا جاسکتا ہے۔ کہ آخر اس فاضل مورخ نے یہ لکھا کس طرح  
معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سلیم غیاث بیگ کے یہاں اکثر جایا کرتا ہوگا۔ اس طرح اس کو کبھی مہر النساء کو دیکھ لینے کا موقع مل گیا ہوگا  
رنجی (Ranjit) لکھتا ہے:-

قبل اس کے کہ نو بہاں اپنے باپ اغانیاں بیگ، اکانفارت سلیم سے کرائے وہ خود اپنی ذاتی  
قابلیت و لیاقت سے اکبر کے دربار میں عزت و وقار کی جگہ حاصل کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ  
خود سلیم اس کے یہاں مدعو ہو کر جایا کرتا تھا

اب بالکل واضح ہو گیا کہ سلیم اکثر و بیشتر غیاث بیگ کے یہاں مہمان بنکر جایا کرتا تھا۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ اوس نے آتے جاتے  
ہوئے کبھی مہر النساء کو دیکھ لیا ہو اور یہ ایک گنتی ہوئی بات بھی معلوم ہوتی ہے  
مہر النساء اور سلیم کی ملاقات کے متعلق جو سب سے زیادہ مشہور روایت ہے وہ یہ کہ مہر النساء اپنی ماں کے ساتھ اکثر محل میں آیا  
کرتی تھی اس طرح سلیم کو اکثر اس کے دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع مل جاتا تھا  
اس قسم کی ملاقات کا واقعہ انارکلی کے متعلق بھی مشہور ہے، اور انارکلی کی موت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اکبر نے  
خود سلیم اور انارکلی کو اشاروں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور سلیم اور انارکلی کی اس گستاخی کو وہ برداشت نہ کر سکا اور فوراً  
انارکلی کے سنگسار کا حکم دے دیا

درحقیقت اس قسم کے واقعات شاہی حرم کو بدنام کرنے کے لئے مورخین نے گڑھے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاہزادے ایسے  
بدکار اور بد اطوار ہوا کرتے تھے کہ شریف ہونیٹیوں کا شاہی محل میں آنا مشکل تھا۔ بلا کسی ادنیٰ و اعلیٰ شریف و در ذیل کی تیر کے جو آئی  
اس پر آنکھ گڑائی۔ بلاشبہ شاہزادے بے باک و آداد ہوا کرتے تھے، لیکن اتنا نہیں جتنا ہمارے یہ مورخین رنگ و روغن کے

صفحہ ۳۷ سے الفسٹن (Fahneston) صفحہ ۲۸۳ بعض مورخین کا یہ خیال ہے۔ کہ مہر النساء کی اہل ہندوستان نہیں

آئی تھی بلکہ یہاں آتے ہوئے راہ میں اوس کا انتقال ہو گیا تھا

ساتھ دکھاتے ہیں۔ باوجود ان تمام برائیوں کے جو بادشاہ و شاہزادے اور شاہی محل کے متعلق مشہور ہیں۔ شریف ہو بیٹیوں کی صحبت و مشرافت ہمیشہ محفوظ رہا کرتی تھی

انگلستان کے ایک مشہور ناول نویس *Renold* کا یہ جملہ نہایت عبرت انگیز ہے :-

”نعلینا دھڑائیں اپنی ماں اور ملکہ منظر کو معصوم سمجھتا ہوں“

جہاں خود یہ حال ہو وہاں اون مورخین کا مسلمان بادشاہوں کی عیش و نشاط کی محفلوں کے ان افسانے کو سن سن کر ان کے دماغی توازن کا کیا حال رہا ہوگا۔ خود اندازہ کیجئے !!  
*Pietro Della Vella*، لکھتا ہے :-

اوس کے (مہر النساء) شوہر کے انتقال کے بعد سلیم نے اوس کو دیکھا تھا، اور اسی وقت

سے وہ اس سے محبت کرنے لگا۔

اب تک جتنے واقعات بھی میں نے لکھے ہیں۔ اور جو کچھ نور جہاں اور جہانگیر کے متعلق مشہور ہے اس میں یہ سب سے زیادہ عجیب ہے۔ حالانکہ اگر ہم اس کو تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھیں تو اتنا ”عجیب“ نہ معلوم ہوگا اب یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حقیقت و اصلیت کیا ہے۔ شیر افگن کے متعلق جو کہانیاں مشہور ہیں اس کی روشنی میں جانچنا ہوگا۔ اس کے بعد پھر ہم نہایت آسانی سے معلوم کر لیں گے کہ مہر النساء کو سلیم نے کب دیکھا۔ اور شیر افگن کے قتل کی اصلی وجہ کیا ہے ؟

عام طور پر شیر افگن کے قتل کے متعلق جو واقعہ مشہور ہے، اور جس سے ہماری تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ وہ یہ کہ سلیم مہر النساء سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ اکبر نے انکار کر دیا۔ اور بجائے سلیم کے اس کی شادی شیر افگن سے کر دی گئی تھی۔  
کنیڈی (*Kannady*) لکھتا ہے :-

جہانگیر تخت نشین ہونے ہی صوبہ ارد کو یہ ہدایت بھیجتا ہے کہ مہر النساء کو شیر افگن سے طلاق دلا دو

اور اسکو مہر النساء اور بادشاہ بھیجو، لیکن شوہر شیر افگن، نے اعتراض کیا، اور اسکا یہ اعتراض جانو

تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے صوبہ دار کے بیٹ میں پھری جو نکدی اور خود بھی پھری جو نکدی

دیا، اب مہر النساء اور بادشاہ میں بھیج دی گئی لیکن اس نے جہانگیر سے کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے

صاف انکار کر دیا۔ کہہ کر وہ خوب جانتی تھی کہ جہانگیر اس کے شوہر کا قاتل ہے اور اسکو خیال میں یہ جانتا تھا

الغرض (*Elphinstone*)، بھی صرف الفاظ کی الٹ پھیر کے ساتھ تقریباً سب کچھ یہی لکھتا ہے۔

ہولڈن (Holdan) لکھتا ہے کہ :-

جہانگیر قطب الدین کو جنگال کا گورنر بنا کر بھیجتا ہے، اور تاکید کرتا ہے کہ وہ خیر افکن کو مجبور کرے

کہ وہ مہرالنسا کو طلاق دیدے۔ اور اسکو گورنر کے حوالہ کرنے تک وہ دربار میں ہی رہے۔ لیکن پھر

خود ہی ہولڈن لکھتا ہے کہ "لیکن ان تمام باتوں کی کوئی تکفیل نہیں" ۱۷

سر تھامس رو (Thomas Row) لکھتا ہے کہ "اس نے نورجہاں کے اقتدار اور جہانگیر پر اس کے اثر کے متعلق نہایت

دور دار الفاظ میں لکھا ہے لیکن شیر افکن کے قتل کے متعلق اس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے

ایڈورڈ تیری (Edward Terry) جس نے ۱۶۰۷ء سے ۱۶۱۵ء یعنی مسلسل تین سال تک ہندوستان

کی سیاحت کی تھی، وہ اپنے سفر نامے میں ہندوستان کے متعلق وہ سب کچھ لکھتا ہے جو ایک سفر نامہ میں ہونی چاہئے۔ اس نے مذہب  
یہاں کے لوگوں کے عادات، اطوار، اہرام کے لباس، حکومت کی دفتری زبان، ہندوستانی آبادی و رقبہ، کے متعلق نہایت  
تفصیل سے بتانے کی کوشش کی ہے، لیکن اس نے ایک لفظ بھی جہانگیر اور نورجہاں کے مشہور زمانہ افسانہ کے متعلق  
نہیں لکھا حالانکہ صرف پانچ برس قبل یعنی ۱۶۰۷ء سے

جہانگیر اور مہرالنسا کی شادی ہوئی تھی وہ ایک پر مہرالنسا کا ذکر خاص طور پر کرتا ہے، لکھتا ہے :-

نورجہاں جہانگیر کی محبوب ترین ملکہ تھی اس نے اپنی ذاتی خوبوں کی وجہ سے ہستوں کو اپنا دست بجالا تھا

اس سیاح نے شیر افکن کے قتل یا طلاق کا مطلقاً کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اس سے سالہ قیام کے دوران میں "راز کی

باتیں" اس کو معلوم ہو جانی چاہئے تھیں۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ واقعتاً جہانگیر اس قدر ذلیل و اوباش تھا کہ وہ کسی

شریف کو اس طرح مجبور کرے گا کہ وہ اپنی بیوی کو صرف اس کے ہوا و ہوس کو پورا کرنے کے لئے طلاق دیدے، جہانگیر کے کیریکٹر کو بغور

مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ وہ شہزادی تھا، رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا، اس سے لطف اندوز ہوتا تھا

عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ زاہد خشک نہ تھا۔ تو اس کے کیا معنی کہ وہ ردالت پر اتر آیا تھا ؟

جہانگیر کو آخر اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ شیر افکن کو طلاق کے لئے مجبور کرے، حالانکہ اس کے لئے کوئی بڑی بات

نہی کہ وہ بلا طلاق دلوائے ہوئے بھی مہرالنسا کو حاصل کرتا، اور شراً تو کسی کو طلاق کے لئے مجبور کرنا بھی تو جائز نہیں ہے!

شاہ محمد زہیر (دہری)

(باقی)

۱۷ تاریخ ہندوستان از ہولڈن (Holdan) صفحہ ۴۲۲

۱۸ جہانگیر از پروفیسر مینی پرشاد صفحہ ۱۳۲

۱۹ (Early travel by Tosi) صفحہ ۲۲۱



# باب الانتقاد

## جگر کے سوشلر

یہ مختصر سا رسالہ بھی (اصغر کے سوشلر کی طرح) جامعہ ملیہ نے شائع کیا ہے اور محمود علی خاں صاحب اس کے بھی مرتب ہیں۔ شروع کے چند صفحات میں جگر کے سوانح زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں ان کی خصوصیات شعری کو بھی ظاہر کیا گیا ہے

انتخاب کنندہ نے جگر کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جو مجاز کی شاعری کے لئے مخصوص تھا، دوسرا وہ جب جگر کسی کے مرید ہو کر "بلند خیالات بلند الفاظ میں" کہنے لگے اور تیسرا دور حاضر جب "بلند خیالات سادہ الفاظ میں" نظر آتے ہیں۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ پہلے جگر صرف اُن جذبات محبت کو ظاہر کرتے تھے جن کا تعلق اس دنیا کے عشق و محبت سے ہے اور اب وہ اس دنیا سے گزر کر کسی اور دنیا کی باتیں کرتے ہیں جن کا دوسرا نام انتخاب کنندہ کی زبان میں تصوف و حکمت وغیرہ خدا جائے کیا گیا ہے

گزشتہ ماہ کی اشاعت میں ہم "اصغر کے سوشلر" پر تنقید کرتے ہوئے تصوف و تغزل کے باہمی تعلق پر کافی بحث کر چکے ہیں اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، لیکن جس حد تک جگر کی شاعری کا تعلق ہے، یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ کہ ان کی شاعری محمود علی خاں صاحب کے اصول انتخاب پر یا ان کا اصول انتخاب جگر کی شاعری پر منطبق ہوتا ہے یا نہیں چونکہ انتخاب کنندہ نے انتخاب میں اس کا لحاظ نہیں رکھا کہ ہر دور کی شاعری کے نمونے علیحدہ علیحدہ یکجا جمع کر دیے جاتے اس لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے کس شعر کو کس رنگ کا سمجھ کر انتخاب کیا ہے، تاہم ایک عمومی تبصرہ کے سلسلہ میں بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ انتخاب کنندہ نے کس شعر کو اپنے کس ذوق کے ماتحت پسند کیا ہے

جگر کے دور اول کی شاعری کے جو نمونے انہوں نے پیش کئے ہیں ان میں غالباً حسب ذیل قسم کے اشعار شامل ہونگے۔

سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں

مجھ ناتوان عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا دامن بکڑ لیا تو بچھڑا یا نہ جائے گا

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں یہ ہر ایک تازہ پیام کبھی آ کے منظر عام پر کبھی ہٹ کے منظر عام سے  
دوسرا دور جس میں بقول محمود علی خاں صاحب ”بلند خیالات بلند الفاظ میں“ ظاہر کئے گئے ہیں اور جو ان کے  
نزدیک تصوف کا رنگ لئے ہوئے ہیں غالباً ذیل کے اشعار سے متعلق ہوگا :-

مجھے تلاش کراے بخود ہی شوق سجود بہو بچ کے منزل مقصد پہ لکھو گیا ہوں میں  
فریب خوردہ رنگینی ادا ہوں میں نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں  
میری حیرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب میرا دمہ ہے کہ جلو سے نہ پریشاں ہو گئے  
گو سراپا حجاب ہیں پھر بھی تیرے رخ کے نقاب ہیں ہلکے  
تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے  
تمام اٹھ گئے پرے تو اس سے کیا حاصل مرہ تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا  
فطرت مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے  
حسن تک دیکھ لیں سب جس کے جلوؤں کی بنا مجھ تک آئے تو مرا حال پریشاں ہو گئے  
نہراے دل درد مند محبت تصور کسی کا پریشان ہو گا

تیسرا دور جس کے متعلق انتخاب کنندہ نے لکھا ہے کہ ”بلند خیالات سادہ الفاظ میں“ ظاہر کئے ہیں دور  
اول سے علحدہ ہم کو کمین نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے دور ثانی کے بعض ایسے اشعار جو جلد سمجھ میں آجائے ہیں اور جن کی  
تأویل کی ضرورت نہیں ہوتی، انھوں نے دور ثالث سے متعلق کر دیے ہوں

بہر حال انتخاب جس اصل کو بھی سامنے رکھ کر کیا گیا ہو، اس میں شک نہیں کہ جگر کے کلام میں دورنگ بالکل علحدہ  
علحدہ نظر آتے ہیں جن کی تقسیم انتخاب کنندہ نے مجاز و حقیقت کی ہے اور ہمارے نزدیک اس کی تقسیم صرف یوں ہوتی  
چاہئے کہ ایک دور کا کلام واقعی تزل کے صحیح معیار پر اترتا ہے اور دوسرا اس سے ہٹا ہوا ہے، یعنی اگر سوشل انھوں نے  
ایسے کلمے ہیں جن سے وجدان صحیح بغیر کسی تاویل و کاوش کے لطف اندرز ہو سکتا ہے تو دس ایسے بھی نظر آتے ہیں جو  
مشاعروں میں تو زیادہ سے زیادہ داد حاصل کرتے ہیں لیکن یوں اگر تنقید جائے تو وہ سوائے چند خوبصورت الفاظ و تراکیب  
کے مجموعہ کے اور کچھ نہیں ٹھہرتے۔ چنانچہ قسم دوم کے جو اشعار اوپر درج کئے گئے ہیں وہ سب اسی انداز کے ہیں  
فریب خوردہ رنگینی ادا ہوں میں نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں

اگر دوسرے مصرعہ میں نظر سے مراد اپنی نظر ہے تو مضمون کی سخافت ظاہر ہے کیونکہ اس طرح مطلب یہ پیدا ہوتا  
ہے کہ محبوب کی خوش ادائیاں صرف اپنی نظر کا فریب ہے ورنہ حقیقت کچھ نہیں، لیکن اگر یہ چند شاعریں محبوب کی نگاہ  
کی ہیں تو پھر دونوں مصرعے غیر مربوط رہتے ہیں کیونکہ معشوق کی نگاہ رنگینی ادا کا فریب پیدا کرتے والی نہیں

میری حیرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہوں گے  
اس شعر میں صرف لفظ پریشاں پر مفہوم کی بنیاد قائم کی گئی ہے جو کھنوی انداز بیان کے لحاظ سے ممکن ہے بعض لوگوں  
کو اپیل کر کے لیکن حقیقت کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے  
مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ نقاب اٹھا دیں گے تو بھی میں فطرت سے آپ کا نظارہ نہ کر سکوں گا، خیال اچھا  
ہے لیکن ”جلوے نہ پریشاں ہوں گے“ کہہ کر اس کو بُری طرح ادا کیا گیا ہے  
اسی قسم کی تعبیر کا یہ شعر بھی ہے :-

ٹھہرے دل درمند محبت تصور کسی کا پریشاں ہو گا  
غزل میں شعر کی خوبی یہ ہے کہ بغیر کسی تصنع کے جذبات کا اظہار ہو جائے اور تصوفانہ رنگ تعبیر میں ہی بات مفقود ہوتی  
ہے۔ بلکہ اگر غلو سے کام لیا جائے تو شعر میں ہو جاتا ہے۔ مثلاً  
گو سراپا عجب ہیں بھس بھی تیرے رُخ کی نقاب ہیں ہلوگ  
تاویل اور کھینچ تان کا ذکر نہیں کہ وہ تو چرکین کے کلام کو بھی سرتاسر تصوف و ملکیت ثابت کر سکتا ہے، یوں دیکھو  
کہ اس سے کوئی مفہوم پیدا ہوتا ہے یا نہیں  
غالب کا مشہور شعر ہے :-

اصل شہود و شاہد و شہود ایک ہے حیراں ہوں پھر شاہدہ ہو کس حساب میں  
غالب تو خیر شعر کہنے کو کہ گیا لیکن اس کے بعد شعرا نے اس سے جس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا اس کا بیان بہت  
درزاگ ہے، جگر کے یہاں بھی اسی فلسفہ ”ہویت“ کے بعض انتحابات ملاحظہ ہوں  
تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے  
تمام اکٹھے گئے پر دے تو اس سے کیا حاصل مزہ تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا  
نظارہ کا درمیان اگر حجاب بن جاتا، یا خود دیکھنے والے کا بھی ”درمیاں“ نہ ہونا، حقیقتاً کوئی مفہوم نہیں رکھتا  
اسی طرح غالب کے اس مصرعے نے

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لوگوں کو ایسے خیال کی طرت مائل کر دیا جس کا غلو یقیناً گمراہ کن ہے۔ جگر لکھے ہیں  
فطرت مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھ کو چھپا کر دیکھتے  
دوسرا مصرعہ اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتا

الغرض جگر کے کلام کا وہ حصہ جو انتخاب کنندہ کی رائے میں ”بلند خیالات“ سے متعلق ہے ہمارے نزدیک جگر

کے لئے قابلِ فخر نہیں ہو سکتا ، لیکن اس رنگ سے ہٹ کر جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ بالکل معیاری چیز ہے اور اس وقت کا بہتر سے بہتر شاعر ان پر ناز کر سکتا ہے ، مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

ہنسی پھڑپھڑانے لگی عشق کے فسانے کی      نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی  
گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ      سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے  
قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی      نظر میں پھر گئی تصویرِ آشیانے کی  
کہاں میں اور کہاں اب فسانہٴ عجم عشق      وہ تغات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا  
لیکے خطا ان کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن      تھر تھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا  
ہائے یہ حُسنِ تصور کا فربہٴ نگِ بُو      میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہا کر ہی گیا

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جیسے حُسن      جب دیکھے اُک نیندی آنکھوں میں بھری ہے

جگر کی وہ خصوصیت جو اس دور کے دوسرے خوشگو شعراء سے اُن کو ممتاز کرتی ہے ” دلولہ و جوش “ ہے یعنی اُن کے جذبات محبتِ تشاؤم و قنوط کی طرف مائل نہیں ہیں ، بلکہ ان میں ایک خود دارانہ رلودگی پائی جاتی ہے ، ایک خاص قسم کا احساسِ مطمئن نظر آتا ہے ۔ اور اسی لئے ان کی شاعری نکھو اور دہلی دونوں اسکولوں سے قدرے علیحدہ ہے ۔ جو ان کے پہلے اُستادِ آراغ اور دوسرے اُستادِ تسلیم کے رنگ کے امتزاج سے مل کر پیدا ہوئی ہے ۔ ممکن ہے اُن کے کلام میں فلسفہٴ حیات کے وہ نکات بھی پائے جاتے ہوں جو عشق و محبت کی دنیا میں انتہائے استغراق کے بعد ایک بے نیازانہ کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں ، اور معنی آفرینی و ندرتِ تعبیر کے لحاظ سے بھی قابلِ لحاظ ہو ا کرتے ہیں ، لیکن ان کا غالب رنگ وہی ہے ، جس میں کامیاب عشق و محبت کا جوش و دلولہ پایا جاتا ہے اور جو اس نوع کی رنگینیوں سے مالا مال ہے مگر افسوس ہے کہ اس مجموعہٴ انتخاب میں جگر کے اس حقیقی رنگ کے شعر بھی بہت کم نظر آتے ہیں ۔ ان کی وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے :-

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سمائے ہیں

یہ چل رہے ہیں وہ بھر رہے ہیں ، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

جگر کی شاعری کی سچی تصویر ہے ۔ اسی غزل کا ایک اور شعر بھی انتخاب میں نظر آتا ہے :-

وہی قیامت ہے قد بالا وہی ہے صورت ، وہی سراپا

لبوں کو جنبش ، نگہ کو لرزش ، کھڑے ہیں اور سر کھٹے ہیں

جگر اپنی طبیعت و فطرت کے لحاظ سے بہت لا اُبالی واقع ہوئے ہیں ۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ وہ اپنی غزلوں پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی تکلیف بھی کم گوارا کرتے ہیں ۔ اُن کا ایک شعر ہے :-

ایک تجلی ، ایک تبسم ، ایک شکوہ بندہ نواز      اس سے زیادہ اسے غمِ جانان کی قیمت کیا کہئے

پہلے مصرعہ میں ”تجلی، تبسم، نگاہ“ کو بغیر کسی حرف عطف کے اس طرح یکجا کر دیا گیا ہے کہ ”دل کی قیمت“ یہ تینوں چیزیں قرار پاتی ہیں، دراصل ایک مقصود یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک کافی ہے۔ علاوہ اس کے ”ایک تجلی“ کتنا ذوق پر نگوار بار ہے، اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا۔

ایک تبسم، ایک جھلک، یا ایک نگاہ بندہ نواز

نودوں نقص دور ہو جاتے

دوسرے مصرعہ میں ”غم جاناں“ سے خطاب کرنا بھی بے محل ہے۔ اگر براہ راست ”جاناں“ سے خطاب کیا جاتا

تو شعر زیادہ لطیف ہو جاتا

ایک اور شعر ہے :-

ظلم کیا اب تو کرم بھی ہے گوارا مجھ کو

تیری اس اخک بھری تبسم ندامت کی تم

اس شعر کی بنیاد یہ خیال ہے کہ محبوب کا کرم اس کے ظلم سے زیادہ تباہ کرنے والا ہے، یعنی لطف و محبت کی تبسم اور اسیاں بہت زیادہ ہلاکت آفریں ہیں۔ یہ خیال بجائے خود اس میں شک نہیں کہ بہت لطیف ہے، لیکن دوسرا مصرعہ اس خیال سے غلط ہے اور کمزور ہو گیا ہے

صورت حال یہ ہے کہ محبوب سامنے موجود ہے اور اپنی اشک آلود نگاہوں سے اظہار ندامت کر رہا ہے۔ یعنی اس کی یہ کیفیت لطف و عنایت کا اظہار کرنے والی ہے۔ اس لئے پہلے مصرعہ میں اس کو بہ لحاظ حقیقت ظلم نہیں کہہ سکتے۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا

لطف کیا اب تو تبسم بھی ہے گوارا مجھ کو

کیونکہ تبسم کرنے کے بعد محبوب پھر اس کی تلافی اپنی ندامت سے کہے گا جو عاشق کی عین مراد ہے ایک شعر اور ہے :-

مجھے تلامش کراے بخودی شوق بخود

پہونچ کے منزل مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

دوسرے مصرعہ میں ”منزل مقصد“ کی ترکیب محل نظر ہے، کیونکہ دونوں لفظ ”ظرفیت“ کا مفہوم رکھتے ہیں اسی لئے منزل کی اضافت ہمیشہ مقصود یا کسی دوسرے ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جو ظرفیت کے مفہوم سے غلط نہ ہو

نگاہ دل بھی یکایک اسے سمجھ نہ سکی

وہ ہر کرم جو پس پردہ عتاب ہوا

اس شعر میں لفظ نگاہ کوئی معنی نہیں دیتا صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے یوں کہہ سکتے تھے

غضب ہے، دل بھی بیکاسے سمجھ نہ سکا

یہاں ”غضب ہے“ کا استعمال صرف اظہار حیرت و استعجاب کے لئے ہوا ہے۔

اٹھانہ دیدہ بلیل سے پردہ حیرت

ہلاک ہو گئی کجخت رنگ و بو کے لئے

اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ”بلیل رنگ و بو کے لئے ہلاک ہو گئی پھر بھی پردہ حیرت نہ اٹھا“ دوسرا

یہ کہ ”دیدہ بلیل سے پردہ حیرت نہ اٹھا یہاں تک کہ رنگ و بو کے لئے ہلاک ہو گئی“ لیکن ان میں سے کسی مفہوم کے

لحاظ سے پردہ حیرت مناسب نہیں۔ اگر کسی طرح ”پردہ فریب نظر“ لاکر مصرعہ ترتیب دیا جاتا تو بیشک ”ہلاک

ہو گئی کجخت“ کا پورا لطف آ سکتا تھا

انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم

پیام دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

چونکہ پیام واحد ہے اس لئے پہلے مصرعہ میں بجائے انھیں کے اسے لکھنا زیادہ موزوں ہوتا۔ بعض بعض جگہ ترکیبوں میں

نامانوس نقل بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً

بھرم کھونا کہیں اے دل نہ عشقِ معتبر ہو کر

یا شروعِ راہِ محبت ارے معاذ اللہ

یا یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لامحدود

عشقِ معتبر، شروعِ راہِ محبت اور عشقِ لامحدود، نفیس ترکیبیں ہیں

الغرض جگر کے سو شعر کا انتخاب بھی غلط کیا گیا ہے اور بہت سے ایسے اشعار جو لینا چاہئے تھے انھیں ترک کر دیا گیا ہے

اور جو قابلِ ترک تھے انھیں لے لیا گیا ہے۔ ورنہ اگر جگر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو سو سے کہیں زیادہ

اشعار بہترین رنگ و نغزل کے ان کے یہاں میسر آ سکتے تھے،

سنائے کہ حسرت و فانی وغیرہ کے کلام کا انتخاب شائع ہونے والا ہے۔ اگر انتخاب کرنے والے یہی صاحب ہیں

تو، کم کوا بھی سے دلوں سے جو جانا چاہئے۔ میری رائے میں انتخاب کی بہترین صورت یہی ہے کہ یہ خدمتِ خود اسی کے سپرد

کی جائے جس کا کلام ہے، اس سے دو فائدہ مرتب ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ دنیا کو اس کے حقیقی رنگ کا پتہ چل جائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ مستقبل میں کسی وقت اس انتخاب کی تاریخی وقعت بہت بڑھ جائے گی

نیز

# باب الاستفسار

## زلزلہ کے اسباب

(طبقات الارض اور جوئش کے نقطہ نظر سے)

(جناب محمد عبدالغنی صاحب - سارن)

زلزلہ کیا چیز ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں۔ کسی ایک حصہ زمین پر زیادہ جھٹکے محسوس ہونا اور دوسری جگہ کم یا بالکل نہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا جوشیوں کا یہ کتنا کہ سات سیارے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے اور یہ تباہیاں اسی کی وجہ سے ہوئیں، کسی حد تک درست ہو سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اس طرف جلد از جلد توجہ فرمائیں گے۔ کیونکہ اس وقت یہ موضوع خاص اہمیت رکھتا ہے

(نگار) زلزلہ کی حقیقت سمجھنے سے پہلے، یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ کرہ ارض کی ساخت و کیفیت کیا ہے کیونکہ اسی کے سمجھنے پر زلزلہ کی حقیقت سمجھنا منحصر ہے

آپ زمین کی جس سطح پر چلتے پھرتے ہیں وہ سخت اور ٹھوس ہے، لیکن زمین کے اندر یہ کیفیت نہیں ہے، یعنی جس قدر زیادہ آپ مرکز زمین کی طرف بڑھتے جائیں گے، سطح کی یہ سختی کم ہوتی جائے گی اور گرمی بڑھتی جائے گی۔ یہاں تک کہ مرکز زمین تک پہنچتے پہنچتے یہ گرمی بھلا دینے والے دور یہ تک محسوس ہوگی اور زمین کا مادہ معدنیات کی گچھلی ہوئی کچھڑ کی صورت میں نظر آئے گا

کرہ زمین تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ جسے بالائی سطح یا خول کہتے ہیں اس کی دہائیت ۴۰ میل ہے، اس کے بعد

دوسرا حصہ گرم پتھر ملا ہے اور شش ہے۔ گیشیم اور چغاقی قسم کے پتھر پر، اس کی دبازت ۹۰۰ میل ہے، اس کے بعد زمین کا وہ مرکزی حصہ ہے جس میں زیادہ تر لوہا اور نخل نیم گذاختہ حالت میں پائے جاتے ہیں، اس کی دبازت ۶۲۵۰ میل ہے کرہ زمین آفتاب ہی کا ایک ٹکڑا ہے جو دوران گردش میں اس سے علیحدہ ہو گیا تھا، اور کروڑوں برس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سرد ہو کر اس قابل ہوا کہ جاندار اس پر سانس لے سکے۔ پھر جس طرح پگھلی ہوئی چیز کا بالائی حصہ پہلے خشک ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اندرونی حصہ ہمز پوری طرح خشک نہیں ہوا بلکہ اب تک گرم و نرم ہے۔ لیکن زمین کی بالائی سطح بالکل یکساں دبازت کی نہیں ہے کسی جگہ اس کی موٹائی کم ہے اور کہیں زیادہ، اس لئے یوں سمجھنا چاہئے کہ زمین کا یہ خشک خول جس پر ہم آباد ہیں ایک ایسے ناہموار لکڑی کے تختے کے طرح ہے جو پانی پر تیر رہا ہوا اور جس کا دباؤ نیچے کی طرف کہیں کم اور کہیں زیادہ ہو

اس خول کے نیچے جو مادہ پایا جاتا ہے وبالطبع دباؤ سے متاثر ہونے والا ہے یعنی جس جگہ اس پر دباؤ زیادہ پڑ جاتا ہے وہ دب جاتا ہے اور جہاں دباؤ کم ہو جاتا ہے وہ ابھرنے لگتا ہے۔ پھر اگر یہ مادہ پانی کی طرح رقیق ہوتا تو اس دباؤ کا نتیجہ جلد ظاہر ہو جاتا لیکن چونکہ اس کا قوام بہت گاڑھا ہے اس لئے بہت کافی زمانہ کے بعد اس پر دباؤ کا اثر ہوتا ہے

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل ملاحظہ ہے کہ زمین کے بالائی خشک خول کا دباؤ بہت تیز رفتاری سے کیونکہ ہوا، پانی، گرمی و سردی کے اثرات سے یہ سطح کسی جگہ پہاڑوں کی نحو صورت اختیار کر لیتی ہے، کہیں پتھر ملا حصہ پس پسا کر غبار بن جاتا ہے اور پانی میں مل کر سمندر کی سطح کے دباؤ کو بڑھاتا رہتا ہے۔ الغرض زمین کا سمٹ کر پہاڑ بن جانا اور پہاڑوں کا سطح میدان ہو جانا۔ کرہ زمین کی تاریخ کے وہ واقعات ہیں جو وقت نامعلوم سے جاری ہیں اور معلوم نہیں کب تک جاری رہیں گے

چنانچہ زمین کا وہ حصہ جسے سوسٹر لینڈ کہتے ہیں کسی وقت ۲۰۰ میل کا بالکل مسطح میدان تھا، لیکن اب ہاں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور بجائے ۲۰۰ میل کے اس کی پیمائش صرف ۱۲۰ میل رہ گئی ہے

اس قدر معلوم کر لینے کے بعد غالباً یہ سمجھنا آسان ہو گا کہ زمین کے اندرونی حصہ پر بالائی خول کا دباؤ فطری امر ہے اور اس دباؤ سے اندرونی مادہ کا کسی جگہ دب جانا اور کسی جگہ ابھر جانا یقین ہے۔ فرض کیجئے آپ کسی ششی پر بیٹھ ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس کے کسی کنارہ پر زیادہ دباؤ پڑ جاتا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ ظاہر ہے کہ جدھر دباؤ پڑا ہے اس طرف کا کنارہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا اونچا ہو جائے گا، لیکن یہ عمل اسی جگہ ختم نہ ہو جائیگا بلکہ پانی اپنی اصلی سطح اختیار کرنے کے لئے پھر متموج ہو گا اور ششی میں متواتر ادھر ادھر ہلکولے پیدا ہوں گے۔ بالکل



یہی صورت زمین کی سمجھئے کہ جب بالائی خول کے کسی حصہ کا دباؤ اس کی اندرونی سطح پر زیادہ پڑے گا تو وہ حصہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا ابھرنے لگے گا یہاں تک کہ توازن قائم رکھنے کے لئے متواتر ہچکولے اس کو کھانا پڑیں گے، اور یہی ہے زلزلہ اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فلاں حصہ زمین اس قدر بلند ہو گیا اور فلاں اس قدر پست

اب آپ حال کے زلزلہ صوبہ بہار کو دیکھئے اور اس پر اس نظریہ کو منطبق کیجئے۔ فرض کیجئے کہ دامن ہمالیہ سے لے کر خلیج بنگال تک کا حصہ زمین ایک سڑی کا تختہ ہے جو پانی پر تیر رہا ہے اور خلیج بنگال کی طرف اس کا دباؤ زیادہ ہو گیا، اس لئے لا محالہ نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمالیہ کی طرف زمین کا اندرونی مادہ ابھرے گا

پھر مظفر پور، پٹنہ، مونگیر وغیرہ میں جو زمین جا بجا خشق ہوئی ہے تو اس کا سبب یہی ہو گا کہ خلیج بنگال کی طرف دباؤ زیادہ پڑ گیا اور صوبہ بہار کی طرف مادہ زمین نے ابھر کر پلٹ ڈال دی۔ اسی طرح سلسلہ ۶ میں جو زلزلہ آیا تھا اس میں دادی کا ٹکڑا کی طرف زیادہ دباؤ پڑا تھا اور اس کا مقابلہ حصہ سر زمین یوپی کا زیادہ متاثر ہوا تھا

پھر جو حصہ اس دباؤ کی وجہ سے اندرونی مادہ کا توازن خراب ہو جاتا ہے، اس لئے اُس کے اصلی توازن پر آنے کے لئے کچھ عرصہ تک موج کی کیفیت باقی رہتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ۱۵ جزیری کے بعد بھی ہلکے ہلکے جھٹکے برابر محسوس ہو رہے ہیں اور اس وقت تک محسوس ہوتے رہیں گے۔ جب تک اندرونی مادہ اپنی اصلی سطح پر نہ آجائے

آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ مقامات جو سمندر کے ساحل پر آباد ہیں وہاں اکثر و بیشتر زلزلے آتے رہتے ہیں اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ سمندر میں پہاڑوں اور زمین کا ایک حصہ کٹ کٹ کر دریاؤں کے ذریعہ سے پہونچتا رہتا ہے اور اس لئے سمندر کی سطح کا دباؤ آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے زمین کے اندرونی مادہ میں موج پیدا ہوتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ بعض اوقات سمندر کا پانی بس بس کر مرکز زمین کی طرف پہونچتا ہے اور وہاں گرم مادہ پر پڑ کر بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اوپر کی طرف بلند ہو کر باہر نکلنا چاہتے ہیں اور اس طرح زمین میں جنبش پیدا ہو جاتی ہے

اب رہا جو تیشیوں اور نجومیوں کا یہ کہنا کہ سات سیاروں کا قرآن اس کا باعث ہوا ہے، سوس کی علمی توجیہ ان کی طرف سے یہ کی جاتی ہے کہ ان سیاروں کی کشش سے زمین جنبش میں آئی، لیکن تنقید صحیح کے بعد ان کی یہ توجیہ پایہ اعتبار سے گر جاتی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں سات سیاروں کا قرآن منطقہ جدی (Zodiac of Capricorn) میں ہوا تھا جو خط استوا سے ۲۲° درجہ جانب جنوب واقع ہے، اس لئے اصولاً ان کی کشش کا اثر گروہ زمین کے جنوبی حصہ پر زیادہ ہونا چاہئے تھا۔ اور آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ میں زلزلہ محسوس ہونا ضروری تھا، نہ کہ صوبہ بہار میں جو خط استوا سے ۲۶° ۲۶ درجہ جانب شمال واقع ہے۔ اور جنوبی حصہ سے ۳۵۰۰ میل کا بُد رکھتا ہے

علاوہ اس کے یہ سات سیاروں کا قرآن چند منٹ تک تو رہا نہیں۔ بلکہ کئی دن تک رہا ہے۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ دوران قرآن یہ مصیبت صرف ایک بار ظاہر ہو کر کیوں ختم ہو گئی

پھر اگر یہ معاملہ صرف سیاروں کی کشش کا تھا تو اس کا بہت زیادہ اثر سمندروں پر ہونا چاہئے تھا جو یقیناً زمین کے لحاظ سے کشش کو زیادہ قبول کر سکتے ہیں نہ کہ صوبہ بہار کی سرزمین پر جو یقیناً پانی کے مقابلہ میں زیادہ ٹھوس اور بنا دہ ہے جو کچھ میں نے عرض کیا ، یہ ہے حال کی تحقیق زلزلہ کے متعلق ، لیکن اس کو آخری لفظ قرار دے کر یہ باور کر لینا کہ ترقی علوم کی آئندہ منزل اس میں کوئی اور اضافہ نہ کر سکے گی ، یا کچھ اور اسباب اس کے دریافت نہ ہو سکیں گے ، مجمع نہیں — مگر اں یہ بالکل یقینی ہے کہ زلزلہ کا سبب وہ فرشتے نہیں ہیں جو کوہ قاف کے گرد زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں اور جب وہ اسے پکڑ کر ہلا دیتے ہیں تو ساری زمین پر جنبش پیدا ہو جاتی ہے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

# جمستان

(نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۸۰ صفحات)

قیمت فی کاپی مجلد للیم — غیر مجلد للیم — علاوہ محصول

خریداران نگار سے — ایک روپیہ کی رعایت

کتب فروشوں کو ۲۵ فیصدی کمیشن

فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

انیا کا اولین بت ساز	فریب خیال	صدائے شکست	دو گھنٹے جہنم میں
ایک شاعر کی محبت	میر بیدار	تالیخ عرب کی ایک حایت جمیل	ایشان
شمس آزادی	بعد المشرقین	وے بیز گزشت	ٹیلی فون نمبر ۶۷
دو خط	جان عالم اور ملکہ مہر نگار	چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	شبستان کا قطرہ گوہر
سودائے خام	درس محبت	ازدواج کر	انتظام علی صاحب
سلاطین کا ایک صوفی	ایک شاعر کا انجام	آدم و حوا سے پہلے	نہزادہ خرم اور ابابیل
بہرہ کا ایک پجاری	مادھا	سرزمین دکن کی ایک نواز شام	نوجوان شہزادہ
مطر بے فلک	چنگاری	محلہ کی رونق	داستان حسن و عشق کا درق و غم

# باب امر اسلئے والمناظرہ

(جناب شیر احمد خاں صاحب کیل لودھیانہ)

محترم بندہ جناب مولانا نیاز صاحب

اسلام علیکم

دسمبر ۱۹۳۳ء کے "نگار" میں "ملاحظات" کی تحت میں "عیش یا مسرت" کے عنوان سے آپ کا دلچسپ مضمون میری نظر سے گذرا۔ آپ نے اس مضمون میں نہایت خوب صورت الفاظ میں "عیش یا مسرت" کی حقیقت پر تفصیلی بحث کی ہے، اور اسی ضمن میں مذہب، وطنیت، قومیت، ہر سہ تحریکات کے منفرد اثرات و نتائج پر بھی تنقید کی ہے، "امن و سکون" کا واحد ذریعہ "کے ضمنی عنوان میں آپ نے یوں مشورہ دیا ہے کہ اگر دنیا کو واقعی امن و سکون کی ضرورت ہے، تو اس کا حصول نہ تجارتی معاہدات سے ہو سکتا ہے، نہ تحفیف اسلحہ کی کوشش سے، بلکہ صرف اس طرح کہ تمام ممالک کے اہل الرائے ایک جگہ جمع ہو کر، حکومتوں کے اختلافات کو مٹالیں اور تمام ممالک کو اصول فیڈریشن پر ایک نظام حکومت سے وابستہ کر دیں۔ اگر آپ کے اسی مشورہ کے مطابق عمل نہ کیا گیا، تو "— یقین رکھنا چاہیے، کہ دنیا کو ایک بار ضرورتاً ہونا ہے عوامہ وہ تباہی اس کو پھر عہد وحشت کی طرف لپکا کر کسی اور تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالنے پر مجبور کرے، یا قیامت کبریٰ" کا قلم کر کے نظام شمسی میں ایک اور ویران خیر آباد کرے کا اضا ذکرے والی ثابت ہو۔

جس "عیش یا مسرت" کا آپ نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے، وہ عیش یا مسرت "ہرگز منتہائے مقصد حیات انسانی نہیں، اس کی تلاش انسان پر فرفر ہے، اور اس کے بغیر انسان کی زندگی اجرین نہیں ہو سکتی۔ انسانی زندگی بلند مقاصد کی جستجو میں ہے اور وہ بلند مقاصد "عیش و مسرت" کی آغوش میں نہیں، "عیش و مسرت" کی آغوش خوب آوے اور آرد و کشش ہے، انسان اس دنیا میں اپنی عہدیت کے لئے خلق کیا گیا، عیش و مسرت کے حصول کے لئے نہیں، کوئی مذہب انسان کو دنیا میں حصول عیش و مسرت کی تعلیم نہیں دیتا اور نہ ہی مذہب عالم ہوشیار رہا، اور تحقیقی فردوس کا کام ہے۔ اگر مسرت کہیں ہے تو وہ انسانی فرائض کو بہ طریق احسن ادا کرنے کے طریقہ عملی

میں۔ دنیا سے امن و سکون کی بے سود تلاش میں کسی خوش فہم مجبور کے، گمراہ تک اُٹھے وہ امن و سکون نصیب نہیں ہوا، اور نہ ہی مستقبل قریب میں کسی ایسے امن و سکون کے ظہور کی توقع کی جاسکتی ہے، زندگیوں کی بستی میں کبھی امن و سکون نہیں رہ سکتا، البتہ مُردوں کی دنیا یعنی قبرستان میں یہی نہاموشی پُر ہمیت سکون، اور امن و رقت مسلط رہتا ہے، دنیا کو قبرستان کے امن و سکون کی ضرورت نہیں ————— مذہب پر سب سے بڑا الزام جو آپ نے عائد کیا ہے وہ یہ ہے کہ ”مذہب نے خون ریزی، اور خوفناکی کے سما، کوئی خدمت سر انجام نہیں دی“ حق و باطل کی آویزشِ فطرت کا ایک عالمگیر، آن مٹ، قانون ہے، جس کی سر تابی میرے اور آپ کے اختیار سے باہر ہے (کم از کم میں اپنے متعلق ضرور کہہ سکتا ہوں) آپ شاید اپنے کو مستثنیٰ کریں، دن اور اوقات کا انقلاب، روشنی اور تاریکی، گرمی اور سردی، بیمار اور خزان، سورج اور چاند کی گردشِ قانون قدرت کے یہ عالمگیر مظاہرے اس امر کے حتمی ہیں، کہ حرکت نہ ختم ہو یونانی، حرکت فطرت کی ہر شے میں حکم اس رہے، اور ہر لمحہ بدلنے والی دنیا کا ہر انقلاب پذیر ذرہ امن و سکون کے خلاف علمِ جاہلند کے ہوسے جو۔ جدوجہد اور ہر حرکت۔ ”بقاع الصلح“ کے جہاں گیر اصول کی زندہ تشریح ہے۔ جب تک سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوتا رہے گا، اس وقت تک انسانوں کی بستی میں آپس میں محبت اور پیار، جنگ و فساد، صلح و دشمنی، نفاق، اور فراق کے رنگین مناظر آنکھوں کے سامنے اسی طرح رقصاں رہیں گے۔ جدال و قتال، بربادی و آبادی، لادُنیا حیات انسانی ہیں۔ یہ ابتدائی اصولی غلطی ہے، اگر کوئی ایسی تحریک یا مذہب سے یہ توقع رکھے، کہ وہ دنیا میں بہشت قائم کرے۔ اور پھر بہشت بھی وہ جس کے متعلق یہ کہا جائے

بہشت آنجا کہ آزاد رہے ہمیشہ

کے راجے کا رہے نباشد

دنیا کا یہ وسیع کارخانہ قبرستان کے اس دسکون کے لئے مرتب نہیں کیا گیا۔ جو لوگ اسی دنیا میں ایسی بہشت کی تلاش میں ہیں، وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ اور اک سراب کے تقابص میں اپنی زندگیاں ضائع کر رہے ہیں۔ انسان کا جسم صحت، اور بیماری کے عوارضات کا تنوع و مختلف اسی طرح بنتا رہے گا۔ اس کا دل اسی طرح بڑھتی ہوئی انگلیوں، اور پُرجوش آرزوؤں کا مسکن رہے گا، اور جملہ لبقا کا لادہ دل نہ مٹے والا قانون کائنات کے ہر ذرہ پر اسی طرح حکمراں رہے گا، خواہ آپ مانیں یا نہ مانیں، چاہیں یا نہ چاہیں، یہ جنگیں یہ فسادات یہ خون ریزیاں اور خون آشامیاں اسی طرح دنیا کے چہرہ کو بد نما کرتی رہیں گی، انسان فرشتہ تو ہونے کو۔ ا۔ حرص و آواز، ہوس اور خود غرضیاں جن انسانی اعمال کے محرکات ہوں ان کا نتیجہ بدیسی تباہی، اور فساد ہے، مذہب اک جادو، افتدال کا نام ہے، جس جادو اعتدال پر گامِ دن ہو کر۔ انسان دنیا کی فلاح و بہبود اور برائیوں کے نفع انسان کی وسیع برادری میں باہمی اخوت و پیار کا باعث بن سکتا ہے، اسلام میں جو درندگی اور حیوانیت پائی جاتی ہے، وہ مذہب کے اصلاح کن اثر سے، اطاعت، اور شفقت کے پاکیزہ جذبات میں بدل سکتی ہے، تنہا مذہب وہ مقدس تحریک ہے، جس نے انسان کی درندگی اور بدبہشت کو اخوت اور اطاعت میں بدل کر دربار خداوندی میں عہدت کی فاسک کے ساتھ خلافت الارض کی خلعت پہنا دی ہے۔ باقی رہیں وہ جنگیں، جو دنیا میں مذہب کے

ہم پر کی گئی ہیں، ان میں سے بعض تو محض جوع الارض اور بادشاہوں کی اپنی انانیت کا نتیجہ تھیں، اور وہ جنگیں جو خالصاً اللہ کے راستہ میں... لڑی گئیں، وہ نسل انسانیت کی صحیح نشوونما اور تربیت کے لئے عین ضروری تھیں، جو انہم زدہ اعضا کا کاٹ دینا ہی دیگر اعضا کی تندرستی، اور صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے ہر تخریب میں تعمیر، ہر بادی میں آبادی، اور ہر دیمانہ میں بسن کے آثار اور نشانات پائے جاتے ہیں، ہر نئی تعمیر کے لئے قدیم تعمیر کا گرایا جانا ضروری ہے، الفاظ کی پشت تو آپ ساجاد و نگار ہر وقت پر قائم کر سکتا ہے۔ مگر انسانی اعمال سے ایسی پشت دنیا میں نہ کبھی قائم ہوئی ہے اور نہ کبھی قائم ہوگی۔ دنیا فرشتوں کی بسنت نہیں بن سکتی، اور نہ ہی دنیا مامتاؤں کا مندر ہے، انسانی زندگی میں قسے بھی ہیں اور آپس بھی، جدوجہد کی صورتیں بھی، تحمل و برداشت کی آذیتیں بھی، ناکامیابیوں کی تلخ کامیاں بھی۔ ع

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہ لبی

موجودہ برسرِ اقتدار حکومتیں جو دنیا میں امن و سکون قائم کرنے کی کوششیں کبھی تخفیفِ اسلحہ کی صورت میں، اور کبھی تجارتی معاہدہ کی صورت میں کر رہی ہیں، یہ محض ان کی سیاسی چالیں ہیں، ان کی ان کوششوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ مغلوب اقوام اپنا سر نہ اٹھائیں، اور اپنے غضب شدہ حقوق ان سے طلب نہ کریں، وہ اب جنگ اس لئے نہیں چاہتے۔ کہ کہیں دوسری جنگ میں وہ سب کچھ نہ بیٹھیں، جو انھوں نے گزشتہ جنگوں میں حاصل کیا ہے۔ وہ امن اب اس لئے چاہتے ہیں، کہ گزشتہ جنگ کی تھکان دور کر لیں، اور جو کچھ انھوں نے گزشتہ جنگوں میں حاصل کیا، اُس مالِ غنیمت کو اطمینان کے ساتھ اب بیٹھ کر اچھی طرح منظم کر لیں، وہ دوسروں کے غضب شدہ حقوق اگلا نہیں چاہتے۔ دنیا کی بوجھ تقسیم دولت، و حکومت پر وہ مطمئن ہیں، اور اس تقسیم میں کسی مزید تبدیلی اور انقلاب کو اب وہ نہیں چاہتے، امن و سکون کی یہ کوششیں اگر کامیاب ہو گئیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مغلوب اقوام ہمیشہ کے لئے مغلوب رہیں گی، اور وہ کبھی بھی حریت کلمہ حیات آفریں فضا کو زندگی حاصل نہ کریں گی

اختلافات مادی ہوں یا اعتقادی، ہمیشہ سے چلے آئے ہیں، اور اسی طرح قائم رہیں گے۔ میری اون آپ کی مساعی آنے والی "قیامت کہئے" کو دیکھ نہیں سکتیں۔ اور اسی "قیامت کہئے" کے لٹ جیسے جس حد حقیقت مظلوم اور بے دست و پا اقوام کے لئے کوئی فلاح و بہبود مضمّن نہیں ہے۔ جنگیں ہمیشہ معلوم کو ظلم کی دستبرد سے نجات دلاتی ہیں اور اکثر جھوٹے کیلئے تازیانہ عبرت کا علم رکھتی ہیں۔ (There is a biological process) ایک انگریزی مقولہ ہے۔ جنگ بھی افزائش نسل کے لئے ضروری ہے۔ انسان تحفظِ نفس کے لئے اپنے گرد و پیش کے حالات

سے برسرِ پیکار رہنے پر مجبور ہے، انسان دنیا میں کائنات ارضی پر مکرانی کے لئے خلق ہوا ہے اس لئے اُسے پانی، ہوا، اور زمین کو اپنے زیرِ نگین کرنا ہے، مذہبی اختلافات بالکل مت نہیں سکتے، البتہ کم شاید ہو جائیں، ٹیک اور بدی، کفر اور ایمان دونوں کی دنیا پہلو بہ پہلو جاتی ہیں۔ ان کی باہمی آویزش سے گرجہ بٹ اور بُردِ دل ہے۔ البتہ اس جنگ میں بلند ہمتی سے شرکت، صحیح فتح ہے، جنگل کو سبزہ دار بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اُسے خس و فاشاک سے پاک صاف کیا جائے۔ کپڑا انسان کے جسم پر اس وقت راست آتا ہے جب درزی اسے پہلے کاٹ دیتا ہے، انسان کو فقہا کھلوانا جائے، جو محض کھیلنے کودنے اور ہنسنے کے لئے دنیا میں آیا ہو، محبت، لفاق اور دشمنی انسانی قلب کی یہ سرگودہ کیفیات ازلی اور ابدی ہیں، اسی جی نوع انسان کی وسیع برادری میں ہمیشہ سے مومنوں، منافقوں اور منکروں کے گروہ قائم رہے ہیں

دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کا درس نہیں دیتا۔ البتہ جو شخص تنگ انانیت ہو، اس کے عدم کو وجود سے بہتر ضرور سمجھتا ہے۔ اگر اس کے متعلق اصلاحی قوتیں بیکار نہ ثابت ہو چکی ہوں  
باقی رہا اس ملک کی فرقہ پرستی، اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ ع  
اسے باوصبا ہیں ہمہ آوردہ تست

باہمی بدگمانی نتیجہ ہیں، قوموں کے باہمی عدم توازن کا، جو قوم اپنے کو کمزور سمجھتی ہے۔ وہ اپنی بقا، کے لئے تحفظات کے تعین کے لئے فطرتاً مجبور ہے، تحفظات کے مطالبہ کو اقلیت بھی اس حالت میں ترک کر سکتی ہے، اگر اکثریت اور بالخصوص طاقتور اکثریت اپنی روکش اور اپنے سلوک سے اقلیت کے دل میں اپنے لئے اعتماد پیدا کر دیے۔ فرقہ وارانہ ذہنیت ہمیشہ قوموں میں باہمی بد اعتمادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اکثریت کا اقلیت کے حقوق اور مفاد کے ساتھ غیر مشفقانہ اور غیر ہمدردانہ سلوک اقلیت کو ہمیشہ اکثریت سے برگمان کر دیتا ہے۔ جس ملک یا بستی میں بد اعتمادی کی فضا رسلط ہو، ایک طرف سے تحفظات حقوق کی طلب ہو، اور دوسری طرف سے اس طلب کا جواب اغماض، اور گریز سے دیا جا رہا ہو اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کی قوموں میں منافرت کی طبع وسیع ہوتی چلی جائے۔ ایسے ناخوشگوار حالات کے اصلی اسباب کا تعین کبھی مفید نتیجہ کا باعث نہیں ہوا، ہندوستان کے مسلمان لاکھ قربانیاں کریں، اور اپنی زندگیاں استخلاص وطن کی مقدس تحریک کے لئے وقف کر دیں، مگر اکثریت کے قلوب میں ان کے لئے کبھی ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا نہ ہوں گے غلط یا درست وہ اس ملک کو تنہا اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے ہیں، اور انھیں ہر سلطان محمود غزنوی نظر آ رہا ہے، باہمی مصالحت اور معاونت کی ساعی ہمیشہ مُبارک ہیں، اور ہر شریف انسان باہمی اعتماد کو بد اعتمادی پر ترجیح دے گا، لیکن ہر مبارک سعی کی کامیابی یقینی نہیں ہے،

ہندوستان کی گذشتہ تاریخ از سر نو مرتب اگر ہو سکتی ہے تو شاید پھر باہمی مصالحت کی ساعی بھی مشکور ہوں، اور البتہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر دونوں اقوام کو آپس میں یہاں مل کر رہنا ہے، تو انھیں ایک نئی تاریخ مرتب کرنی ہوگی اور تاریخ ہند

میں ”مسلمانوں کا باب“ جس انداز اور ترتیب سے اب مرتب ہے، وہ یقیناً بدلنا پڑے گا۔ اور شاید ہندوستان کی تمام گزشتہ تاریخ کو ایک سفید ورق کی صورت میں تبدیل کرنا ہو

خدا را اپنے مضامین میں الفاظ کی بہشت قائم کر کے مسلمان نوجوانوں کو محض شاعر اور نگار پرست نہ بنائے۔ میں نے آپ کے رسالہ کے اکثر نوجوان قارئین کو محض بیکار دیکھا ہے۔ بیشک وہ آپ کے مضامین۔ شگفتہ تراکیب اور بلند تختلات کو مزے لے کر پڑھتے ہیں، مگر عملی اعتبار سے محض اینٹ اور پتھر کی طرح جامد ہیں۔ نیت تو یقیناً آپ کی مبارک اور نیک ہے، مگر بد قسمتی سے نتائج خطرناک پیدا ہو رہے ہیں، کاش آپ میرے ساتھ یہاں ہوں تو میں آپ کو دکھلاؤں کہ اس ”نگار پرستی“ نے کتنے مسلمان نوجوانوں کو گمراہ، بیکار، اور گستاخ کر دیا ہے۔ خدا اُس علم سے محفوظ رکھے، جو شر اور گمراہی پھیلانے

**نگار** اُن تمام صریحی اختلافاتِ بیانی کو نظر انداز کرنے کے بعد جو جا بجا آپ کی تحریر میں نظر آتے ہیں، اس کی تلخیص یہ کر سکا ہوں کہ :-

- (۱) دنیا میں امن و سکون کی تلاش، جستجوئے محال ہے
- (۲) مذاہبِ عالم کا مقصد کبھی ”عیش و مسرت“ کا حصول نہیں تھا بلکہ صرف ”عبدیت“ کی کیفیت انسان پر طاری کرنا تھا
- (۳) مذاہبِ عالم کی غور و بزمی و غون آشامی عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے
- (۴) دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کرنے کا درس نہیں دیتا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اس کو ضرور فنا کر دینا چاہتا ہے
- (۵) ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی مصالحت ناممکن ہے جب تک تاریخ ہند میں ”مسلمانوں“ کا باب بالکل نہ بدل دیا جائے

(۶) نگار کی تحریریں ملک کے نوجوانوں کو گمراہ، بیکار اور گستاخ بنا رہی ہیں — اور یہ کہ

(۷) خدا اُس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلانے

آخری دو باتیں حذف کرنے کے بعد جن کا تعلق صرف نگار یا صاحب نگار سے ہے اور جن کا جواب دینا چنداں ضروری نہیں، باقی تمام امور یقیناً غور و طلب ہیں لیکن افسوس ہے کہ فاضل مراسلہ نگار نے جو نتیجہ دھجے کی پڑ اُسے تولیدگی و تناقص کے لحاظ سے کسی کامیاب قانون پیشہ شخص سے منسوب کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا قبل اس کے کہ میں فاضل مراسلہ نگار کی تصریحات پر تنقید کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میں دسمبر کے ”ملاحظات“ کا مفہوم یہاں مختصر طور پر ظاہر کر دوں جس کے خلاف صاحب مضمون نے احتجاج کیا ہے

میں نے دسمبر کے ملاحظات میں ظاہر کیا تھا کہ عیش و مسرت دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں عیش نام ہے جسم کی آسائش کا جو اس ظاہری کی لذت کا اور مسرت نام ہے اطمینانِ نفس اور راحتِ روح کا، اس لئے اگر دنیا واقعی امن و سکون کی طلبگار ہے تو اسے اسبابِ عیش کی جستجو نہ کرنا چاہئے بلکہ حصولِ مسرت کے درپے ہونا چاہئے۔ اسی سلسلہ میں میں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کے حصول میں اس وقت تک نہ مذاہبِ عالم کامیاب ہوئے ہیں، نہ جذبہ قومیت و وطنیت کو کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ علم و حکمت کی ترقی اس جنس گراںما یہ تک دسترس پاسکی ہے۔ اس لئے اب اگر تجربہ بانی رہ گیا ہے تو صرف یہ کہ تمام مذاہب کو صرف ایک مرکز پر لایا جائے جسے ”السانیت پرستی“ کہتے ہیں اور جملہ حکومتوں کو صرف ایک نظامِ حکومت سے وابستہ کیا جائے۔ جو تمام سلطنتوں کے تحائف و موافقات سے حاصل ہو سکتا ہے

یہ تھا میرا مفہوم جس سے مراسلہ نگار نے نہ صرف یہ کہ اختلافات کیا ہے، بلکہ بعض نئی باتیں ایسی پیش کی ہیں جن کے سمجھنے کے لئے مجھے خود استفسار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

(۱) و (۲)، دنیا میں امن و سکون کی تلاش جستجوئے محال ہو یا جستجوئے ممکن، لیکن غالباً اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ بالکل فطری چیز ہے نہ صرف انسان بلکہ وحوش و طیور اور نباتات بھی اسی چیز کی جستجو میں ہیں اور مخلوقات کا فطری خود غرض پیدا کیا جانا اسی مصلحت کے ماتحت ہے کہ وہ اس کی جستجو میں لگے رہیں پھر چونکہ امن و سکون انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے فطری آفتاب ہے، اس لئے یہ کہنا کہ دنیا میں حقیقی مسرت کوئی چیز نہیں، بلکہ اصل ”عبدیت“ ہے اور اسی کی اشاعت کے لئے مذاہبِ عالم وجود میں آئے بالفاظِ دیگر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ مذاہب کا تعلق مسرت یا اطمینانِ نفس سے نہیں بلکہ کسی اور چیز سے جس کا نام فاضلِ مراسلہ نگار نے ”عبدیت“ رکھا ہے مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے، لیکن غالباً قابلِ معترض نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جس چیز کو وہ

”عبدیت“ سے تعبیر کرتے ہیں، وہی میرے نزدیک سکونِ نفس و اطمینانِ ضمیر ہے

”عبدیت“ کسے کہتے ہیں؟ اگر اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ایک انسان اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھ کر صرف رشتہٴ عبد و معبود پر اعتماد کرے اور عبادت و نیایش کے مروجہ طریقوں پر کاربند ہو کر اپنے فرائضِ عبدیت سے عمدہ برآ ہو جانے کا یقین رکھے، تو یہ ایسی ادنیٰ درجہ کی تعبیر ہوگی کہ انسان و حیوان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا کیونکہ انسان کا خدا کے مقابلہ میں صرف اپنے آپ کو عاجز اور بندہٴ بیچارہ سمجھ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا، ایک جانور بھی انسان کے ہاتھ میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا ہے

فرض کر لیجئے ایک انسان خدا سے ڈر کر رات دن اس کی عبادت میں مشغول رہتا ہے تو اس سے دعا کیا ہے یعنی وہ کس امر سے خائف ہو کر اس کی پوجا کرتا ہو؟ ظاہر ہے کہ اس کا یہ فعل کسی غرض سے خالی نہیں ہو سکتا، یعنی وہ یا تو اپنی دنیاوی فلاح و ترقی کی امید پر ایسا کرتا ہے یا اخروی نجات کی ترقی پر۔ اگر مقصود وہ ہے تو محض یہ ”خوفِ عبدیت“



بیکار ہے جب تک وہ دنیا کے اصول پر نہ چلے اور اگر مدعا دوسرا ہے تو ایسا انسان دنیا اور دنیا والوں کے لئے بیکار ہے۔ میرے نزدیک "عبدیت" کا صحیح مفہوم صرف یہ ہے کہ انسان جس طرح اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھے اور دوسروں کے احساسات کی پامالی پر اپنے جذبات کی کامیابی کی بنیاد قائم نہ کرے۔ اسی کام میں نے دوسرا نام "انسانیت پرستی" رکھا ہے اور یہی مقصود مذہب کا ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ تجربہ اس کے خلاف ثابت ہوا ہے۔ اور اس وقت تک مذہب اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے لامحالہ ہم کو "مذہب" کا کوئی اور بلند مفہوم قائم کرنا پڑے گا اور وہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ "لا مذہبیت" مذہب قرار دیا جائے جسے دوسرے الفاظ میں *(morality without religion)* بھی کہہ سکتے ہیں

آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ "مسرت نام ہے انسانی فرائض کو بہ طریق احسن ادا کرنے" کا اس لئے لکھا ہیں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ کیا انسانی فرائض میں اہم ترین فرض یہ نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو بھی خواہ وہ کسی قوم و ملت سے تعلق رکھتے ہوں ہمدردی کی نگاہ سے دیکھے اور ان کے ساتھ رشتہ اخوت و محبت قائم کر کے تنگ نظری و عنصرت کو دور کر دے۔ پھر اگر اس کا جواب آپ اثبات میں دیں گے (اور یقیناً دیں گے) تو آپ کو میرے اس قول سے کیوں اختلاف ہے کہ انسان صرف قیام مسرت کے لئے وضع ہوا ہے نہ کہ اسباب عیش کی فراہمی کے لئے۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ "مذہب طلسم ہو شر یا اور تخیلی فردوس کا نام نہیں ہے" سو اس کے جواب میں بجز اس کے کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

جھوٹی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر

میں، اگر سرے سے اس قسم کی فردوس و بہشت کا قائل ہی نہیں ہوں، کیونکر مورد الزام قرار پاسکتا ہوں، یہ تو آپ اپنے انھیں برادران مذہب سے کہئے جنھوں نے فردوس کو طلسم ہو شر یا کیا، اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیز بنا کر پیش کیا ہے۔ حالانکہ

دشتان مابین خلت و خشم

(۳) آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "مذہب عالم کی غوریزی و خون آشامی عین فطرت کے مطابق ہے، کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے"۔ یہ غالباً آپ نے صرف اس بات کو پیش نظر رکھ کر کہا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ اور اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ لیکن بندہ نواز، جس طرح آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح دوسرے مذہب واسے بھی کہہ سکتے ہیں۔ پھر اس کا فیصلہ کیونکر ہو کہ راستی پر کون ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مختلف دعوؤں میں باہم گرا اختلاف و تضاد ہوگا تو ہم کو جانچنے کے لئے کوئی معیار قائم کرنا پڑے گا اور مذہب

کے تناقض و نزاع کے باب میں یہ معیار صرف "عقل و فطرت" ہی ہو سکتا ہے۔ پھر غور کیجئے کہ اس وقت کون سا مذہب اس معیار پر ٹھیک اترتا ہے ؟ غالباً کوئی نہیں اور اس نئے لامحالہ تمام موجودہ مذاہب کو علیحدہ کر کے کوئی اور نئی صورت اختیار کرنا پڑے گی جو "مذہب انسانیت پرستی" کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی

اسٹرنڈبرگ (Strindberg) کا ایک مشہور ڈرامہ ہے جس میں ایک عیسائی عورت کسی فوجی کپتان کو جو منکر خدا ہے مذہب کی طرف مائل کرتی ہے اور خدا کی محبت کی داستان سنانے لگتی ہے۔ کپتان سب کچھ سننے کے بعد کہتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت جب تم خدا اور اس کی محبت کا ذکر کرتی ہو، تمہاری آواز میں سختی پیدا ہو جاتی ہے اور تمہاری آنکھوں سے جذبہ نفرت و استکراہ پٹکنے لگتا ہے، ایسا کیوں ہے؟

چنانچہ یہی وہ تلخ حقیقت تھی جس کی بناء پر اسے کہنا پڑا کہ

*The world would be more religious place if all the religions were removed from it.*

یعنی اگر آج دنیا کے تمام مذاہب محو ہو جائیں تو دنیا زیادہ مذہبی جگہ ہو جائے

Baron Von Hegel کا قول ہے کہ

*Religion is an "Isness" and not an "Oughtness"*

مذہب کا تعلق ہمیشہ "ہے" سے رہا ہے "چاہئے" سے نہیں۔ یعنی وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ حقیقت کیا ہے بلکہ صرف اسی کو صحیح سمجھتا ہے جو بظاہر اسے نظر آتا ہے۔ یعنی اگر وہ یہ سکھاتا ہے کہ آپس میں محبت رکھو، فتنہ و فساد سے علیحدہ رہو تو اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس عمل کو صرف ایک مخصوص حلقہ میں محدود رکھا جائے اور دوسرے مذاہب والوں کو اس سے خارج سمجھا جائے، پھر ظاہر ہے کہ جب تمام مذاہب... اس خیال کے حامی ہوں گے تو ان کا باہم گر کشت و خون میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے اور اس وقت تک جو غوریزیاں مذاہب کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ ہر مذہب والا اپنی جگہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسرے کو باطل اور بقول ہمارے فاضل حراسلہ نگار کے حق و باطل میں جنگ ہونا بالکل فطری امر ہے

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مذاہب عالم کا درس محبت بھی حد درجہ قاتل و خونریز درس ہے اور کسی کا یہ قول بالکل صحیح

*Religion engenders a great love to a great hate*

(۴) آپ کا جو تھا دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب انسان سے انسان کو نفرت کرنے کا درس نہیں دے گا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اُسے ضرور فنا کر دینا چاہتا ہے۔ اس دعویٰ کا پہلا حصہ بالکل واقعہ و حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ ایک انسان نے دوسرے انسان سے نفرت کرنا، مذہب ہی سے سکھا اور کافرو ملکش کی

اصطلاح میں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ کیا آپ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے ہندوؤں سے اس لئے متفرق نہیں ہیں کہ وہ رام و کرشن کے ماننے والے ہیں اور کیا ہندو آپ کے لئے ناپاک نہیں سمجھتے کہ آپ کا مذہب بُت شکنی سکھاتا ہے اور پھر ایک ہندو یا مسلمان ہی پر کیا موقوف ہے، گہر و ترسا، یہود و نصاریٰ، سبھی اس عذاب میں مبتلا ہیں اور ایک کا دوسرے سے نفرت کرنا مذہبی اختلاف ہی کی وجہ سے ہے

اب رہا یہ خیال کہ چونکہ انسانیت ہو اس کو ضرور ہلاک کر دینا چاہئے، سو براہ کرم بتائے کہ اس سے زیادہ انسانیت کی کیا توہین ہو سکتی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس لئے نفرت کرے کہ وہ اس کے مذہب کے شعار کے خلاف خدا کی پرستش کرتا ہے۔ یعنی سوال خدا کی نافرمانی کا نہیں بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ کیوں ایک مخصوص و متعین طور پر اس کی پوجا نہیں کی جاتی

بہر جب حالت یہ ہے تو آپ ہی کے فیصلہ کے مطابق اس وقت تمام اہل مذاہب کو فدا کر دینا چاہئے، کیونکہ وہ سب کے سب ننگ انسانیت ہیں

۱۰۱۔ آپ کا یہ فرمانا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد نامکن ہے جب تک ہندوستان کی تاریخ سے مسلمانوں والا باب بالکل نہ بدل دیا جائے۔ اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ ہندو صرف اس لئے مسلمانوں کی طرف سے صاف دل نہیں ہو سکتے کہ وہ فاتحانہ حیثیت سے یہاں آئے اور بت شکنی کی، تو یہ ایک حد تک اصولاً درست ہے، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اب جبکہ مسلمانوں میں ان کے اسلاف کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی، وہ کیوں اب تک "پندار فاتحانہ" میں مبتلا ہیں۔ اور وہ کیا چیز ہے جو ان میں ملک و وطن کی محبت پیدا ہونے نہیں دیتی۔ کیا ہندوؤں کی طرح ہندوستان ان کا وطن نہیں ہے۔ اور کیا اب وہ یہاں سے نکل کر کسی اور ملک میں فاتحانہ و طوکا نہ زندگی بسر کرنے کی توقع قائم کر سکتے ہیں۔ بھر جب یہ نہیں ہے تو کب ان کی سمجھ میں آئے گا کہ جب سوال اقلیت و اکثریت کا پیدا ہوتا ہے تو اقلیت کی کامیابی "کم" کے مقابلہ میں ہمیشہ "کیف" سے ہوا کرتی ہے۔ مگر سنی شیعہ کی نزاع، وہابی و مقلد کا جھگڑا کب انہیں یہ سمجھنے کی ہمت دیتا ہے۔ انہیں اپنے ہی پاؤں پر کھڑی مارنے سے کہاں فرصت ہے کہ وہ درخت کی طرف متوجہ ہوں

۱۰۲۔ رہ گئے آپ کے دو آخری حقائق کہ نگار کی تحریریں ملک کے نوجوانوں کو گستاخ، گمراہ و بیکار بنا رہی ہیں اور خدا اس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلانے والا ہے۔ سوال کے متعلق میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ

من ادّٰقش خاں بمنم توّٰقش از دغاں بینی

نقطہ نظر کا اختلاف ہے، کار کا وہ عمل کا اختلاف ہے، تعبیر و استنتاج کا اختلاف ہے۔ آپ جس چیز کو گستاخی سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک آزادی ضمیر ہے۔ جو ہر انسان کا فطری حق ہے اور جسے آپ گمراہی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک وہی راہ

”کعبہ مقصود“ تک پہنچانے والی ہے  
اگر میرا یہ مسلک کہ

میان کعبہ و تہخانہ را ہے ست  
واقعی فتنہ و فساد پھیلانے والا ہے تو میں صرف یہ عرض کروں گا  
خدا گواہ اگر جرم ماہیں عشق ست  
گناہ گبر و مسلمان بہ جرم ماہ بخشند  
امن و سکون کا درس دینے والے حضرات کا بھی حال مجھے معلوم ہے اور اُن علمبرداران مذہب کا بھی جو اپنے آپ کو مالان  
عرش ”بادر کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کیوں مجھے اس بزم میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں جہاں بغول عراقی  
”ہمہ یافتہ دغا“  
کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آہ

مرہم از لبہ اش می جویند بر جان نکار  
والے بر ریشے کہ آن را از نیک مرہم کنند

## زخ (پٹیلہ) سے

۱۶ فروری کو تحریر گرامی فردوس نظر ہوئی — لیکن حیران ہوں جو اب کیونکر دوں۔ نکار میں اس کی اشاعت  
مناسب نہیں اور پتہ غیر معلوم !  
اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ نکار کے ذریعہ سے اس کے پہنچ جانے کی اطلاع آپ کو  
دے دوں اور اس وقت کا منتظر ہوں جب مراسلت کے لئے آپ اپنے پتہ سے آگاہ فرمائیں۔ تاہم فی الحال اس قدر  
کدینے میں کوئی حرج نہیں کہ

تو پندار کہ امیں زمرہ بے ساز سے ہست

گوشن نزدیک لہم آر کہ آوا دے ہست

# انسان

پرفشاں سردی نغمے مرے بربط کے تاروں میں  
مری منت کش احساس ہے آسائش گیتی  
مری موج تبسم، جلوہ دیتی ہے گلستاں کو  
مرے ابر کرم سے زندگی ہے مستعار اس کی  
زمین کیا، آسمان کیا، اور ان کی داستاں کیسی!!  
غلط کیا ہے، جو خود بینی مرا آئین ہستی ہے  
مری عظمت کو یہ خاک پریشاں کیا سمجھ سکتی!

امین ستر نہاں، آرزوئے قلبِ دوراں ہوں

فرشتے جس کو سجدہ کر چکے ہیں، میں وہ انسان ہوں

اجل کیا ہے، فضا سے زندگی کا بے کراں ہونا  
پہنچ سکتا نہیں دستِ عبادت، میرے داماں تک  
بنی سزائے تکمیل پر دانوں کی بیستابی!  
مری نمبر ہے کاشا، ہستی کی ویرانی  
جھکا سکتی نہیں میری جبیں دنیا کی رعنائی  
تراک کھیل ہے جویش، ہجومِ جہل و نادانی  
تباہی کے علم لہرا چکے پنہائے گیتی میں

تغیر کے مناظر دڑے دڑے سے نمایاں ہیں

زمین سے آسمان تک مستقل آثارِ طواغیت ہیں

ارادہ ہے کہ اسراوتہاں کو بر ملا کر دوں  
سنواروں اکٹھے انداز سے بھری ہوئی زلفیں  
جہاں کو جادو الٰہی عشقوں سے آشکار دوں  
عروسِ دہر کے جلووں کو پھر صبرِ آزاد کر دوں

بہت فرسودہ ایام ہے ترتیب گیتی کی      اب اجڑائے کہن کو نذر سیلاب فنا کر دوں  
 اٹھاؤں پہلے طوفان جس سے عالم خاک ہو جا      پھر اس طوفان بربادی کو جولان صبا کر دوں  
 محبتِ عمدہ تو میں نام نہ ہستی کا عنوان ہو      شبوں کو صبح کے مانند رنگیں اہرا کر دوں  
 ہر اک ذرے سے چھوٹیں سردی انداز کے چٹنے      فنا کے دام سے ابنائے گیتی کو ربا کر دوں  
 متاثر تفرقہ مزدوری و سدا یہ داری کے      علم حریتِ کامل کے دنیا میں بپا کر دوں  
 رگِ افسردہ ہستی میں روح بے قرار آئے  
 لگوں کی طرح ذرے مسکرائیں وہ بہار آئے

علی اختر (اختر)

## مجموعہ استفار و جواب

ایکمزار صفحات کا گنجینہ علم و ادب طیار ہو رہا ہے اور اعلان کیا گیا تھا کہ غیر  
 جسکی قیمت پیشگی آجائے گی اس کو یہ مجموعہ اسی قیمت میں دیدیا جائے گا۔ چونکہ اعلان کی میعاد  
 ختم ہو گئی ہے اس لئے اب کوئی صاحب غیر بھیجکر اپنا نام درج نہ کرائیں  
 طیاری کے بعد جو قیمت مقرر ہوگی، اس سے ایکروپیہ کم پر حسب معمول خریداران نگار کی  
 خدمت میں یہ مجموعہ پیش کیا جائے گا۔ کم از کم پانچروپیہ قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے  
 منیر نگار لکھنؤ

# خوابستانِ محبت

## کیطرف

بس ایک بار ————— خدا کے لئے وہیں لے چل !

جہاں غلش کو سکون عظیم کہتے ہیں

جہاں سراب کو موجِ شمیم کہتے ہیں

جہاں ، نگاہ کو برقِ حکیم کہتے ہیں

بس ایک بار ————— خدا کے لئے وہیں لے چل !

وہ شہر جس کی زمیں آسمان کا دل چھینے !

ہر ایک راہ گزر — گمشاں کا دل بچینے !

فضا ، جہاں کی بہار جہاں کا دل چھینے !

بس ایک بار ————— خدا کے لئے وہیں لے چل !

وہ صبح — آہ وہ ناظورہ نشاط فروزش

وہ شام — آہ وہ لیلائے میکدہ بردوش

وہ شہر — آہ وہ فردوسِ نار و نشاط و شوش

بس ایک بار خدا کے لئے ————— وہیں لے چل !

وہ نذر گاہِ تنہا — وہ آستانِ مراد

ہے ذرہ ذرہ جہاں — خضر کار و انوار

جہاں کی خاک بھی پویشِ گلستانِ مراد

بس ایک بار — خدا کے لئے ————— وہیں لے چل !

جہاں شباب — کو آئینہ دارِ نور کہیں !

جہاں "مشراب" کو نوبادہِ طور کہیں !

جہاں "خمار" کو تقدیسِ خیمِ حرم کہیں !

بس ایک بار — خدا کے لئے وہیں لے چل !

جہاں — نشاط کو اندیشہِ آمل نہیں ! !

جہاں — خوشی کبھی شرمندہِ ذوال نہیں !

جہاں — خانے کفن پا بھی پائمال نہیں !

بس ایک بار — خدا کے لئے ————— وہیں لے چل !

جہاں رواں ہیں شرابِ طور کے خشنے

نشاطِ قدس کے دریا — سرور کے خشنے

جہاں ہیں رقص میں صبا کو دے خشنے

بس ایک بار — خدا کے لئے ————— وہیں لے چل !

وہ ارضِ قدس جہاں پرفنا کا نام نہیں

جہاں طرب کے لئے غم کا التزام نہیں

جہاں کی شمع کو افسردگی سے کام نہیں

بس ایک بار — خدا کے لئے ————— وہیں لے چل !

سودا جس کا نمود و فائے لیلیٰ ہے

ہر ایک ذرہ جہاں کا دلِ زلیخا ہے

جہاں روشنی نے محبت کا نور بکھیرا

بس ایک بار خدا کے لئے ————— وہیں لے چل !

روحش (مستحق)





۴۳

فول کی کتابیں نگار بک مینی سے طلب فرمائیے

[illegible]





# نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے  
 رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا  
 سالانہ قیمت پانچ روپیہ (۵ روپے) ششماہی تین روپیہ (۳ روپے)  
 بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵	فہرست مضامین جون ۱۹۳۷ء	شمار ۶
۲	ملاحظات	
۹	فلسفہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت	میر ولی الدین ام لہ پٹی پانچ بڑی اقدان (مفسرہ کلہ جاسیہ عثمانیہ)
۲۹	رجونتی	احتمام ریشومی
۳۷	انسان کی لاد وال عظمت	عبد الحفیظ
۴۶	کتوبات نیاز	
۵۱	بیراگ کا بروگ	
۵۷	میکدہ اسلام	
۶۲	باب الانتقاد	
۶۸	باب المرسلۃ والمناظرہ	
۷۰	باب الاستفسار	
۷۲	نکھنہ کی ماعری	ہوش
۷۶	کلام اختر	اختر
۷۷	شک بیتاب	شیدا
۷۸	صدائے مطالبات	بنی احمد - کوکب

# نگار

ادٹیر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	جون ۱۳۳۶ء	شمار ۶
--------	-----------	--------

## ملاحظات

خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہندو سوسائٹی نے مجھ سے کیا ہے ؟  
یہ سوال خالص مذہبی ہے ، یعنی یہ جتنو اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو خدا کے وجود کا قائل ہے اور ایشور کا پایا جانا تسلیم کر چکا ہے ، لیکن جو منکر خدا ہے وہ کون اور کس نے سے گفتگو نہیں کرتا ، بلکہ اس کی تلاش یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم کیونکر ظہور میں آیا۔ اور اس کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے ؟  
ایک پابند مذہب انسان چونکہ خدا کو بالکل اسی طرح کا صنّاع و خلاق مانتا ہے جس طرح ایک کھار یا بڑھئی کہ جو برتن اسکے جی میں آیا بنا دیا جس طرح کی چوکی چاہی اسے طیار کردی اسلئے اصولاً اس کے سامنے کیونکر کا سوال نہیں آ سکتا ، کیونکہ ایک قادر مطلق اور مختار کل ہستی کو ہر وقت قدرت و اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے ، بغیر کسی ذریعہ و سبب کے اپنے ارادہ سے ہزار عالم پیدا کر دے اور جب اس کے جی میں آئے آتا فائنا محو کر دے۔ لیکن ایک منکر چونکہ دنیا کی پیدائش کو کسی ہستی کے ارادہ سے

معلق نہیں سمجھتا بلکہ اس کو مخصوص اسباب سے وابستہ جانتا ہے اور تدریجی ارتقاء کا قائل ہے اس لئے لامحالہ اُسے غور  
رنا چاہئے کہ اصول آفرینش کیا ہیں اور کن اسباب کے ماتحت کائنات نے موجودہ شکل اختیار کی ہے  
بہر حال اس باب میں ایک مذہبی انسان کا نقطہ نظر، منکر کے نقطہ نظر سے بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے اگر سندر جہ  
نمون سوال دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ دونوں کا جواب بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ لیکن  
مغلو اس میں ہے کہ کیا واقعی دونوں اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہیں۔ ایک مذہبی شخص جو پیدائش عالم کے لئے کسی  
ملکت و سبب کے وجود کو ضروری نہیں سمجھتا وہ نتیجہ و غایت پر غور کرنے کا مستحق کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی جب اس نے  
تسلیم کر لیا کہ خدا قادر مطلق ہے، اس سے کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا، وہ جو چاہے پیدا کر دے اور جب چاہے فنا کر دے، تو پھر  
لیوں کا سوال کیا، یہ ”جون و چرا“ تو اسباب و علل سے متعلق ہو کرتا ہے اور جب وہاں سرے سے اسی کا انکار کیا جاتا ہے  
تو استفسار کیوں؟۔ البتہ ایک منکر کے متعلق خیال ہو سکتا ہے کہ اس نے اس پر غور کیا ہوگا، لیکن اگر انصاف سے پوچھ  
تو یہ کہنا پڑے گا ”کیوں“ کا جواب نہ خدا کا اقرار کرنے والا دے سکتا ہے نہ انکار کرنے والا، کیونکہ جس طرح مذہب آج تک  
غایت آفرینش کو نہیں سمجھ سکا، اسی طرح سائنس بھی اس معما کو حل نہیں کر سکی، یعنی اگر ایک پابند مذہب شخص یہ نہیں ٹانگتا  
کہ کائنات کے پیدا کرنے سے خدا کا کیا مقصود ہے تو بڑے سے بڑا سائنس دان بھی نہیں کہہ سکتا کہ مادہ و قوت کے اس ہوجا  
کا نتیجہ کیا ہونا ہے۔ لیکن کس قدر جرتناک امر ہے کہ باوجود اس نااہلی کے دونوں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور  
ان میں سے ہر ایک اصرار کرتا ہے کہ وہی حق پر ہے، درحالیکہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ادنیٰ دلیل بھی اس دعوے کے  
لئے موجود نہیں۔ اہل مذاہب میں ایک جماعت تو علماء و فاضلین ہیں جو اپنے آپ کو مخصوص شریعت کا پابند کہتے ہیں اور جو  
مذہب کو صرف اُن کتابوں سے سمجھنا چاہتے ہیں جو ان کے اسلاف رکھ گئے ہیں اور جن کی بنا پر سوسائٹی کا.... نظام  
مقرر کیا گیا تھا، دوسری جماعت اہل تصوف کی ہے جنہوں نے اپنے مسلک کا نام شریعت نہیں بلکہ طریقت رکھا ہے اور  
اور جو تمام مسائل کو روحانیت سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں میں اول الذکر جماعت کے پاس  
اس سوال کا کھلا ہوا جواب موجود ہے اور اُن کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ قرآن نے کھلے ہوئے الفاظ میں اس  
سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے کہ ”ما خلقت الانس والجن الا ليعبدون“ یعنی ہم نے انسان و  
جنات کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت کریں۔ اس لئے اگر آج عبادت کی کیفیت و ہیئت متعین ہو جائے  
تو ایک مسلمان کے پاس اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں۔ عام طور پر عبادت کا مفہوم نہ صرف اسلام بلکہ تمام  
دیگر مذاہب میں وہی ہے جسے پوجا یا پرستش سے ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ دنیا میں کوئی فعل ارادہ و نتیجہ سے بے  
نیاز نہیں ہو سکتا، اس لئے ہر شخص کا (خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہو) فطری حق ہے کہ وہ ان دونوں باتوں پر  
غور کرے۔ یعنی ایک یہ کہ وہ کس ارادہ و نیت سے خدا کی پوجا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ جو غرض و غایت اس نے



سمجھ رکھی ہے وہ عبادت سے کس حد تک پوری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ مذہبی اقوام میں بلا استثنا کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اس اسادہ و نیت سے عبادت نہ کرتی ہو کہ اس سے خدا خوش ہوگا اور وہ ہماری مشکلات کو دور کرے گا، پھر اگر واقعی کسی کسی کے مصائب دور ہو جاتے ہیں تو وہ اسکو اسی عبادت کا نتیجہ خیال کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ پر الزام قائم کرتا ہے کہ جو حق عبادت کرنے کا تقادہ ادا نہ ہوا اور خدا کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکی۔۔۔۔۔ اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک انسان کے جذبات تاثرات کا تعلق ہے اس خیال سے اس کو کافی تسکین ہو جاتی ہے اور وہ مایوسی کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے، لیکن جب جذبات کی دنیا سے علیحدہ ہو کر سوال صرف علمی تحقیق کا ہوتا ہے یا کسی ایسے شخص کی تسکین کا ہوتا ہے جو کسی معلول کا وجود بغیر علت کے ماننے کے لئے طیار نہیں، تو لامحالہ غور کرنا پڑتا ہے کہ عبادت سے خدا کا خوش ہونا کیا معنی رکھ سکتا ہے۔ اور خدا کی خوشی یا رضامندی کا ہمارے دنیاوی حالات و اسباب سے کیا تعلق ہے۔۔۔۔۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ”حقیقت خدا“ کا سلسلہ آتا ہے یعنی یہ کہ جب تک ہم کو پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ خدا کیا ہے، اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے، اس وقت تک نہ ہم عبادت کی کوئی علمی توجیہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے کسی نتیجے کے پیدا ہونے پر حکم لگا سکتے ہیں۔۔۔۔۔ خدا کے متعلق انسان کا اولین تصور بالکل وہی ہے جو دنیا کے کسی مستبد بادشاہ و حکمران کے متعلق ہو سکتا ہے یعنی خوشامد و تعلق سے خوش ہونا، کائنات و زمانہ و جہاں کے نظر انتفات صرف کرنا، اور سربازی و نافرانی سے غضب آلود ہو کر سزا میں دینا، اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ نفس خدا کی مابیت و حقیقت پر بعض مذاہب کے خیالات زیادہ بلند و لطیف ہو گئے ہیں، لیکن جس حد تک پرستش کا تعلق ہے، خدا کی ہستی اب بھی وہی خوش یا ناخوش ہو جانے والی بتلی جاتی ہے اور اپنے بندوں کو سزا یا انعام دینے سے بدستور وہی دلچسپی اس کو باقی ہے

ایک طرف تو یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا زمان و مکان سے علیحدہ، احساس و تاثیر سے بیکار، اور بے نیاز مطلق ہے، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ برہمی و خوشنودی کا محل ہے۔ اور انعام و انتقام کا جذبہ اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ہی وقت میں خدا کو دو متضاد صفات کے ساتھ تصف کرنا کیونکر ممکن ہے۔ اور اس کی خوشنودی یا برہمی کیا معنی رکھ سکتی ہے، جبکہ وہ خود نہ کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے اور نہ اسے پوجایا پرستش کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ بعض اہل مذاہب کہتے ہیں کہ عبادت سے خدا کو خوش کرنے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خود عبادت کر نیوالا۔ اس سے فائدہ اٹھائے، یعنی خدا کی پرستش کا مقصد خود اپنی اصلاح ہے۔ بالکل درست لیکن یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ عبادت سے جو اپنی اصلاح وابستہ ہے وہ ہمارے اعمال و افعال سے بھی کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں، یعنی محض ہمارا عبادت کر لینا کافی ہے یا اس کے ساتھ اپنی زندگی میں بھی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؟

ظاہر ہے کہ محض عبادت خواہ وہ کسی صورت میں ہو بیکار ہے اگر وہ ہمارے اخلاق و اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ عبادت کا دعائے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے اور اسی کو خدا کی خوشنودی سے تعبیر کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس طرف توجہ ہو اور وہ اسے ترک نہ کر بیٹھیں۔۔۔۔۔ بظاہر یہ بیان بہت قرین عقل و صواب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی گمراہی و شقاوت کا بڑا سبب یہی ہے۔۔۔۔۔ چونکہ اہل مذاہب نے ہمیشہ سی لوگوں کو سکھایا کہ خدا

عبادت سے خوش ہوتا ہے اور خدا کی خوشنودی ہی حاصل کرنا عین مدعا ہے، اس لئے یہ بات کبھی اُن کے ذہن میں نہ آئی کہ عبادت کا تعلق خود اپنی اصلاح اعمال سے ہے اور اگر اہم اپنی زندگی میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں تو عبادت بیکار ہے۔ اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ عبادت نام قرار دیا گیا صرف چند مخصوص حرکات و مراکم کا۔ اور دوسری طرف لوگوں کے اخلاق پر یہ خراب اثر پڑا کہ خدا کو عبادت سے خوش رکھنے کے اعتماد پر وہ دنیاوی معاملات میں ہر قسم کی بے عنوانی پر آمادہ ہو گئے اور اخوت و ہمدردی کا جذبہ جو نظام تمدن کی جان ہے ان کے اندر ضعیف ہونے لگا

اگر ابتدا ہی سے اس امر پر زور دیا جاتا کہ خدا تمہاری عبادت سے خوش نہیں ہوتا بلکہ تمہاری اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے اور عبادت کا مدعا بھی یہی ہے تو شاید دنیا کی حالت آج دوسری ہوتی۔ ہر چند بعض مذاہب نے عبادت کی ماہیت و غلات بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان بار بار کیا ہے، لیکن چونکہ عبادت پرستش میں حیات بعد الموت کی راحت کا خیال بھی شامل کر دیا گیا ہے اس لئے اُس دنیاوی زندگی میں اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتا اور عام طور پر لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اصل زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور چونکہ اس کے متعلق عبادت کے بعد اطمینان ہو ہی گیا ہے اس لئے اس دور و زہ زندگی کی اصلاح میں کیا سرکھسا جائے۔ میری رائے میں مذاہب کی سب سے زیادہ خطرناک تعلیم یہی ہے کہ دنیا فانی ہے، انسان فانی ہے اور بقا اس زندگی کو حاصل ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوگی اور اسی کو سنوارنے کی ضرورت ہے۔ گویا انسانوں کا یہ اجتماع سرائے کے مسافروں کا اجتماع ہے جسے صبح یا شام منسخر ہو جانا ہے، پھر ظاہر ہے کہ جب تعلیم یہ ہوگی تو باہمدگر کیا ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے اور دنیاوی زندگی کی ترقی و اصلاح کے لئے کون سا جذبہ کام کر سکتا ہے۔ مسلمانوں میں نماز کا طریق عبادت اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک اجتماعی کیفیت لئے ہوئے ہے، لیکن چونکہ وہاں بھی دہی آخرت و معاد کا خیال ساتھ ساتھ ہوتا ہے، اس لئے اگر مسلمان یکجا جمع ہوتے ہیں تو صرف انفرادی طور پر اپنی اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ کسی بڑی سی بڑی مسجد کا اجتماع جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے جانور کسی احاطہ کے اندر جمع کر دیے گئے ہیں۔ اور ایک ہی صفت میں باس پاس بیٹھنے والوں کو بھی ایک دوسرے کے درد و کھ کی خبر نہیں ہے۔ اگر مسجدوں کا یہ اجتماع، بجائے روزانہ پانچ مرتبہ کے ہفتہ میں صرف ایک ہی بار ہو اور سجدہ و رکوع کی جگہ وہ آپس میں بیٹھ کر تبادلہ خیال کریں، اور اپنے اپنے محلہ کے بچوں کی تعلیم، بیواؤں کی پرورش، ضعیفوں اور بیماروں کی نگرانی مفلسوں اور ناداروں کی امداد، جماعتی تنظیم، اقتصادی مشکلات، اور سیاسی مسائل پر گفتگو کر کے کلائجہ عمل بھی طیارہ کرتے رہیں تو کتنا عظیم فائدہ مرتب ہو سکتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ان کے دلدل الاجتماع تھے، جہاں قوم کے تمام معاملات پر گفتگو ہوتی تھی، لیکن آج مولوی کتا ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر کوئی بات دنیا کی نہ کرو۔ یعنی صرف اُس دنیا کی بات کرو جس کا علم تمہیں تو نہیں ہے لیکن اُس مولوی کو ضرور ہے جو خدا کے مخلوق تیاں باز میں سے ہے اور جس کے ہاتھ میں ہے خواہ تم کو جہنم میں ڈالے یا فردوس بریں میں بھیج دے۔ علماء و ظاہر کے مفہوم عبادت نے جو مذموم صورت اختیار کی اس کا حال



تو آپ کو اس بیان سے واضح ہو گیا ہوگا، اب رہ گئے اہل باطن جو بجائے شریعت کے طریقت پر کار بند ہیں، سواس میں مشک نہیں کہ جس حد تک خدا کے تصور کا تعلق تھا وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے عقیدہ ”ہمدادست“ سے ”خدا“ کی تعبیر بڑی حد تک قابل قبول صورت میں پیش کی، لیکن عبادت کے سلسلہ کو وہ بھی یہ صل کر سکے اور چونکہ معاد و آخرت کی زندگی اُن کے یہاں بھی اصل چیز تھی اس لئے باوجود گمانے بجائے کاشوق رکھنے کے بھی وہ عبادت کے سلسلہ میں علما، اطباء، ہر کی پابندیوں سے علیحدہ نہ ہو سکے اور شریعت کے مقابل میں انکی طریقت اپنا کوئی مستقل ادارہ جدا گانہ قائم نہ کر سکی۔ الغرض مسلمانوں کی نظر سے اس سوال کا یہ جواب دینا کہ خدا سے انس و جن کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں، عام تبادلہ معنی کے لحاظ سے نوع انسانی کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا۔۔۔۔۔ دنیا میں ترقی یافتہ مذاہب دو طرح کے ہیں، ایک وہ جنہوں نے زندگی باندھ بگا کوئی فلسفہ پیش کیا اور دوسرے وہ جنہوں نے صرف عملی زندگی کو سامنے رکھ کر چند اصول سوسائٹی کے مرتب کرنے پر اتفاقی ہر چند اول الذکر مذاہب کی تعلیم کا بھی حقیقی مقصد وہی سوسائٹی کی اصلاح تھا لیکن جس طرح براہ راست عملی زندگی کا درس دینے والے مذاہب حیات بعد الموت کے قابل ہو کر مراکم و شعائر میں الجھ کر رہ گئے، اسی طرح فلسفہ پیش کرنے والے مذاہب بھی نفسیاتی گتھیوں کے سلجھانے میں محو ہو کر ایسے دور ادکار قیاسات میں مبتلا ہو گئے کہ سوسائٹی کا مفاد نظر انداز ہو گیا اور ان کی فلسفیانہ عقل آرائیاں، مادی حقیقتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی لائحہ عمل بنی نوع انسان کے سامنے پیش نہ کر سکیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ مذہب کا تعلق کسی قومی عروج و ارتقاء سے نہیں ہے جس کیلئے تیغ و تفتنگ کا جارحانہ یہ مدافعت استعمال ضروری ہو بلکہ صرف فلسفہ احیات پر غور کرنے اور خاموشی سے رموز زندگی حل کرنے سے ہے تو بتائے کہ ہندوؤں کے فلسفہ ویدانت، زروان، اہمسا اور مکتبی نے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا۔ یعنی اگر تلوار ہاتھ میں لیکر دنیاوی جاہ و حشم کو اپنے لئے انحصار کر لینے سے دنیا کو نقصان پہونچا تو بودھ کی طرح کاسے گدائی لیکر در در کی بھیک مانگنے سے نوع انسانی کو کیا نجات حاصل ہوئی۔ اگر کسی قوم نے اُسے تلوار سے عروج کیا تو دوسری نے اُسے اپانج بنایا، اگر ایک نے نفس پرستی و خود غرضی کو رواج دیا تو دوسری نے نفس مدعا اور غرض مشترک کو محو کر کے انسانی عراطم کو سر دہریں میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا۔ الغرض نوع انسانی کو نہ ان مذاہب کوئی فائدہ پہونچا جو بیکسر عمل ہوتے کے مدعی ہیں اور نہ اُن مذاہب جو صرف فلسفہ پیش کرنا منہمک نظر سمجھے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا سبب مسئلہ ”روحانیت“ یا ”فلسفہ الطبیعیات“ ہے جس نے انسان کی دنیاوی زندگی کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور حقیقی زندگی کو اس عالم سے متعلق ہی نہ رکھا۔ اگر یہاں کی زندگی کو اہمیت دی جاتی تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ بھی کی جاتی لیکن چونکہ بلا استثنا تمام مذاہب نے مادی حیات کی تخفیف کی اور اسکو ناقابل اعتناء سمجھا، اس لئے اصولاً کوئی مذہب دنیاوی لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور انسان کے نفسیاتی میلان نے جو ہنگامہ یہاں برپا کر رکھا ہے اس کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ یہی تلخ تجربہ تھا جس نے دنیا میں مادہ پرست جماعت پیدا کر دی اور دنیا کو دنیا کے اصول سے سمجھنے اور کار بند ہونے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔۔ پھر ہر چند ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادیین نے جو کچھ سمجھا وہ بالکل درست ہے یا اُن کے مقرر کئے ہوئے اصول

دنیا کے امن و نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصود بالکل بر محل ہے اور قضیہ زمیں بر سر زمین کے اصول پر کار بند ہونے سے وہ انسانی دماغ کی بہت سی تشویشوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اُن کے سامنے نہ ایسے خدا کا سوال ہے جس سے قادر مطلق اور فعال لما یرید ہونے کی حیثیت سے انسان کو دنیا میں عضو بیکار بنا رکھا ہے اور نہ وہ اپنا وقت اس مسئلہ پر غور کرتے میں ضائع کرتے ہیں کہ دنیا کیوں پیدا کی گئی۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا پیدا ہو چکی ہے، اور اسی میں ہم کو زندگی بسر کرنا ہے، اس کے بعد کچھ نہیں ہے اس لئے ہمارے ممکن کوشش کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اور ترقی کی جتنی راہیں ہیں ان پر چل کر دنیا کو اپنے لئے جنت بنا لینا چاہئے

اس میں شک نہیں کہ یہ مادی تحریک اخلاق کی ضامن نہیں ہے، اور اس سے خود غرضی کا جذبہ قوی ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو ہلاک کر دینا مستبعد نہیں، لیکن اگر صرف اسی دلیل پر اس تحریک کو رد کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کی حمایت کی جائے جبکہ اس نے بھی یہی کیا اور اس کے ہاتھ بھی ہمیشہ خون سے رنگین نظر آئے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ ایک نے خدا کا نام لیکر تلوار اٹھائی اور دوسرا خدا کو بدنام نہیں کرتا اور اپنی ہی اغراض کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے علاوہ اس کے ایک مسئلہ اور اس جگہ قابل غور ہے، وہ یہ کہ مادی مذہب ہنوز ارتقاء کی حالت میں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ آئندہ کوئی صورت ایسی پیش آئے کہ انسان خوریزی سے باز رہنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ حالت موجودہ نظام تمدن نے جو ہمیشہ مادی ترقی پر قائم ہے، وسیع ہو کر ایسی عجیب صورت اختیار کر لی ہے کہ آہستہ آہستہ تمام قومیں، تمام جماعتیں بلکہ جملہ افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے جاتے ہیں، یعنی اغراض کی تکمیل روز بروز باہمی تعاون پر منحصر ہوتی جا رہی ہے، پھر کیا یہ امر خلاف عقل ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب باہمی تصادم کی تمام صورتیں مسدود ہو جائیں اور تمام نوع انسانی ایک نظام سے وابستہ ہو کر ایک قوم، ایک جماعت، ایک ہیئت اور ایک تشکیل میں بدل جائیں یہاں تک باہمی جنگ و خونریزی کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ اس وقت جس چیز نے دنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی جنگ ہے، یعنی دنیا اب اس کو برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان انسان میں تفریق صرف اس بنا پر قائم ہے کہ ایک کے پاس دولت کا انبار ہے اور دوسرا اس سے محروم ہے۔ دولت انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ایک مفوضہ قوت ہے جس سے اس وقت تک کام لیا جاسکتا ہے، جب تک سب یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں، لیکن اگر یہ مساوات مفقود ہو جائے اور دولت انسانیت کو با مال کرنے میں صرف ہونے لگے تو اس کو مٹ جانا چاہئے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت یورپ کا ہر ملک اس جذبہ سے متاثر ہو رہا ہے اور تمام وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ استبداد و استعمار پر قائم تھیں ایک ایک کر کے اشتراکی اصول پر کار بند ہونے کے لئے مجبور ہو رہی ہیں پھر اگر شاری دنیا میں اشتراکیت پھیل جائے اور دولت مندی و افلاس کا مفہوم ہی بالکل بدل جائے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ایک انسان ..... دوسرے انسان سے اور ایک جماعت دوسری جماعت سے بر سر پیکار ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ سارا اختلاف تو اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ

فلاں سرمایہ دار ہے اور فلاں ہتی دست لیکن اگر یہ اختلاف مٹ کر تمام انسان ایک سطح پر آجائیں تو مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور دنیا اس امن و سکون کو حاصل کر سکتی ہے جسے مذاہب عالم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکے۔ اس لئے یہ حالات موجودہ ہمارا یہ سوچنا کہ خدائے کائنات کو کیوں پیدا کیا، حد درجہ تضییع اوقات ہے، سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب ہم اس دنیا میں آگئے ہیں تو ہم کو زندگی کیونکر بسر کرنا چاہئے اور اپنا وقت کس طرح صرف کرنا چاہئے۔ خدا کی حقیقت کیا ہے، دنیا سے اس کا کیا تعلق ہے، اس تعلق کی بناء پر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اور کیا نہیں، یہ سب ایسے دُور اذکار سوالات ہیں کہ نہ اس وقت تک ان کا کوئی شافی جواب دیا جا چکا ہے اور نہ آئندہ ممکن ہے۔ انسان واقعات و حوادث کا بندہ ہے، اسباب و علل کی دنیا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، اس لئے اُسے انہیں باتوں پر غور کرنا چاہئے جس سے اُس کی زندگی متعلق ہے۔ اگر خدا دنیا میں آکر ہمارے کاموں میں ہلدا ہاتھ نہیں بٹاتا تو ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کے متعلق گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع کرتے رہیں، اگر اُس نے کُن کُنہہ کر دفتہ عالم کو پیدا کر دیا تو کیا اور تدریجی ارتقاء کے ساتھ عالم کو سنوارا تو کیا۔ انسان کے درد و کھ کا علاج ان میں سے کسی اعتقاد سے متعلق نہیں۔ پھانس اگر چہی ہے تو اس کی تکلیف اس کے نکالنے ہی سے دُور ہو سکتی ہے نہ کہ اس بات پر غور کرنے سے کہ پھانس کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر گوشت کے اندر پہنچ گئی۔

گھر میں جس وقت آگ لگتی ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے سے پہلے اس کے بجھانے کی فکر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو حقیقی معنی میں نوع انسانی کے خیر خواہ ہیں، ان کو نہ خدا کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ سوچنے کی کہ اس نے دنیا کو کیوں پیدا کیا، بلکہ صرف ان تدابیر پر غور کرنے کی کہ تمام انسان باہم مل کر صلح و آشتی کی زندگی کیونکر بسر کر سکتے ہیں۔

مذاہب عالم تو اس تجربہ میں ناکام رہے، اس لئے نا محالہ ہمیں اُن سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا پڑے گی، خواہ وہ اشتراکیت ہو یا کچھ اور۔ پھر اب دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ زمانہ کا رخ کیا ہے، سیلاب کا بہاؤ کس طرف ہے۔ اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا تو بیشک ہم کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ خس و خاشاک کی طرح بہ جانا یقینی ہے اور مذاہب کا تنکا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

### ننگار کی خریداری جاری رکھئے

تاکہ جنوری ۱۹۳۵ء کا ننگار جو دنیا کے صحافت میں بالکل پہلی چیز ہو گا آپ کو مفت حاصل ہو سکے۔ جنوری ۱۹۳۵ء کا ننگار کیسا ہو گا اس کے لئے اس ماہ کے رسالہ کا صفحہ ۹، ۱۰ ملاحظہ فرمائے

مینجر ننگار لکھنؤ

# فلسفہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت

فلسفہ ؟ وہی تجربات کا گورکھ دھندہ ؟ وہی لم دلائل کا دعویٰ ؟ وہی انیری تخیلات جو منت کش معنی نہیں ؟  
 الجھن شاید سب ہی کو پیدا ہوتی ہے کہ آخر فلسفہ صرف بحث و مباحثہ ہی کا نام ہے جہاں بحث صرف بحث ہی کی خاطر کیا جاتی  
 یا اس بحث کا کوئی موضوع بھی ہوتا ہے جو واضح، صریح، متعین ہو ؟ سب جانتے ہیں کہ علم ہیئت میں اجرام سماوی سے بحث  
 کی جاتی ہے تو ارضیات میں زمین اور چٹانوں سے، نفسیات کا موضوع ذہن یا نفس ہے جہاں احساس الاداء اور عقل کی  
 ماہیت پر غور کیا جاتا ہے، خود راہ شناس کے حکیمانہ ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہم پوچھتے ہیں کہ جذبات کا زور مرد افکن کیوں ہوتا  
 ہے، عقل ان کے شر و شور پر کہاں تک غالب ہو سکتی ہے، شور کے کیا معنی ہیں، تسلسل ذات سے کیا مراد وغیرہ وغیرہ۔ بہر  
 حال یہ تمام علوم و اوقات کے ایک متعین دائرہ سے بحث کرتے ہیں، یہ اوقات نہایت اہم و دلچسپ ہیں، علمی و عملی لحاظ سے  
 ان کا فائدہ مسلم ہے۔ لیکن فلسفہ میں کس چیز سے بحث ہوتی ہے، اس کا مبحث عنہ کیا ہے ؟ استدلالیوں کی یہ چٹاں و چٹیں  
 یہ لم و نسلم آخر کس چیز کے متعلق ہے ؟ کیا اہم لا نہیں سنا کہ

پائے استدلالیاں جو ہیں بود

پائے جو ہیں سخت بے تکلیف بود

سوال بالکل جائز ہے اور ہمیں ابتدا ہی میں اس کے جواب کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ آپ سچ بتلائے کہ آپ میں  
 سے کوئی ایسا بھی ہے جو زمین اور چٹانوں، اجرام سماوی اور اعمال ذہنی اور دوسرے مخصوص و متعین حالات کے مطالعہ  
 سے کبھی نہ کبھی بیزاریا پریشان نہ ہو گیا ہو اور یہ کہتے ہوئے کہ عہد کتاب و صد ورق دہتا رکھن۔ یہ نہ بڑ چھا ہو کہ آخر یہ سب  
 کچھ کا ہے کے لئے ؟

اس جھگڑے کا انجام ؟ اس کی قدر و قیمت ؟ اس کے معنی و مقصود ؟ پس فائدہ در جہاں بیفائدہ چیست ؟  
 جب آپ اس محدود دنیا کے مخصوص و متعین اوقات سے پریشان ہو کر خود دنیا کے معنی و مقصود، اس کی قدر و قیمت و  
 اہمیت اور فرد و عالم کے تعلق کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ اسی بدعت کے مرتکب ہوتے ہیں جس کے ارتکاب پر آپ فلسفیوں  
 کو ”آوارہ و مجنوں رسوا سرا بازار“ قرار دیتے تھے۔

براؤٹنگ کہا کرتا تھا کہ زندگی کچھ معنی رکھتی ہے اور اسی معنی کا دریافت کرنا میری غذا، میرا اکل و خرب ہے۔ براؤٹنگ فلسفی تھا۔ فلسفہ کی یہی تعریف ہے کہ یہ ”معانی اور قیمتوں کا مطالعہ ہے“ یہ حیات کی توجیہ و تفسیر ہے

فلسفی حیات من حیث کل کا ثابت قدمی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، اس کا نقطہ نگاہ وسیع ہوتا ہے، وہ کسی خاص محدود نقطہ نظر سے زندگی پر غور نہیں کرتا بلکہ بقول فلاطون کے ”تمام زمان و مکان کا ناظر ہوتا ہے“ کسی شے پر فلسفیانہ طور پر نظر رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ نگاہ میں دست ہو، اس شے کو دوسری تمام اشیاء کے ساتھ رکھ کر دیکھیں، تناسب کا پورا خیال ہو۔ ہم اس کی توجیہ میں ڈاکٹر جاسن کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کریں گے۔ جس کو باسول نے بیان کیا ہے۔ باسول نے ایک روز جاسن اور ان کے چند رفقاء کی اپنے مکان پر دعوت کی۔ دعوت کے ایک روز قبل باسول کے لائڈلارڈ نے اس کو اپنی انتہائی بد ذاتی سے مکان پر زلیوہ آدمیوں کو مدعو کرنے کی اجازت نہیں دی۔ باسول نہایت آدرودہ خاطر ہوا اور جاسن کو اس واقعہ سانحو کی اطلاع دی۔ جاسن نے یہ سن کر خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے اندام میں کہا کہ ”جناب ذرا سوچئے تو سہی یہ واقعہ کوئی بارہ سینے بعد کس قدر حقیر معلوم ہو گا!“ جاسن فکر و نظر کی رو سے نہ سہی کردار و عمل کے لحاظ سے بجا فلسفی تھا، اس نے فوراً یہ دیکھ لیا کہ انسان کی زندگی میں اس قسم کے بے شمار واقعات پیش آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، ان میں صرف ایک پر تمام توجہ کو مرکوز کرنا ان کے تناسب کو نظر انداز کرنا ہے۔ نگاہ میں تنگی پیدا کرنا ہے۔ فلسفی واقعات عالم کو اپنے اپنے تناسب یا حقو کی لحاظ سے دیکھتا ہے، کل میں ہر ایک کو مناسب جگہ دیتا ہے، جانب داری، تعصب، تنگی، اس کی نگاہ میں نہیں پائے جاتے، بالفاظ دیگر وہ زندگی کو ”ابدیت کی روشنی“ میں دیکھتا ہے

بعض دفعہ فلسفہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ ”یہ حکیمانہ طریقوں کی مدد سے اس دنیا کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں“

ہلہی اس مانوس دنیا کو جس میں ہماری بود و باش ہوتی ہے علوم مخصوصہ کے تمام نتائج و قیمتات کی مدد سے پوری طرح سمجھنا طالیس.... کے زمانہ سے جو یونان کا پہلا فلسفی سمجھا جاتا ہے، اب تک فلسفہ کی غایت یہی ہے۔ دنیا بہت مانوس تو نظر آتی ہے لیکن آخر ”دنیا“ سے مراد کیا ہے؟ یونان کے اہل نظر دنیا یا کائنات کو، ہم معنی سمجھتے تھے۔ اور ہر زمانہ کے فلسفیوں نے نہایت ہمت و جرات کے ساتھ اس عظیم الشان کائنات کی کنہ یا ماہیت کے پتہ لگانے کا کام اپنے سر لیا۔ کسی فلسفی شاعر ہی نے تو یہ کہا تھا کہ ارض و سماں تیری ولایت کو پاسکے، میرا ہی دل ہے جہاں تو سما سکے، تو پھر کائنات کی وسعت و مروت یعنی مکان و زمان کی نوعیت کیا ہے، اس نامتناہی زمان و مکان و ملی کائنات کے خالق کا نشان کہاں، اس کا مقصد غائت کہا، اس کا مایہ خیر کیا، اس کا حضرت انسان، اس کی روح اور اس کے منہا سے تعلق کیا ہے، یہ وہ انتہائی وابدی سوالات ہیں جن کے جواب کی تلاش میں دیموقراطیس اور فلاطون اور ارسطو سینٹ گسٹس، برونو، ڈیکارٹ، سینیوزا، کانٹ، ہیگل اور ہربٹ اسپنسر اور دیگر اکابر فلسفہ نے اپنی جانیں دیں اور میری عظیم الشان سوالات اب تک قابل غور ہیں اور درشتگان

عقل کے لئے ہمیشہ رہیں گے

موجودہ زمانہ میں ہمارا نقطہ نظر زیادہ تر انفرادی و انسی واقع ہوا ہے، ہم دنیا پر اپنی نگاہ سے غور نہیں کرتے بلکہ معاشرتی، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اس کی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں۔ قدما یونان کو ثبات و تغیر عالم کا مسئلہ پریشان کیا کرتا تھا، لیکن تغیر سے ان کی مراد مادی تغیر تھی یعنی مادی ذرات یا اجزا کی حرکت یا نشو و نما، زوال و فنا کے مظاہر چنانچہ یونیو کال خیال تھا کہ قدرت کے کارخانہ میں تغیر محال ہے، عاقل کو بظاہر ہر تغیر دکھائی دیتا ہے وہ محض فریب و التباس ہے، لیکن اہرقلیتوس کا یقین تھا کہ ثبات و سکوت کائنات کی کسی شے میں نہیں، دنیا ستر پانچ تغیر، تبدل، تنوع ہے۔ یہ اور اس قسم کے مسائل اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک لاجواب ہیں لیکن ہماری دلچسپی دنیا کے کسی اور طرح کے تغیر سے وابستہ ہو گئی ہے، ہم معاشرتی رسوم، سیاسی علاقے، اخلاق و ادب، مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی تغیر پذیر دنیا بھی توجیہ کی اسی قدر محتاج ہے جیسی کہ اجزائے مادی کو تغیرات والی دنیا، لہذا فلسفہ کی ضرورت یقینی، فرق صرف اتنا ہے کہ اب فلسفہ حیات اس کی قدر و قیمت، اس کی بدایت و نہایت و غرض و غایت کی توجیہ کرتا ہے اس لئے ارتقا، ترقی، ذہن کے طریقے، کردار و معاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ کے لئے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں

شاید حاضرین میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جن کے ذہن نے کبھی نہ کبھی اس قسم کے سوالات کو نہ اٹھایا ہوگا: کیا خدا کا وجود ممکن ہے یا سوائے مادہ اور *Energy* کے کوئی تغیر پذیر مادہ کا مایہ خیر کیا ہے؟ کیا دردت زیادہ کوئی چیز جیتی ہو سکتی ہے؟ اگر جلوہ فرمایا صرف مادہ کی ہے تو وہ کیا چیز ہے، کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا تو کیا ذہن مادہ سے جدا نہیں؟ میر غور و فکر کرنا، در دوالم سنا کیا صرف مادی جسم ہی سے تعلق رکھتا ہے، مادی جسم ہی کا وظیفہ ہے یا اس سے جدا ہے؟ میں ذمہ ہوں۔ حیات کیا ہے؟ یہ سب کیا ہے جو بقول اقبال تلخ تر او کلو ترست؟ ایک رو در مجھے موت آئے گی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابوالعلاء یہ نے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا

الموت باب دکل الناس یدخلہ

یلیت شعری ہذا للباب مال الداس

ہم آدھ نظر آتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ میر کا خیال تھا کہ ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے عنناری کی امانت کا خیال تھا کہ

مدیس آئینہ طوطی صفت داشتہ اند!

دانتہ کیا ہے؟ مجھ سے آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض ان میں گے صائب ہیں اور بعض خطا پذیر، صواب

لے موت ایک دروازہ ہے جس میں ہر شخص داخل ہوتا ہے، اسے کاش یہ مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازے کے بعد مکان کونسا ہے

خطا کے کیا معنی ؟ ان کے معیار کیا ؟ ہم میں سے بعض تلاش زر میں سرگرداں ہیں ، بعض شہرت کے خواہاں ، بعض لذت کے دلدادہ اور بعض خوش باش دے کہ زندگانی رن سست کے پیرو۔ کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قیمتیں ہیں ؟ یا ان سے اعلیٰ وارفع نصب العین موجود ہیں ؟ مثلاً واقعہ ہے ” علانیت انفس “ کو خیر برتر قرار دیا تھا ، ..... دنیا کی کوئی مصیبت ، دنیا کی کوئی خوشی ، اطمینان خاطر ، کو صدمہ نہیں پہنچا سکتی ، چنانچہ بی بی اس (Bethunius) نے روم کے جبل خانہ میں ” فلسفہ کے تسلی بخش لذات ، پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا۔ کیا اسی طرح محبت ، فرض ، تلاش حکمت ، فنون لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قیمتیں قرار نہیں دی جاسکتیں ؟ ہم یہ تمام سوالات اٹھا سکتے ہیں ، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے ؟ علم انسانی کے حدود کیا ہیں ؟ اس کی اڑان کتنی ؟ غلامہ اذیں فطرت و صنعت میں خوبصورت اشیاء میرا محاصرہ کئے ہوئے ہیں ، اکثر بدصورت بھی ہیں ، حسن کیا ہے ؟ ایک خوبصورت عمارت میں ، ایک حسین چہرہ میں موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس سے ہم کیف اندوز ہو رہے ہیں ؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں ، ..... ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرت پوشاک حسن میں لبوس ہوتی ؟ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں ، ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے ، ان پر غور و فکر کرنا ، یکساں طور پر ، تدقیق و تحقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا ، ان کے جواب فراہم کرنے کی سعی کرنا۔ گو یہ سعی لاعاصل سی۔ فلسفہ ہے ، یا جیسے فلسفہ کے ایک شیدائی ولیم جیمس نے کہا ہے ، ” فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش کا نام ہے “ یہ کام اللہ کا نہیں جو ان مطلق کا نہیں انسان کا ہے ، ہر انسان کا خواہ وہ حیوانیات کا پر و فیسر ہو یا تاریخ کا !

ان سوالات کا مبداء تجسس و استعجاب ہے ، انسان کی حیوان سے وجہ امتیاز یہی تجسس کا جذبہ ہے اور اسی کو فلاطون نے فلسفہ کا مبداء قرار دیا ہے ، افلاطون کے ہم وطنوں نے اپنی زندگی فلسفہ کے لئے وقف کر دی تھی ، لیکن ہمارے مقابلہ میں ان کا کائنات کے متعلق نقطہ نظر سادہ اور طفلانہ تھا ، تاہم ان کی طبیعت میں تعجب زیادہ تھا ، وہ دنیا کی ہر شے ہر منظر پر استعجابانہ نظر ڈالتے تھے اور بہت جلد ان کے اس استعجاب و تعجب نے ان کو فلسفہ کی راہ پر لگایا ، اس زاویہ نگاہ سے ، ہم فلسفہ کی اس طرح تعریف کر سکتے ہیں کہ ” یہ وہ استعجاب ہے جو سنجیدہ و متین فکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے “

ایک چھوٹی لڑکی دیر بچہ سے منہ کھال کر غور و خوض کے ساتھ راہروں کے دار فتنہ حرکات دیکھ رہی تھی ، ایک دم وہ بیٹھی اور اپنی ماں کے منہ سے منہ ملا کر پوچھنے لگی ” اماں میری یہ سمجھ میں نہیں آتا ، تم ہی بتلا دو کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ؟ “ اس معصوم جان کا اس طرح فکر کرنا فلسفہ ہے ! ہم میں سے بہت سارے ، بچے اور بڑے ، دنیا کے متعلق کچھ استفسار نہیں کرتے ، جیسی بھی ہو قبول کر لیتے ہیں ، لیکن بعض غور و فکر کرنے والے ہوتے ہیں ، انھیں دنیا ایک کہنہ کتاب سی معلوم ہوتی ہے جس کا آغاز و انجام نامعلوم ، مع اول و آخر اس کہنہ کتاب افتاد است وہ اس کی

ہدایت و نہایت کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں اور خود اپنے متعلق پوچھتے ہیں کہ

عیاں نہ شد کہ چرا آدم و کجا بودم

در بلخ و در دک غافل ز کار خویش تنم

فلسفہ کا لفظ یونانی الفاظ سوفیا اور فیلوس سے مشتق ہے جن کے معنی "محبتِ حکمت" کے ہیں۔ سقراط انکار کے ساتھ اپنے آپ کو "فلسفی" کہتا تھا یعنی "طالبِ حکمت" جو انسان کی غرض و غایت وجود اور اس کے فرائض کی تلاش میں جان تک کو عزیز نہ رکھتا تھا۔ ارسطو کے نزدیک انسانی عقلِ حکمتِ الہی کا ایک جزو ہے، خدا کا علم کلی ہے ہماری عقل کا یہ پیدا ہونے کا حق ہے کہ یہ بھی کلی علم کی تلاش کرے، لیکن فلاطون و ارسطو دونوں اپنے آپ کو "طالبِ حکمت" کہتے تھے، اور فلسفہ کے اس لفظی معنی کے لحاظ سے ہر عاشقِ حکمت فلسفی کہلایا جاسکتا ہے

شعر اور فلسفہ

شعر اور فلسفہ کے مقابلہ سے فلسفہ کے نئے معانی پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اکابرِ شعراء میں سے بعض زندگی کو محض بیان کرنے پر قانع نظر آتے ہیں لیکن بعض اس کی توجیہ و تفسیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ہدایت و نہایت، غرض و غایت نوعیت و ماہیت کی تشریح کرتے ہیں، یہی فلسفی شعراء ہیں۔ روما کا مشہور شاعر لکری شیسس فلسفی تھا، اسیکیورس نے فلسفہ کو اپنے شعر میں ادا کیا، اللہ کا انکار، حیات بعد الموت کا انکار، طمانیت خاطر اور مسرت "ماہیتِ فطرت" دالی شہرہ آفاق نظم کے ہر شعر سے ظاہر ہے۔ خیام فلسفی شاعر ہے، اسرارِ ازل، مائت کائنات، غایت وجود، رازِ مسرت کے متعلق اس کے خیالات گو عقل کے نہیں تاہم تجسس کے لئے نہایت خوشگوار ہیں

اسرارِ ازل ماند تو دانی من من این حرف منما نہ تو خوانی و نہ من

ہست از پس پردہ گفتگو من تو چون پردہ برافتد تو مانی و نہ من

در چرخ با نواع سخنها گفتند این بے خبراں گوہر دانش گفتند

واقع چون گشتند با سر از ملک اول ..... زدند و آخر گفتند

خیام اگر بادہ پرستی خوش باش بالا رخ اگر شری خوش باش

چوں عاقبت نگاہ جہاں نیستی است انگار کہ نیستی چو ہستی خوشد باش

آئیے بر حریں فلسفی شاعر ہے۔ وہ اپنی *Divine Comedy* میں اس کائنات کی خصل و صورت سے انسان کی جمایت و غایت سے، شر کی ابتدا اور اس کے علاج سے واقف کرتا ہے۔ "فردوس" (*Paradise*) کے



نابینا اشعار میں ہم پڑھتے ہیں کہ قلب کائنات سے حُب الہی کی مستنیر شمع پیدا ہوتی ہے جس کا مقصد انسان کو معصیتوں سے پاک کرنا ہوتا۔ جرمنی کا زبردست شاعر گیتے بھی مفکر اور فلسفی ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع بھی نجات انسانیت ہے، لیکن اس کے نزدیک یہ زہد و تقویٰ سے نہیں تجربہ سے حاصل ہوتی ہے۔ درڈ سورتھ کو "اس ناقابل فہم عالم کے بارگرا" نے عاجز کر رکھا تھا اور براؤننگ "نباض قلب" خدا، صداقت و محبت سے ہمیں تشفی بخشتا ہے:-

ان فلسفی شعرا کی حیرت ناک دلکشی اس امر کا اکتشاف کرتی ہے کہ انسان کے سینہ میں "اسرار ازل" کو دریافت کرنے اور اس "صرف ہمہ" کو بڑھنے کی کتنی زبردست خواہش موجود ہے اور ہم ان شعرا کے کلام سے کس قدر تسلی و آرام حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ شاعری جو ویسٹ ازیپیٹری، کہ اٹھتے ہیں۔ ایچی کس، سوفو کلیس یوری بدیس سب کے سب پیغام بر، معلم اخلاق و مفکر تھے اور اپنی قوم کو انھوں نے اپنے پیغامات سے جگادیا۔ زمانہ حال میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈرامہ کس قدر فلسفیانہ بنے جا رہے ہیں۔ ڈرامہ نویس حیات کے عمیق مسائل سے الجھ کر انھیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اب سن اس نے ڈرامہ کا منہ ہے۔ جہاں بجائے شاعر و صناع کے مفکر و معلم کام کرتا ہے۔ اب سن قدامت کے ازکار رفتہ و مضر روایات سے نجات پانا چاہتا ہے اور اس کے ڈرامہ کے پھٹنے والوں یا دیکھنے والوں میں جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ اس قدر جالیاتی نہیں ہوتے جس قدر کہ تفکری۔ برنارڈشا کے ڈراموں میں جالیاتی عنصر صرف نام ہی کو رہ گیا ہے اور سوائے وعظ و تفسلف کے کچھ نہیں۔ اب سن و شا، گالس ورنی اور روسی اسکول کے مصنفین کی تصانیف میں جو حیرت ناک دلچسپی لی جا رہی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنے شکوک کو رفع کرنے، زندگی کے اسرار کو جاننے کے کس قدر خواہاں ہوتے ہیں، بقول ایک فلسفی کے ہم ابعد الطبیعیاتی حیوان ہیں، ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کشمکش حیات کے باطنی اصول کیا ہیں یہ تنازع ہمیں کس جانب لے جا رہا ہے، کیا انتخاب فطرت کو رہا ہے یا کوئی "ست غیب" اس کے تحت رہنمائی کر رہا ہے۔ بہر حال شاعری کا یہ فلسفیانہ رجحان اس امر کا بین ثبوت ہے کہ فلسفے اور اس کے مسائل میں، جو زندگی کے مسائل ہیں، ہمیں اب بھی گہری دلچسپی ہے اور روز بروز افراد ہوتی جا رہی ہے

### فلسفہ اور سائنس

کہا جاتا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے درمیان ہمیشہ جنگ رہی ہے، ہم موجودہ نقطہ نظر سے ان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالیں گے، اختصار ہمارے پیش نظر ہوگا۔ فلسفہ اور سائنس میں نہایت قریبی تعلق ہے، دونوں کا مبدا و مادی وہی ایک ہے، "حُب علم" ان کی ابتدا اور "علم حقیقت" ان کا منتہا ہے۔ اب خیال صحیح نہ رہا کہ فلسفیانہ نظامات بنیادی علوم کی احتیاج کے تشکیل پاسکتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کا تعلق اس قدر قریبی ہے کہ فلسفہ کا طالب علوم مخصوص خصوصاً ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور نفسیات کے کسی قدر علم کو لا بدی سمجھتا ہے۔ لیکن ان علوم کا دائرہ ہر

روڈ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور ان تمام پر عبور حاصل کرنا کسی کے لئے آسان نہیں اسی لئے فی زمانہ فلسفہ اپنی توجہ زیادہ تر تقویات کلیہ کی ناقدانہ تحلیل اور قیمتوں اور معانی کے مطالعہ پر مبذول کر رہا ہے۔ تاہم تکنیکل فلسفی تو وہی ہو گا جو تمام علوم مخصوصہ پر مہارت رکھتا ہو

سائنس (یا حکمت) لاطینی لفظ ہے "جو علم" کے ہم معنی ہے، حکیمانہ علم "یقین، صحیح، اور پوری طرح مربوط و منضبط ہوتا ہے" فلسفہ بھی دنیا کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہذا فلسفہ اور سائنس دونوں کا ایک ہی مقصد ہو گا۔ لیکن ان دونوں میں فرق ضرور ہے اور بعض دفعہ اس فرق کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ سائنس کا کام واقعات کا "بیان" (Description) اور فلسفہ کا کام ان کی "توجیہ و تعبیر" (Interpretation) ہے مگر سائنس نے یہ میرٹن اور دوسرے علمائے سائنس کا نتیجہ کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ

"سائنس واقعات تجربہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے"

مظاہر عالم کے ایک مجموعہ کا عالم سائنس کا مطالعہ کرتا ہے، وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل کرتا ہے، پھر ان کا اصطفا کرتا ہے، پھر ان شرائط یا دلائل کا مطالعہ کرتا ہے جن کی تحت یہ وقوع پذیر ہوئے ہیں، ان کی یکسانیت عمل کا تعین کرتا ہے۔ یعنی ان کے قوانین کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہاں پر اس کا کام بحیثیت عالم سائنس کے ختم ہو جاتا ہے یعنی اس نے واقعات تجربہ کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا۔ ان کے طرز وقوع و طریقہ عمل کو سمجھا دیا

اب فلسفہ بھی سائنس کی طرح اسی علم کا استلاشی ہے جو یقین صحیح اور مربوط و منضبط ہو، لیکن وہ محض اسی علم پر قانع نہیں، وہ اس علم کا جو یا ہے جو جامع ہو مظاہر کے غیر متبدل قوانین یا قوانین کا تعین ذہن انسانی کو پوری طرح نشانی نہیں کر سکتا وہ اشیاء یا واقعات کی انتہائی توجیہ و تعبیر کا خواہاں ہوتا ہے۔ یعنی وہ ان کی علت اولی، ان کی بنیاد و غایت، ان کے معنی یا قدر و قیمت کا جو یا ہوتا ہے۔ سائنس محض واقعات کے وقوع کے شرائط کا بیان پیش کرتی ہے۔ لیکن فلسفہ ان کی انتہائی توجیہ یا تشریح کرنا چاہتا ہے، زمانہ حال کے ایک زندہ سائنسک فلسفی نے اسی چیز کو اچھی طرح ادا کیا ہے :- "فلسفہ مختلف علوم و سائنس کے نتائج کو لیتا ہے اور ان کے ساتھ انسان کے مذہبی و اخلاقی تجربات کے نتائج کو ملاتا ہے اور پھر ان پر بحیثیت مجموعی غور و فکر کرتا ہے۔ امید یہ ہوتی ہے کہ ہم اس طریقہ سے کائنات کی کنہ و ماہیت، ہماری حیثیت و منزلت کے متعلق بعض عام نتائج حاصل کر سکیں،

اس میں شک نہیں کہ فلسفہ کے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی خواہش پر اس کے عالم گیر وسعت ہی کی بنا پر علماء و سائنس کی جانب سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں کہ یہ کام خداؤں کا ہے، ضعیف البیان انسان اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کا تفصیلی جواب ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہتا ضروری ہے

کہ ”دل“ کو سمجھنے کی کوشش بذات خود مورد اعتراض نہیں بن سکتی، کیونکہ انسان کو اس سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور انسانی دلچسپی کا ہر موضوع حکیمانہ تحقیقات کا موضوع بن سکتا ہے بشرطیکہ حکیمانہ طریقے استعمال کئے جائیں۔ اعتراض تو اسی وقت وارد ہو سکتا ہے جب غلط طریقے استعمال کئے جائیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل میں منطقی طریقوں کا استعمال فلسفہ کے مطالعہ کے وقت نہیں کیا گیا۔ لیکن ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ خود سائنس کے مطالعہ میں ہی منطقی طریقوں کا استعمال گزشتہ زمانوں میں نہیں کیا گیا، فلکا ہما سوا

بہر حال طریقوں کی بحث چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ کے دو جداگانہ مقاصد ہیں اور دونوں سائنس کے عمل سے مختلف ہیں اور دونوں فکر انسانی کی جائز ضروریات ہیں۔ اولاً دنیا میں حیثیت کل پر اور خصوصاً اس کے معنی، مقصد یا غاۃ اور قدر و قیمت پر۔ ثانیاً ان تصورات کلی کا ناقدانہ امتحان جو سائنس اور فہم عام کے استعمال میں آتے ہیں۔ پہلے کو فلسفہ نظری کہا گیا ہے اور دوسرے کو فلسفہ انتقادی

مقصد اول کے متعلق ہمیں یہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ ذہن انسانی کی یہ عمیق ترین خواہش ہے کہ دنیا و زندگی کے متعلق وہ نقطہ نظر حاصل کیا جائے جو فلسفہ کے لئے مخصوص ہے، ہمیں دنیا کا محض ایک کمی نقطہ نظر یا محض اس کے ریاضیاتی علائق ہی کا علم درکار نہیں بلکہ اس کی دہائیت یا کیفی و باطنی خصوصیت (اسرارِ ازل) کا علم مطلوب ہے اس زمانہ میں سائنس کے دائرہ میں جتنی بھی ریسرچ ہو رہی ہے۔ ان سب میں کمی علائق پر زور دیا جا رہا ہے، سب کیفیت کے جواب سے قاصر ہیں، کمیت کی ناپ تول، تحقیق تدقیق جاری ہے۔ حکیمانہ نقطہ نظر سے سائنس کی یہ تجدید کوئی نقص نہیں کہ وہ کیفیت، معنی و قیمت کے سوال کو اپنے دائرہ بحث سے خارج سمجھتی ہے، لیکن اس کا تکرار فلسفہ سے کیا جاتا چاہئے۔ ممکن ہے کہ دنیا میں نہ مقصد ہو نہ غایت، اور نہ اس کی قدر و قیمت ہی کچھ ہو لیکن اس نتیجہ تک بھی ہم فکر و نظر کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش ہی کے بعد پہنچ سکتے ہیں اور اسی غور و فکر کا نام فلسفہ ہے

مقصد دوم (تصورات کی ناقدانہ تحلیل) کے متعلق ہم یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ سائنس اور فہم عام کے بعض ایسے کلی تصورات ہیں جن کی وہ پوری طرح جانچ پڑتال نہیں کرتے بلکہ محض عملی تعریف کرنے کے بعد اپنے عملی مقاصد کے حصول کے لئے ان کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے تصورات کی مثال مکان و زمان، کیفیت و کمیت، علیت و قانون، خیر و شر وغیرہ سے دی جاسکتی ہے۔ اب فلسفہ کا یہ مخصوص کام ہے کہ ان تصورات کلیہ کا پوری طرح امتحان کرے، ان کی ناقدانہ تحلیل کرے، اور ان کے معانی و روابط کو بالاستیاب سمجھنے کی کوشش کرے۔ برٹرنڈ رسل وغیرہ نے اسی کام کو فلسفہ کا واحد وظیفہ قرار دیا ہے۔ ان دونوں یہ نہایت منگنکل چیز ہو گئی ہے اور ہم سر دست اس میں داخل ہونا نہیں چاہتے

فلسفہ اور مذہب — ہم فلسفہ اور مذہب کے یا ہی تعلق پر اس لئے غور کر رہے ہیں کہ فلسفہ کی اہمیت

اور اس کی افادیت اور زیادہ واضح اور اجاگر ہو جائے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب میں برہے، واقعہ اس کے خلاف ہے، مندرجہ ذیل مختصر واقعات سے آپ خود اس کا اندازہ کر سکیں گے

فلسفہ اور سائنس میں جس قسم کا تعلق بتلایا گیا اس سے فلسفہ اور مذہب کا تعلق جدا لگتا ہے۔ فلسفہ کائنات، من حیث کل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ دنیا کے متعلق سائنس سے زیادہ جامع، کامل اور وحدت بخش علم حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن مذہب کو اس سے بھی زیادہ کامل وحدت کی تلاش ہے، فلسفہ ایک ایسے تصور کی تلاش کرتا ہے جو ہماری مضطرب عقل کو دنیا کے معنی سمجھا دے۔ لیکن مذہب فرد و عالم کے حقیقی وحدت و وقاف کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، مذہب میں ہماری کوشش مجرد عالم سے ایک ہو جانے کی ہوتی ہے، ہم اس میں محو ہو جانا چاہتے ہیں اور اس طریقہ سے اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں

کہا گیا ہے کہ مذہب کا کام انسان کو دنیا میں طمانیت نفس و جمیبت خاطر بخشتا ہے، لیکن سائنس اور فلسفہ ہی ہمارے علم میں پنہائے عالم، پیدا کرنے اور لذت و قوت بخشنے کی وجہ سے قلب میں ایک خاص قسم کی طمانیت پیدا کرتے ہیں۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب یہ تینوں دنیا کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی غایت مشترکہ قرار دی جاسکتی ہے، لیکن اس علم سے ان کی غرض جدا جدا ہے۔ سائنس کی غرض علم کو علم ہی کی خاطر حاصل کرنا ہوتی ہے لیکن زیادہ تر علم کو عملی و معاشی اغراض کی تحت رکھتی ہے۔ فلسفہ کی غرض محبت علم اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی طمانیت و لذت دہنی ہے۔ مذہب کائنات کو اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کہ روح انسان کو جمیبت، چین اور نجات حاصل ہو۔ بعض وقت فلسفہ اور مذہب ان ہی تصورات سے بحث کرتے ہیں مثلاً روح، اس کی ہدایت و غایت، خدا اور تخلیق لیکن بال بھی ان دونوں کے اغراض جدا جدا ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں یہ نظری اور عقلی ہیں اور ثانی الذکر میں یہ جذبی شخصی !

فلسفہ انفرادی ذہن کی پیداوار ہے، صمنیات یا مذہب مجموعی ذہن کی۔ فلسفہ کسی فلسفی کی ذہنی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے، بغیر فلسفی کے فلسفہ ناممکن، اسی وجہ سے ہم ہر فلسفہ کو کسی فلسفی کے نام سے موسوم کرتے ہیں مثلاً فلاطونی فلسفہ، اور ارسطاطالیسی فلسفہ، وغیرہ اس کے برخلاف صمنیات یا مذہب احادیث الطوائف و Folk Law، زبان کی طرح کسی فرد کے عمل شعوری کا نتیجہ نہیں بلکہ پوری قوم کا آفریدہ۔ جس طرح زبان کا کوئی موجد نہیں اسی طرح صمنیات و مذہب ہی عقائد کا کوئی موجد نہیں، ان کی ابتدا زمان و شاعری سے جاملتی ہے۔ کیا ان دنوں کوئی مصری یونانی مذہب کے بانیوں کا ذکر کرتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ عیسائی و اسلامی مذہب کے بانی ضرور گزریں (صلوٰۃ اللہ علیہم) لیکن غالباً انھوں نے کسی ایسے نئے تصورات کی تخلیق نہیں کی جو پہلے معلوم نہ تھے، انھوں نے مزوجہ خیالات میں اصلاح کی جس کا مقصد نظری سے زیادہ عملی تھا

فلسفہ نظر و فکر کرنے والے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے ہر فرد اس میں "فکر" کی وجہ سے حصہ لیتا ہے، لیکن مذہب پر وہ "ایمان" رکھتا ہے، یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے، کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں

لیکن آخر مذہب کیا ہے؟ اگر اس کی تعریف ناممکن ہے تو کسی قدر معنی کا تعین تو ضرور ہو سکے گا۔ مذہب پر رجب آپ غور کرتے ہیں تو شاید اختلاف کی وجہ سے مسجد و حرم، دیر و کلیسا، مصلیٰ و ناقوس، تسبیح و زاہد خیال میں آتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ضروری طور پر مذہب تو نہیں۔ اب مذاہب عالم پر نظر غائر ڈالیں، ان کے اجزائے خضر و پرغور کریں تو ہم مذہب کی کسی تعریف تک پہنچ سکیں گے شاید وہ کچھ اس قسم کی ہو: "مذہب غیب کی اُن قوتوں پر استوار کرنے کے احساس کا نام ہے جن کی قدرت میں ہماری قسمت کی باگ ہے، ساتھ ساتھ ان قوتوں غیبی سے صادقانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے" یا "مذہب ایک غیر مری روحانی نظام سے ہمارے عملی تعلق کا شعور ہے"

"مذہب ہمارے باطن کے اعلیٰ ترین جوہر کے ساتھ وفا شعار کی احساس ہے" ایمرسن نے خوب کہا ہے کہ "میں، ناقص میں، اپنے کامل نفس کی پرستش کرتا ہوں" ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی بنیاد اعلیٰ قیمتوں کے عین جلی احساس پر ہوتی ہے۔ ہماری ذات میں جو النیت کا جو ہر کنون و مستتر ہے وہ اُس جو ہر الہی کی طرف بڑھتا ہے جو ہم سے ماوراء سارے عالم پر محیط ہے، جس کا سارا عالم خارجی اظہار ہے۔ یا مذہب ان ہی اعلیٰ و انتہائی قیمتوں کی طرف اس خاک و باد کی دنیا اور اس کے آرام و لذت سے بلند ہو کر دیکھنا اور ان کی طرف باطنی ہمدردی اور شناخت کی وجہ سے پہنچ جانا ہے۔ اسی بنا پر و نٹ نے کہا ہے کہ "ہم ان احساسات یا تصورات کو مذہبی کہیں گے جو ایک نصب العین وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں" اسی وجہ سے مذہب کے اسرار، علامت، و اشخاص پاک و مقدس سمجھے جاتے ہیں، یہ بزرگ قیمتیں ہیں، دنیا کی معمولی وادنیٰ چیزوں سے ماوراء ہیں، اور اسی لئے مذہبی پہلو وفا شعار کی، تحریم، تواضع و زہد کا ہوتا ہے

مذہب کی اس تعریف کے لحاظ سے روح، روحانی یا روحانیت کے الفاظ میں کسی قسم کا سر و غموض نہیں پایا جاتا یہ ان چیزوں کے طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی اعلیٰ قیمتیں ہوتی ہیں، چنانچہ جارج سنڈلانا کہتا ہے کہ روحانی ہونے سے مراد "نصب العین کے حضور میں زندگی بسر کرنا ہے" ڈریک نے اپنی کتاب "مسائل فلسفہ" میں روحانیت کے معنی اور مذہب سے اس کے تعلق کو بڑی اچھی طرح ظاہر کیا ہے

"قلب و ارادہ کا وہ میلان جس کی وجہ سے انسان اعلیٰ چیزوں کی پروا کرتا اور رفیق و ملائمت و طہانیت باطنی کے ساتھ زندگی بسر کرتا اور حیات کے سطحی واقعات سے متاثر نہیں ہوتا اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے روحانیت کہلاتا ہے، اور جب یہ خارجی صورتوں اور اداروں میں رونا ہوتا ہے اور تمام جماعتوں میں پھیل جاتا ہے تو ہم اس کو مذہب

یہ اکثر دریافت کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ تعلیم کا مذہب پر کیا اثر پڑتا ہے ؟ ہمارے خیال میں یہ اثر نہایت مفید ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتداً فلسفہ کا مطالعہ ہمارے بعض مذہبی عقائد و خیالات میں کسی قدر خلل پیدا کرے خصوصاً جب ہمارے یہ عقائد بالکل کوتاہ ، ناقابلِ مصالحت یا شدیداً محققہ..... ہوں۔ لیکن اگر یہ وسیع کشادہ اور سادہ ہوں تو فلسفہ ان کی تائید کرتا اور انہیں تقویت بخشتا ہے۔ لیکن لے لکھا ہے کہ ”یہ صحیح ہے کہ تھوڑا سا فلسفہ انسان کے ذہن کو الحساد کی جانب مائل کرتا ہے۔ لیکن فلسفہ میں تعمق انسان کے ذہن کو مذہب کی طرف رجوع کر دیتا ہے“ دراصل فلسفہ کا یہ کام ہے کہ وہ ہمارے اساسی مذہبی اذعانات کو عقل کی ”بنیادِ مخصوص“ پر مستحکم طور پر قائم کر دے تاکہ جبلی تنقیات ”و دین الحما“ اور دین والحاد کے طوفان میں غرق نہ ہو جائیں۔ بعض دفعہ ہمارے ان جبلی احساسات مذہبی میں ارتعاش ہوتا ہے اور ہمیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ”بخس“ سائنس ہمارے ان اذعانات کو برباد کر دے۔ فلسفہ ہمیں بہادر کی جوئی پر لے جاتا ہے اور ہم وہاں سے خشک و ریب کی وادی پر نظر ڈالتے ہیں، علم سے ہمیں قوت حاصل ہوتی، خوف و رخ

ہوتا ہے، جس چیز کو ہم نے بدترین سمجھا تھا، وہ اپنے پورے خدوخال، پورے تناسب میں کچھ بری نہیں معلوم ہوتی، پھر ہمیں جو طمانیت و سکون حاصل ہوتا ہے وہ ابدی ہوتا ہے

### فلسفہ کے امکان کا سوال

فلسفہ کو شاعری، سائنس اور مذہب کے تقابل سے آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ دیکھا: "فلسفیانہ مسئلہ" یا موضوع کو مشکل کیجئے تو اس کی وسعت سے آپ کو ایک قسم کا خوف یا تحیر ہوگا۔ حقیقت کی کنہ یا ماہیت، کائنات کے معانی و مقصود، اس کی بیدایت و فائت، حیات کی قدر و قیمت یہ ایسے عظیم الشان سوالات ہیں کہ ان کا بلاستیا مطالعہ کرنا۔ کسی قسم کا اس پیش کرنا بڑی ہمت کا کام ہے! عالم سائنس جو دنیا کے ایک گوشہ کو دیکھتا اور اس کو پوری طرح سمجھنے میں اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دیتا ہے وہ فلسفی کے دائرہ بحث کے توسع و کشادگی کو دیکھ کر اٹھتا ہے کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہے انسان کا نہیں کیونکہ

من می نگرم ز مبتدئی تا استاد

(خیام)

عجز مست بدست ہر کہ از ادر زاد

لیکن خود یہ عالم سائنس جانتا ہے کہ اس کا دائرہ بحث کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو دوسرے علوم کے دائرے کچھ اس طرح مہلوط ہے کہ خواہی تو راہی اس جز کے کامل علم کے لئے "کل" کا مطالعہ ضروری ہے اور اس طرح وہ مجبوراً فلسفہ ہی کے دائرہ میں قدم زن ہوتا ہے یا کم از کم فلسفی پر اعتراض کرنا ترک کر دیتا ہے تاہم مفکرین کے بعض گروہ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے فلسفیانہ مسائل کی دست سے گھبرا کر اس کے مطالعہ ہی سے انکار کر دیا ہے، ان میں سے ہم مدد کا اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔ ان میں سے ایک ایجاہیت اور دوسری اریتاہیت ہے

### ایجاہیت :-

فرانس کے فلسفی اگست کامت (۱۸۰۶ء تا ۱۸۵۸ء) نے دنیا کے متعلق اپنے نقطہ خیال کا نام ایجاہیت رکھا ہے، گو حقیقت میں یہ خود فلسفی ہے جو فکر کی مستقل اور غیر معمولی کوشش کے بعد دنیا کے متعلق ایک خاص نقطہ نظر تک پہنچا ہے لیکن وہ فلسفہ کے نام سے بیزار ہے۔ اس کا یقین تھا کہ علت العلل یا علت اولی، آخری یا انتہائی حقیقت اور اس قسم کی ساری چیزوں کی تلاش محض فضول ہے۔ انسان کے ذہن کی رسائی ان حقایق تک نہیں ہو سکتی، وہ تجربہ کے واقعات یا مظاہر اور ان کی کیسانیت عمل یا قوانین ہی تک محدود رہتا ہے۔ ظواہر کے پس پردہ کیا ہے اور اشیاء کماہی کی حقیقت و ماہیت کیا ہے یہ سب مابعد الطبیعیاتی تخمیرات ہیں۔ ان سے احتراز ہی مفید ہے، فلسفہ کا کام ظواہر کے باہمی تعلقات اور ان کے غیر متبدل طریق رفتار کا دریافت کرنا ہے نہ کہ تجربہ کی تصورات کے گورکھ منڈن

میں ابھنا !

کامٹ کی ساری دیکھنی عمر انیات سے تھی وہ اپنے کو اس علم کا موجد سمجھتا تھا۔ اس کا نصب العین سوسائٹی کی اصلاح تھی، اس نصب العین کا تحقق معاشرت کے قوانین کے علم ہی سے ہو سکتا ہے لہذا کامٹ معاشرت کا سائنٹفک طریقوں سے مطالعہ کرنا چاہتا تھا اور اسی کو وہ "فلسفہ جدید قرار دیتا تھا۔ اس نے ایجابیت کا مطلب صرف اتنا ہوا کہ سائنس فکر انسانی کی آخری منزل ہے، اور سائنس کا مقصد وحید واقعات تجربہ کے باہمی مستقل علایق اور ان کے قوانین دریافت کرنا ہے، اور یہ مشاہدہ اور تجربہ ہی سے ممکن ہے، سائنس ان چیزوں سے بحث کرتی ہے جو یقین دہندہ اور قطعی ہوتے ہیں اور خصوصاً جو ہمارے معاشری اداروں کی تکمیل کے لئے مفید ہوتے ہیں، یہ علم ایجابی ہے، اسی کی تدوین ایجابیت کا کام ہے

سائنس کی قدر و قیمت کے متعلق ہر شخص کامٹ کے ساتھ اتفاق ہوگا اور نہ ہر کسی کو علم معاشرہ کی اہمیت کے متعلق اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن کیا ہم اس کے اس خیال کے ساتھ اتفاق کر سکتے ہیں کہ فلسفہ کے وسیع مسائل کا مطالعہ فضول ہے اور باعد لطبیعیات پر وقت صرف کرنا رائیگاں؟ اس کی تحقیق آگے آتی ہے

ارتیابیت

دوسرا گروہ جو ہمیں فلسفہ کی منزل مقصود کی طرف قدم اٹھانے سے باز رکھتا ہے وہ ارتیابیت کا ہے، خیام کی زبان میں کچھ اس طرح ہم اس مسلک کو ادا کر سکتے ہیں

دورے کہ درد آمدن و رفتن ماست اورانہ نہایت و بدایت پیداست  
کس می نوند دے دریں معنی راست کیں آمدن ز کجا و رفتن ز کجاست

ارتیابیت کا ظہور پہلے یونان میں موفسطائے کے دور میں ہوا۔ "خورجیاس کی تعلیم سفسٹ" کا نمونہ ہے۔ "کسی شئی کا وجود نہیں اگر وجود ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں، اگر اس کا علم بھی ہے تو یہ دوسروں تک نہیں پہونچایا جاسکتا" ہستی کا انکار، علم کا انکار، اس سے زیادہ انکار۔ ارتیابیت کیا ہو سکتا ہے؟ چند دن بعد یونانی روحی دور میں ارتیابیت فلسفہ کا ایک مستقل "اسکول" بن گئی جس کا بانی "پروٹو" تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ گوان مفکرین نے سقراط، افلاطون، ارسطو، دیمقراطیس جیسے جلیل القدر فلسفیوں کے بعد جنم لیا، اور گواہل یونان نے اب تک باعد لطبیعیات اخلاقیات، منطق، ریاضیات میں شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ تاہم انہوں نے "پردہ غفل" تک پہونچنے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک فلسفہ ادعا ہی تھا، ذہن انسانی نے ملکہ علم کی تنقید کے بغیر مان لیا تھا کہ حقیقت کا علم ممکن ہے۔ لہذا یہ اکابر فلاسفہ کے مختلف و متضاد خیالات و نظریات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے اور کہتے کہ عقدہ کائنات لایحل ہے، صداقت کلی ناقابل حصول۔ ہاں



انسان (فرد) ہر چیز کا معیار ہے۔ ”جتنے آدمی اتنے ذہن“ ہماری دلوں میں کیسائیت ممکن نہیں، لہذا علم کلی کا امکان نکل نہیں۔ فرد علم کے معاملہ میں اپنا قانون آپ ہے، اس نظری ارتیابیت سے اطلاقی ارتیابیت بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ جب لم ہی کا امکان نہیں تو صواب و خطا کا علم کہاں، کلی طور پر صواب و خطا کا وجود نہیں، جو چیز تمہارے لئے اچھی ہو ضروری میں کہ وہ میرے لئے بھی اچھی ہو۔ ضمیر شخصی معاملہ ہے۔ یہی حال جمال کا ہے، اس میں بھی کوئی مشترک معیار نہیں۔ کیا تھیں اس حبشی کا قصہ یاد نہیں جو اپنے بادشاہ کے اس حکم کی پیروی میں کہ سب سے زیادہ حسین بچے کے گلے میں موتیوں کا ہار پٹایا جائے بہت سی تلاش کے بعد اپنے ہی بچے کے گلے میں پٹنایا اور عرض کیا کہ جہاں پٹا میری نگاہ میں اس حبشی زادے سے زیادہ خوبصورت آپ کی ساری وسیع مملکت میں کوئی بچہ نہیں!

سائنس کا آغاز (۱) — زمانہ جدید میں یونان کی سی ارتیابیت بالکل مفقود ہے۔ ارتیابیت کا سب سے آہنی حامی اڈونرا کا مشہور عالم مفکر، ہیوم تھا۔ لیکن اس کی ارتیابیت ایسی تباہ کن اور انتہائی نہ تھی جیسی کہ یونانی ارتیابیت بلکہ حدود علم کی ایک ناقہ اندہ تحقیق و تدقیق تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے علم کا مبداء تجربہ ہے، اس کی انتہا عالم مظاہر اور ایک قسم کی ”لا اورتیت“ کہ علل انتہائی، روح، ایغوا وغیرہ کی حقیقت کے متعلق ہیں کوئی علم نہیں

موجودہ زمانہ کی اسپرٹ تو یہ ہے کہ ہر جدید مسئلہ کا امیدور جا کے ساتھ یہیم طور پر مقابلہ کیا جائے، فلسفیوں کا باہمی اختلاف ممکن، علم انسانی کی غلطی ممکن، ہمارے حواس کا التباس ممکن، لیکن ہم یہ ضرور دریافت کر کے رہیں گے کہ کونسا فلسفی صحیح ہے، حواس کا دھوکہ کس طرح دور کیا جاسکتا ہے، علم کی غلطی کیسے رفع ہو سکتی ہے۔ زمانہ جدیدہ کی روح جرات و جوش سے ملو ہے، قطب جنوبی کی دریافت کا بیڑا اٹھایا، تلاش میں جانیں لگیں۔ لیکن باوجود ہر طرح کے آفات و مصائب کے اس کو دریافت کر ہی لیا۔ مونٹ ایورسٹ کی چوٹیاں اپنی زیر قدم نہیں آئی ہیں۔ لیکن اہل ہمت اس کی طرف بڑھے جا رہے ہیں۔ ایک نہ ایک روز یہ زیر قدم آریں گی۔ یونیورسٹی کی شرکت کے وقت طلباء ان مضامین کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جن میں مسائل زیادہ دریافت طلب ہوں۔ موجودہ فکر و فلسفہ میں شک ضرور پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہمیں لوری دے کر بستر راحت پر نہیں سلا رہا ہے بلکہ اقبال کی زبان میں کہہ رہا ہے

ضمیر کن نکال غیر اد تو کس نیست نشان بے نشان غیر اد تو کس نیست

قدم بیباک تر نہ در رہ زیست بہ پٹائے جہاں غیر اد تو کس نیست

براؤنگ کتا ہے کہ ”شک کی میں قدر کرتا ہوں، حیوانات میں یہ نہیں پایا جاتا، ان کی محدود مٹی میں اس شعاع مستنیر کی تابناکیاں کہاں؟“ ”برٹنڈرسل اس رہا گن و آدادی بخش“ ”شک“ کا ذکر کرتا ہے جو ادعائیت کو بہت کرنا اور ہمیں راہ عمل میں جبری بناتا ہے۔ وہ کتا ہے کہ ”فلسفہ ان لوگوں کی منفرہ اندادعائیت کو دور کرتا ہے جو امدادی بخش شک کے دائرہ میں قدم دن ہوتے ہیں، یہ مالوس اشیا کو غیر انوسیت کے جامہ میں پیش کر کے ہمارے احساس خیر

کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے۔ ان جبری روحوں کو ان بزدلوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہو سکتی جو محض اس خیال سے کہ چونکہ فلسفیانہ سوالات کے جواب نہیں دئے جاسکتے لہذا ان کو اٹھایا ہی نہ جائے اور نہ ان کے حل کی کوشش کی جائے فلسفہ کی راہ میں طالب علم کو شک بلکہ دہشت ہوتی ہے ضرور، لیکن شک کا پیدا کرنا، صداقت کی تلاش میں آفادہ دہر گراں ہونا اور اس کے حصول کی امید رکھنا۔۔۔۔۔۔ یہ روح انسانی کا عظیم الشان کارنامہ ہے !

ان دونوں اہم و حقیقت کی بجائے ”لا ادریت“ کا زیادہ ذکر سنتے ہیں۔ اس لفظ کو سب سے پہلے ہکسلی نے روار دیا لیکن یہ ہر برٹ اسپنسر کے نام سے زیادہ وابستہ ہے اس کے لفظی معنی ہیں ”علم کا نہ ہونا“ لا ادری یعنی میں نہیں جانتا۔ اسپنسر کا یقین تھا کہ علم میں ایک قسم کی اضافیت پائی جاتی ہے، لہذا علم مطلق کا امکان نہیں سارا علم اضافی ہے قانون اضافیت کے معنی یہ ہیں کہ کسی شے کا علم دوسرے خارجی اشیاء کے امتیاز سے حاصل ہوتا ہے جو اس کی تجدید کر رہے ہیں، نیز یہ شے ذہن کی اضافت ہی سے معلوم ہو سکتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں مظاہری، محدود، اضافی اور مشروط موجودات کا علم ہوگا، لا محدود اور مطلق یا غیر مشروط ہمارے دائرہ علم سے دور اور غیر معلوم و ناقابل علم ہوگا۔ چنانچہ اسپنسر کے نزدیک ہمارا علم مادہ حرکت قوت اور شعور وغیرہ جیسے واقعات کے دائرہ میں نہیں پہنچ سکتا اور یہ تمام ایک ”ناقابل علم ہستی مطلق“ کے بخون و احوال ہیں

قانون اضافیت پر تھوڑی دیر کے لئے غور کرتے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون خود ذات مطلق کے تصور کو ضروری سمجھتا ہے، یعنی اضافی کے تصور میں مطلق کا تصور استلزامی طور پر موجود ہوتا ہے اور خود ہر برٹ اسپنسر نے اس کو تسلیم کر لیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ اگر دنیا محض تصور ہے تو یہ ضرور کسی ہستی کا تصور ہوگی، ظہور خود حصر اضافی ہے جو کسی مطلق ہستی کے وجود کو مستلزم ہے، اسپنسر کا کتنا صریح یہ تھا کہ مطلق کے وجود کے سوا ہمیں اس کے متعلق کسی شے کا علم نہیں، لیکن اسپنسر کی اس غلطی کو ہیگل نے پہلے ہی رفع کر دیا تھا۔ چونکہ تمام محدود اشیاء و اذہان مطلق کے تصور میں لندادہ ان ہی میں اور ان ہی کے ذریعہ قابل علم ہے، اس میں شک نہیں کہ مطلق کی ماہیت ہمارے محدود ذہن میں پوری طرح نہیں آسکتی لیکن ہمیں اس کو ایک حد تک ضرور جبری طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اس کے کچھ صفات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ لہذا لادادہ کا یہ دعویٰ کہ جس قسم کے علم کی فلسفہ کو تلاش ہے وہ ناقابل حصول ہے، شک سے بڑھ کر ادعائیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے، لہذا یہ سائنس اور فلسفہ ہردو کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو ان شک اور دائمی تلاش کا نام ہے، فلسفی ”عاشق حکمت“ ”آڈا جیو“ ہی کو اپنی غائت سمجھتا ہے اور اقبال کی زبان میں کہتا ہے۔

شادم کہ عاشقان را سوز دوام دادی

درماں نیا فریدی آذر جستجورا

اور ”در قلم ار میدان ننگ است آبجورا“ کہتا ہوا ”رمز کائنات“ کا ہمیشہ ہوا و متلاشی رہتا ہے !

## فلسفیانہ نقطہ نظر کی ضرورت :-

پہلے تو یہ ہے کہ آج سے دو ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے ارسطو نے اس بحث کا تصفیہ کر دیا تھا کہ آیا ہم فلسفہ کا مطالعہ کریں یا نہ کریں، اس نے کہا تھا کہ ”ہم فلسفیانہ غور و فکر کریں یا نہ کریں، ہمیں فلسفیانہ غور و فکر کرنا تو ضرور پڑتا ہے“ ”شوبہ مند“ انسان کی طبیعت کا پتہ لگا کر اسی لئے کہا تھا کہ انسان ”ابعد الطبیعیاتی حیوان ہے“ ”آؤں و اس نے نہایت عقلمندی سے کہا تھا کہ ”ہر شخص خواہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور فرد و کائنات کے رشتہ باہمی کے متعلق کوئی ننکوئی نظریہ ضرور قائم کر لیتا ہے اور اسی پر اس کی ساری زندگی و عمل کا انحصار ہوتا ہے“ اسی خیال کو پالسن نے یوں ادا کیا ہے کہ ہر شخص کا فلسفہ ہوتا ہے۔ عمدہ فطرت میں بسنے والے وحشی کا یہی فلسفہ ہوتا ہے اور یہی اس کے اعمال و کردار کا مرکز ہوتا ہے ! اور اسی معنی کے لحاظ سے چترنجن کہتا ہے کہ ”آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ علمی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطہ نظر ہے“ یعنی اس کا فلسفہ !

آپ نے اوپر دیکھا تھا کہ فلسفی کائنات کی ماہیت و فائت کے متعلق ایک نظریہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عالم سائنس کے کئی علم کی تکمیل کئی علم سے کرنا چاہتا ہے۔ اس کو چند ایسے مفروضات تسلیم کرنا پڑتے ہیں جن کی تصدیق بالکلیہ تجربہ و مشاہدہ و اختیار سے نہیں ہو سکتی۔ جو اس جن چیزوں کی شہادت دیتے ہیں ان کی تکمیل وہ تخیل یا وجدان سے کرتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی مرضی یا ارادہ ہی سے ایسا کرے بلکہ بقول ارسطو خواہی بخواہی اس کو کرنا پڑتا ہے، وہ کامت کی طرح اپنے گواہ بجا بی ”کہہ سکتا ہے اور احتجاج کر سکتا ہے کہ وہ صرف واقعات ہی کی حد تک محدود رہنا چاہتا ہے یا اسپنسر کی طرح وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ”لا ادریہ“ ہے اور اشیا، کہا ہی کے علم سے ناواقف، لیکن وہ ان احتجاجات کے باوجود چند مفروضات کو تسلیم کرتا ہے اور خواہی بخواہی فلسفی ضرور ہے، مہذا شئی عجیب ! برے سے بڑا ”لا ادریہ“ برے سے بڑا شکی، یا رتیبائی، اپنے عقائد و انکارات مخفی نہیں رکھ سکتا، اس کو زندگی کے کارزار میں جانب داری کرنی پڑتی ہے۔ باوجود ایجابیت و لاادریت کی لمن ترانیوں کے، باوجود مادرائی خان سے اس امر کا یقین دلانے کے کہ حقیقت ناقابل علم ہے اس کو زندگی اس طرح بسر کرنی پڑتی ہے گویا کہ اس نے ان خوفناک استبعادات کے ایک نہ ایک پہلو کو قبول کر لیا ہے جن پر فلسفہ مشتمل ہوتا ہے۔ اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا پڑتا ہے کہ آیا یہ زمین جس پر اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے ایک ذی غائت عقل کی صنعت گری کا نتیجہ ہے یا ذرات یا سالمات کی کورانہ کشمکش کا آفریدہ یعنی خدا کے متعلق اس کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہونا چاہئے خواہ یہ خدا کے وجود کے انکار ہی کی خاطر کیوں نہ ہو۔ اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہئے کہ آیا وہ ایک خود رفتار مشین یا کل ہے جو دوسری مشین سے ہم صحبت ہوتا ہے تاکہ چھوٹے مشین پیدا ہوں یا ایک قوت حیات کا ظہور، تخلیقی قوت و اختیار کا حامل یا تو براہ الہی کی گریز یا شاع ! اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا بھی فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آیا عقل کی غیر یقینی قوتیں یا وجدان کی شاہانہ بد اہت حقیقت کی رہنماور

صداقت کا معیار ہے۔ اسی طرح اخلاقی اقدار کے متعلق، اس کو اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہئے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وفادار رہے گا یا اپنی قوت مردانگی کو قیمتی طور پر تقسیم کرے گا۔ اس کو اپنے نزدیک اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آیا مارنے کے بعد اس کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے "خاکی است و خاکش بھی دہند" یا "چودانہ خاک شکافدگی تراست" ایک اعلیٰ وارفع زندگی میں داخل ہوتا ہے!

یہ تمام نہایت اہم مسائل میں اور فلسفہ موت و حیات کا معاملہ ہے اور ان تمام مسائل کے متعلق فلسفہ کا کٹہر ہے کٹر مخالف اپنے ذہن میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کر لیتا ہوتا ہے مثلاً وہ فرض کر لیتا ہے کہ مادیت صحیح ہے، حقیقت کی تمام صورتیں شجر و حجر، لطف و کرم دعا و عبادت سب مادی ہیں، ان کی مادی پیالیش ہو سکتی ہے۔ یہ ایک شاندار مفروضہ ہے جس کی اختیاری تصدیق بالکل ناممکن، یہی مفروضہ اس کو فلسفی بناتا ہے اور اپنے اس فلسفہ کو وہ قابل تعریف سا دگی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ فرض کر لیتا ہے کہ دنیا ایک قسم کی میکائیت ہے، اور وہ خود ایک شین ہے جو میکائی اور غیر شعوری طور پر شعور کے (ایداز ضرورت اور فصول ارتقا پر غور کر رہا ہے، دنیا کی ماہیت کے متعلق یہ بھی ایک نظریہ ہے جو اب تک ناقابل ثبوت ہے، اور جب اس کو دیمقراطیس، بالکری ٹیسس یا ہامس یا لامتری پیش کرے ہیں تو فلسفہ کے نام سے بکا راجاتا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ حیات میں خود اختیاری نہیں، ہر ایک ہستی کا فرض اس ابتدائی ضابطہ (Nebula) کے متعین و مقرر کر دیا ہے جو سائنس کی صنمیاات میں "باغ عدن" کی جگہ ہماری سامنے نوازی کرتا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ذہن مادہ ہے اور بقول وابستا دینٹے (نوز بالعدھا ایک عرصہ ہوا کہ ہر جکا اور اس کی متعدد قبریں مساجد و منار میں بنائی جا چکیں)

یہ سب ممکنہ مفروضات ہیں۔ ہر فلسفی ان کو یا ان مخالف مفروضات کو تسلیم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ہم تمام کو ان مفروضات کو تشکیل دینا اور ان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اشیاء کی ماہیت اور انسان کی غایت کے متعلق مفروضات کو تسلیم کریں، ہم ہمیشہ مفروضات کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں، مطلق کا "آدھرستجو" ہمارا "آرام جان" ہوتا ہے، اس کی دشمنی ہمیں ہمیشہ اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ علاوہ دوسرے وجوہات کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے، وہ دیار نامعلوم کا سفر ہے۔ لاجمہ ود کی تلاش میں کو بکو کوم بکو سرگرداں ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی میں جو دل قریبی ہے اس سے زیادہ نہیں! لہذا ہم سب فلسفی ہیں، ابعد الطبعیاتی حیواں ہیں، ایک جو اعلیٰ فلسفی ہے دوسرا جو اقرار ایجابی ہے ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ہی اس معاملہ میں راست باز و راست گو آدمی ہے

فلسفہ کی ترقی پر اعتراض :-

فلسفہ پر ایک اعتراض عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ مباحث میں جس دروازے سے ہم داخل ہوتے ہیں

اسی دروازے سے باہر بھی ہوتے ہیں، ہر فلسفی دوسرے فلسفی کے خیالات کا نقیض پیش کرتا ہے، تاریخ فلسفہ ان ہی تناقضات نظری ارٹے کا مجموعہ ہے جو کامیابی کے لحاظ سے مادی علوم مخصوصہ کی ترقی سے کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی حقیقت میں فلسفیانہ مباحث کے دوران میں یا تاریخ فلسفہ کے مطالعہ کے وقت اگر ہم اپنا دماغ دروازہ کے باہر چھوڑ کر جائیں تو بینک اسی دروازہ سے نکل آئیں گے جس دروازے سے کہ ہم داخل ہوئے تھے! اکابرِ فلاسفہ کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد بھی ہزار ہا اہم مسائل کے متعلق ہم اپنے خیالات بدلے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہم خود فلاسفہ کے تناقضات کے متعلق بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے اور پائیں گے کہ بنیادی مسائل کے متعلق تقریباً تمام اکابرِ فلاسفہ کا اتفاق تھا، اختلافات محض اپنے اپنے دماغ کے اصطلاحات و حدود کے فرق کی وجہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ اور نیز اگر ہم تاریخ سائنس کے طالب علم ہیں تو ہمیں بادی النظر ہی میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ فلسفہ سے زیادہ سائنس میں نظریات ..... اعتقادات سینما کے متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزار ماہستر نظریات کی تاریخ ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند عالم گیر اہمیت کے نظریات کا ذکر کریں گے:-

آج سے پچاس پچپن سال پہلے کائنات کے ابتدا کی توجیہ لاپلاس کے مفروضہ *Nebula Hypothesis* سے کی جاتی تھی۔ کائنات فلسفی نے اس نظریہ کو سب سے پہلے پیش کیا تھا، لاپلاس نے اس کی توضیح کی تھی، آج کل شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر جیمز لیٹن اور وٹسن اس کی توجیہ *Planetary Hypothesis* پیش کی ہے جو اول الذکر نظریہ کی تردید کرتی ہے

پچاس پچپن سال پہلے ڈارون کی *Origin of Species* (اصل انواع) ارتقائی انجیل بھی جاتی تھی آج کل یہ دنیا بھر کے اعتراضات کا نشانہ ہے اور اس کی وقعت کا حال سب کو معلوم ہے! عمل ارتقائی توجیہ تفسیرات *Naturalism* کے بجائے "تخللات" (*Mutation*) سے ہوئے تھی، اب مقرر کیا مری کے ساتھ ہم لامارک کے نظریہ کو پھر قبول کرنے لگے ہیں۔ ہمیں تفاوتِ راہ! نیوٹن نے حرکت کے بعض قوانین دنیا کے سائنس نے ان کو قبول کیا، اب آکسفورڈ ان کی تردید کر رہا ہے۔ جے بر، رم فورڈ، ڈے وی، اور صد ہا دیگر علماء سائنس نے مادہ کی غیر فنا پذیریری اور بقائے توانائی کو ثابت کیا اور ساڈی رڈ فورڈ بینکس جدید سائنس ان انتہائی عقاید میں شک پیدا کر رہے ہیں۔ پیرسن، ماخ وغیرہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ سائنس کا علم حتمی احتمالات ہو جاتا ہے، اور فطرت کے عظیم التفر دابدی قوانین مادہ کے مشاہدہ کردہ عادات کے اوسط کے سوا کچھ اور نہیں! بھلا ہم ایسی سائنس کی شان میں کیا کہیں جو فلسفہ کی طرح غیر یقینی ہو گئی ہے اور فطرت کے علم کا کیا دعویٰ کریں جس قوانین اعداد و شمار کی سی وقت رکھتے ہوں! کسی زمانہ میں ریاضیات کو یقین اور غیر خطا پذیر صد اقول کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا کہ ناگماں ابعاد ثلثہ صاحب اولاد ہو گئے، جڑ کل کے آنا بڑا ہو گیا اور آکسفورڈ نے ثابت کر دیا

دو نقاط کے درمیان ایک خط مستقیم بنے سے بڑا فاصلہ ہے! فرانسس گالٹن اور کارل پیرسن کی تحقیقات کی رو سے ماحول کا اثر توارث سے زیادہ تھا..... مسٹر وگم نے اس کے برخلاف بڑی شان سے دنیا کو یہ ثابت کر دکھلایا کہ توارث کا اثر ماحول کے اثر سے زیادہ ہے، اب ڈاکٹر وائسن دو سو بچوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہمیں اطلاع دے رہے ہیں کہ جنین اور بچہ کا ماحول اس کی سیرت و تاریخ کے تعین کا اہم جز ہے اور توارث کا اثر نہایت خفی ہے اور آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ آئے دن ہر ایمان دار تاریخ داں ثابت کر رہا ہے کہ تاریخ ”جھوٹ کا دریا ہے“ ہر ایمان دار ”*ماہ صوفیہ*“ سنین و سلسلہ ملوک کی

ایک نئی فہرست پیش کرتا ہے جو دوسری فہرستوں سے چند ہی ہزار سال کا فرق رکھتی ہے! سائنس کے نظریات کے عدم تغیر ہونے کے ثبوت میں یہ مثالیں اہل بصیرت کے لئے کافی ہیں، اعمال نامے کو طول دینے کی ضرورت نہیں، فلسفی کی نظروں کے لئے تو یہ خوش کن سرگس ہے! بحیثیت فلسفی ہمیں اعتراض ہے کہ فلسفہ بعض جگہ تاریک ہے لیکن یہی حال سائنس کی نظم کا ہے، یہی حال سائنس کا ہے، یہی حال جنس لطیف کا ہے، یہی حال ہر دلچسپ شے کا ہے! اس سے بدتر، ہم ماننے پر تیار ہیں کہ فلسفہ بعض دفعہ کذاب بھی ہے۔ ہم اپنے قلب کے عزیز نقصات کو، بد ہی عورتوں کی دینیات کو خارجی یقینی عقل کے لباس میں ملبوس کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک مشہور فلسفی براؤڈے نے مابعد الطبیعیات کی اس طرح تعریف کی ہے کہ ”مابعد الطبیعیات (فلسفہ) ان چیزوں کے لئے جن میں ہم جیسی طور پر یقین کرتے ہیں خراب محبتوں کا دریافت کرنا ہے، لیکن ان محبتوں کا دریافت کرنا بھی کچھ کم جلی نہیں“ لیکن باوجود ان تمام نقائص و خرابیوں کے سائنس کی طرح فلسفہ کی رفتار ترقی بھی متعین اور شاندار ہے، اگر مشنہ پچیس سال میں فلسفہ نے اسی سرعت و شان کے ساتھ ترقی کی ہے جس طرح کہ سائنس نے۔ ولیم جیمس جیسے محتاط دانشمند فلسفی کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:-

”بعض حیثیتوں کے لحاظ سے تو ”سائنس“ نے ”فلسفہ“ سے کم ترقی کی ہے۔ یعنی اس کے اکثر کلی تصورات سے نہ اسطو کو حیرت ہوگی اور نہ دیکارٹ کو اگر بغرض محال انھوں نے زمین کی سیر کا ارادہ کیا۔ اشیاء کا عناصر سے مرکب ہونا، انکا ارتقا، بقائے توانائی، ایک کلی لزوم یا جبر کا تصور، یہ سب انھیں معلوم و معتاد چیزیں نظر آئیں گی۔ ہاں چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً خوردبین، بجلی کی روشنی، ٹیلیفون، اور سائنس کی دیگر جوہریات ان کو ہر دم عجب کریں گی۔ لیکن اگر یہ ہمارے مابعد الطبیعیات کی کتابیں کھولیں یا فلسفہ کے کچھ مردم میں آئیں تو ہر چیز انھیں اجنبی سی معلوم ہوگی۔ ہمارے زمانہ کا سارا ”تصویری“ یا ”انتقادی“ پہلو انھیں نیا معلوم ہوگا اور ان کے سمجھنے میں انھیں دیر لگے گی“ (بعض سائل فلسفہ ص ۱۷۷)

شاید اس تفصیلی بحث کے بعد آپ کو فلسفیانہ تعلیم کے فوائد کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ فلسفہ آپ کو سب سے پہلے وحدت

فہم عطا کرتا ہے، ہم آپ سب فکر کے عمل میں غیر محتاط اور متناقص ہوتے ہیں ہمیں کسی حد تک توافق و اتفاق کی ضرورت ہے۔ فلسفیانہ تعلیم ہمیں وحدت فکر بخشتی ہے، اس وحدت ذہن یا وحدت فکر سے ہمارے خواہشات میں وحدت پیدا ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے سیرت میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو شخصیت کا دوسرا نام ہے اور سیرت کی وحدت کی وجہ سے زندگی میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو مسرت کا راز ہے اور جو ہم سے تماموں کی فائیت قصویٰ ہے۔ ایکپورس شہنشاہ خوش باشاں نے دو ہزار سال قبل اپنے ایک دوست کو خط لکھا تھا جس میں وہ کہتا ہے

”کسی شخص کو بھی جب تک وہ جو ان ہے فلسفیانہ تعلیم حاصل کرتے میں دیر نہ کرنی چاہئے، اور اگر وہ نہ نفع ہے تو اس کو اس تعلیم کے حصول میں تھکن نہ ظاہر کرنی چاہئے، کیونکہ وہ کون شخص ہے جو اپنی روح کی صحت کا علم حاصل کر نہیں وقت کی موزونیت و ناموزونیت و تاخیر کا خیال کرے گا؟ اور جو شخص یہ کہتا ہو کہ غلط فہمی کا بھی وقت نہیں یا وہ وقت گزر چکا، تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہو جو یہ کہتا ہو کہ ابھی مسرت کا وقت نہیں آیا یا وہ گزر گیا!“

فلسفیانہ تعلیم سے انسان اپنی جذبات کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے، جذبات کی غلامی سے آزادی حاصل کر کے دوسرا فلسفیانہ تعلیم سے نجات پاتا ہے۔ روم کے ایک جادو بیان کے الفاظ میں ہم فلسفہ کو مخاطب کر کے کہہ سکتے ہیں ا۔

”اے فلسفہ کی روح، اے ہماری زندگی کی رہنما، نیکی کی دوست اور بدی کی دشمن، تیرے بغیر ہم کیا اور ہماری زندگی کیا!“

میر ولی الدین ایم۔ اے (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

## اولی الالباب سے خطاب

جناب مولوی سعید الدین صاحب ایم۔ اے۔ ال ال بی سب جج بریلی کا وہ مشہور رسالہ جو کئی سال قبل شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اس میں صاحب موصوف نے قرآن کی اہمیت اور اس کو سمجھ کر پڑھنے پر نہایت دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کا مطالعہ خواتین کے لئے ادب سے ضروری ہے۔ ہر کے گھٹ بچھ کر حاصل کیجئے

منیجر نگار لکھنؤ

# رجوتی

یوں تو برسات کی ہر شام خوشگوار ہوتی ہے لیکن جب کئی روز تک مسلسل بارشیں ہونے کے بعد فطرت کا جو شش کچھ کم ہوتا ہے تو کھیتوں اور میدانوں کی کشتیں دہلی ہو جاتی ہے، درخت اور پودے ہٹا دھوکریاں روپ اختیار کر لیتے ہیں اور شام کی تابناک شفق ہر چیز کو اپنے سائے میں لے لے کر رہا کرنا جاتی ہے۔

کسی ندی کے کنارے شش پور کے علاوہ اور بھی کئی گاؤں آباد تھے۔ اور دوسری جانب مقابل میں بون آباد کا بازار تھا، جہاں دو سنبہ اور جمعہ کو جب خانہ طور پر بازار لگتا تھا اچھی خاصی چل پھل ہو جاتی تھی،۔۔۔ برسات کے علاوہ ۱۰، ۱۵ کم میں دریا اس قدر پایاب رہتا تھا کہ لوگ آسانی سے ادھر ادھر آجاسکتے تھے البتہ جب بارش ہوتی تو کسی ندی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلنے لگتیں

کشن پور میں سیتل اور شکر دو ملاحوں کے مکان تھے، پھلیوں کے علاوہ برسات میں یوں بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، شکر کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھیں جنہیں سرجو سے بڑا تھا اس کی عمر اکیس سال کے قریب تھی اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ قرب دربار میں کسی اور ملاح کا مکان ہی نہ تھا، سیتل کے صرف ایک لڑکی رجوتی تھی جس کی عمر سولہ یا سترہ برس کے قریب تھی سیتل اور شکر باپھی نے تو خیر آپس میں طے ہی کر لیا تھا لیکن عام طور پر بھی سارے گاؤں میں یہ خبر مشہور تھی کہ سیتل باپھی کی کنول بیسی خوبصورت لڑکی کا بیاہ سرجو کے ساتھ ہوگا۔ سرجو اپنے کام میں بہت ہوشیار تھا لیکن رجوتی اور زیادہ قابل ستائش تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد ہی گھر کا سارا بار اس نے سنبھال لیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں ہر شخص کسی نہ کسی خاص بات میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے، اور چونکہ لوگ کم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر شخص ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ سرجو بہت ہونہار اور محنتی لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ اور رجوتی بھی فراوانی حسن کے ساتھ ساتھ فرمانبرداری کا اعلیٰ نمونہ خیال کی جاتی تھی

کئی دن تک مسلسل بارش ہوتی رہی اور لوگ گھر پر بڑے بڑے کالہلی اور مستی محسوس کرنے لگے، علاوہ ان لوگوں کے جن کی ضرورتیں نہایت اہم تھیں تمام لوگوں نے اپنا اپنا کام بارش کے بند ہو جانے پر اٹھا رکھا تھا، سچر کے روزے پانی برسات شروع ہوا تھا گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے نہایت تنہائی اور یقین کے ساتھ یکساں انداز



اپنی سگونی کر دی تھی کہ پانی سینچ کر پہلے بند ہو ہی نہیں سکتا۔ . . . . اور ہوا بھی یہی ! جب لوگ اتوار کے کو سو کر اٹھے تو آسمان صاف تھا اور یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی حسین دوشیزہ بڑی التجاؤں کے بعد نقاب لڑھکھرا رہی ہے

سیتل کی روز سے بیمار تھا اُس کا ارادہ تھا کہ وہ کشتی نہ کھوئے گا لیکن دوشنبہ کے دن اس قدر زیادہ لوگ آباد بازار جانے کو تیار ہوئے کہ اس نے رجوتی کو بلا کر کہا۔ ” میرے کوئی بیٹا ہوتا تو آج میں بھی اطمینان سے نہ آج آمدنی کی بہت امید ہے اور میرے بازوؤں میں دریائی موجوں سے لڑنے کی قوت نہیں، دو چار کھوسے تو اُس پار چو پنا دے میں آج کل تیرے بیاہ کے لئے کوڑی کوڑی جمع کر رہا ہوں “ رجوتی نے سر جھکا لیا اور گئی، اس نے ایک منٹ وقت بھی ضائع نہ کیا، باپ کے لئے تھوڑا بہت کھانا تیار کر کے وہ گھاٹ کی طرف نہ ہو گئی

رجوتی کو بانسری بجانے سے بڑا اُٹس تھا، اور اُس کی فرصت کے لمحے اسی مشغلہ میں صرف ہوتے تھے، بانسری کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی، وہ اکثر شام کے وقت سی کی رنگین لہروں پر اپنی کشتی تیرا دیتی اور بانسری لہروں سے شام کی ٹلگینی کو طرب ناک بنا دیتی، ہوا میں سکون ہوتا اور کشتی کے ہلکے ہلکے ہچکونوں سے دریا میں جھوٹی دلی موجیں اٹھتی تھیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ رجوتی کے گیت سطح آب پر رقص کر رہے ہیں، اندھیری رات میں لم گھڑبہاہ میں اکثر شام کاں رجوتی کے گیتوں سے غوطہ ہوتے تھے، سر جو بھی کبھی کبھی کشتی میں بیٹھ کر اُسی وقت یائیں تفریحاً نکلتا تھا، اور اکثر دلی زبان سے یہ بھی کہہ دیتا تھا

” رجوتی ! ہمیں تمہارے گیت بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں “ اس جملہ میں نہ جانے کس قدر ہمت افزا اثر ہوتا کہ رجوتی اور زیادہ اٹسک سے بانسری بجاتی اور اپنے سب سے زیادہ مسخو رکُن گیت گاتی باپ کے کہنے کے مطابق رجوتی نے کشتی کھولی اور بہت سے لوگوں کو رسول آباد پہونچا آئی جب تک لوگ زار کی خرید و فروخت میں مشغول تھے رجوتی اپنی کشتی میں بیٹھی ہوئی اُس کا پانی جو تختوں کے اندر سے اُٹیا تھا نکال رہا تھا پھینکتی رہی، سسی ندی سے ایک نالا نکل کر یگاؤں کے اندر ہی کچھ دُور تک جلا گیا تھا، اُسی پر ایک پُل بنا دیا تھا جس پر شام کے وقت لوگ تفریح کی غرض سے آتے تھے، بازار کی مشغولیت کی وجہ سے سوا دو چار بچوں اور لڑکوں کے پُل پر کوئی نہ تھا کہ کسی کھانسی جبر کے پانی میں گرے کی آواز آئی، بازار میں کافی شور و غل تھا اور یہ آواز کسی دہائی جانب توجہ نہ کر سکی، جھوٹے لڑکوں نے شور مچانا شروع کیا کچھ لوگ دوڑ پڑے لیکن سب سے پہلے جو شخص دریا کے بہاؤ میں تیرتا ہوا نظر آیا وہ ایک عورت تھی۔ برسات کی وجہ سے نالے میں بہت زور تھا۔ لیکن رجوتی نے کچھ



رسول آباد آتی تھی، کوشل اُسے جس قدم بھی دیکھ سکتا تھا دیکھا کرتا، اُس کی خاموش محبت کو لے کے بچے دہلی ہوں جنگاری کی طرح اس کے سارے وجود پر بھائی بارہی تھی اور وہ وقت قریب تھا جب محبت کے شعلے بھڑک کر کوشل کو جلا دیں

رجونتی جیب بانسری بجاتی اور اپنے محبت سے بھرے ہوئے نئے چھڑتی تو وہ خود تصور میں کسی ایسی ہستی کو ڈھونڈھتی جس پر پریم سے بھرے ہوئے گیت صادق آئیں۔ جب وہ سرجو کے پسندیدہ گیت گاتی تو تنہائی میں بھی سرجو کی حریف نگاہیں اپنی آنکھوں سے ملتے ہوئے دیکھتی تھی، ادھر جب سے کوشل بار بار اُسے نظر آیا تھا اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تمام گیت اُسی کے حضور میں پیش کر رہی ہے

ایک روز رجونتی اپنی ذاتی ضرورت سے کشتی لے کر رسول آباد آئی، کوشل حسب معمول آج بھی منتظر تھا، محبت میں عزائم کی تیاری اور شکست، منصوبوں کا بندھنا۔ ٹوٹ جانا، تاویلات کا قائم ہونا اور مت جانا معمولی باتیں ہیں، جب تک محبوب نگاہوں کے سامنے ہے۔ اُس وقت تک دل، دماغ اور آنکھیں سب محو نظارہ ہیں، لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا اور دل و دماغ فکر میں مشغول ہوئے، کوشل نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ کہ رجونتی کی کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دیر دریا کی تفریح کرے۔ لیکن اُسے کوئی قوت روکتی نظر آتی تھی، آج جبکہ بالکل سناٹا تھا کوشل ہمت کر کے ساحل آب کی طرف اضطراری طور پر بڑھا، قریب پہنچ کر ٹھہر گیا، جب تک رجونتی کشتی باندھتی رہی وہ اپنے بچے درست کرتا رہا جن کے ذریعہ سے وہ رجونتی سے مخاطب ہوگا، رجونتی کشتی باندھ کر کوشل سے ایک گز کے فاصلہ سے گزر گئی اور کوشل ایک بت کی طرح کھڑا رہ گیا، جب رجونتی بازار کی گلیوں کے پیچ و خم میں غائب ہو گئی اس وقت کوشل نے مڑ کر جانے والی کی طرف نگاہ کی

میلوسی کا انتظار تکلیف دہ ہوتا ہے اور امیدوں کا انتظار ایک شیریں خواب کی طرح پُر کیف، کوشل کو اطمینان سا تھا کہ رجونتی ابھی واپس آئے گی، اس نے اس کے جذبات کی کوئی حد نہ تھی، وہ دریا میں اٹھتی ہوئی لہروں کو اپنے خیالات کے مد و جزر کے مقابلہ میں پہنچ سمجھ رہا تھا۔ . . . . . دُور سے رجونتی آتی ہوئی نظر آئی اور کوشل کے تمام متشر خیالات سمٹ کر صرف اس آرزو میں تبدیل ہو گئے کہ رجونتی کے ساتھ دریا کی سریر کر لے، وہ آئی اور کشتی میں بیٹھ گئی، ڈانڈا اٹھا کر چلنا ہی چاہتی تھی کہ کوشل کی متنا اضطراری طور پر اُٹھنے ہوئے الفاظ میں یوں نکل گئی۔ ” میں بھی چلوں گا “ بعض اوقات الفاظ احساسات عشق کے اظہار سے بالکل قاصر ہوتے ہیں محبت کی زبان ہی کچھ اور ہے اس کا راد گنگو سے زیادہ خاموشی میں ظاہر ہوتا ہے پھر بھی رجونتی نے کوشل کا مقصد پالیا، اُس نے ڈانڈا ہاتھ سے رکھ دیا کشتی سے اتر کر ساحل پر آ گئی اول ایک طرف سر جھکا کر کھڑی ہوئی کوشل بغیر کچھ کے ہوئے کشتی میں سوار ہو گیا اس کے بعد رجونتی بھی آئی اور کشتی ایک طرف روانہ ہوئی،

ہوا مخالفت چل رہی تھی اور کچھ عرصہ سے تند و تیز بھی ہو گئی تھی لہذا رجونتی کی زیادہ تر توجہ اُسی جانب تھی، اس کا چہرہ بار بار سُرخ ہو جاتا تھا، ہوا اس کے بالوں کو منہ پر لاکر منتشر کر دیتی تھی۔ اور اس کی ساری کا آنچل بار بار سر سے ڈھلک جاتا تھا۔ کوشل دیکھ رہا تھا اور مت رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ رجونتی کو کسی طرح یقین آجائے کہ وہ اس کی پرستش کرنا ہے اور پھر اس کے بعد کشتی دریا کی لہروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے تاکہ پھر محبت میں ناکامی کی کوئی امید ہی باقی نہ رہے۔ اس نے آہستہ آہستہ گفتگو شروع کی، گزشتہ بارش کے متعلق اظہار خیالات ہوتا رہا، فصل اور زراعت کے متعلق بات چیت ہوتی رہی اور وہی کوشل جسے فلسفہ کی کاہش میں اور نفسیات کی کتابوں کے سوا کوئی بات ہی پسند نہ آتی تھی۔ آج رجونتی سے دیہات کی معمولی باتوں پر زیادہ جوش اور مسرت کے ساتھ جو گفتگو تھا، وہ اس وقت محبت میں نہ ہو کر خود کو تمام خیالات سے بیگانہ بنا لے ہوئے تھا، اپنے بھائی کے پیالے جاسے پر اسے اب تک اظہارِ شکر کا موقع نہ ملا تھا۔ اس نے جی کھول کر شکریہ ادا کیا، اظہارِ قبولیت میں رجونتی کی جھکی ہوئی آنکھیں اور زیادہ ہیجان پیدا کر رہی تھیں، اگرچہ کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن کوشل نے کمدیا کر میں مجھ سے محبت کرنا ہوں صرف اس لئے نہیں کہ تو خوبصورت ہے بلکہ اس لئے کہ تو صحیح معنوں میں عورت ہے، رجونتی کے خیالات کے عمق کا پتہ کون لگا سکتا ہے لیکن اس کی قوت ٹھنڈی ہوئی۔ اور کشتی دریا کے چڑھاؤ پر رکتی ہوئی نظر آتی تھی، ایک طرف امواج آب میں تلاطم تھا دوسری طرف کوشل اور رجونتی کے پیہم کی لہر میں ضبط اور صبر کا باندھ توڑ کر باہر نکلی جا رہی تھیں، اظہارِ محبت کے لئے یہی ٹھیک وقت تھا کیونکہ ہر چیز محبت میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی، ہر طرف محبت کی بارش ہو رہی تھی رجونتی نے یکایک کشتی رسول آباد کی طرف پھیر دی اور بہت تیز چلانے لگی۔ کوشل نے گھبرا کر پوچھا ”کیا واپس چل رہی ہو؟“ رجونتی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ”ہاں“ کشتی دھارے پر تیزی سے روانہ ہوئی اور وہ وقت جسے کوشل ختم ہوتا ہوا نہ دیکھنا چاہتا تھا اور تیزی سے کٹے لگا، گھبراہٹ میں کوشل کچھ بات چیت بھی نہ کر سکا۔ رجونتی نے وعدہ کیا کہ وہ اکثر ملا کرے گی۔ کشتی کنارے پر آگئی، کوشل اتر گیا اور جیب میں ہاتھ لے جا کر زردری نکالنی چاہی لیکن رجونتی کشتی لے کر کنارے سے دور جا چکی تھی، کوشل نے بھڑکنے پر اس نے صرف مڑ کر دیکھا اور بغیر کچھ کہے ہوئے کشن پور چلی گئی

اب کوشل اکثر رجونتی کے ساتھ سچ آب پر نظر آتا تھا دن گزرتے جاتے تھے اور دونوں میں محبت کے عہد و پہاں منظم ہوتے جاتے تھے۔ . . . . رجونتی کی زندگی کا باپ محبت قابلِ غور ہے، اُسے سر جو سے عشق تھا۔ اور کوشل سے محبت کرتی تھی، دونوں میں سے کسی ایک کو بھی وہ رنجیدہ نہ دیکھنا چاہتی تھی، اُسے یقین تھا کہ غنیمت اُس کی شادی سر جو سے ہو جائے گی۔ لیکن اس خیال نے کوشل کے انتہا میں فرق نہ آنے دیا، وہ سر جو کو اپنا رفیق حیات سمجھتی تھی

اور کوشل کو محبت کئے جانے کے قابل جانتی تھی، لیکن اس نے کبھی یہ غور نہ کیا تھا کہ اگر سر جو اور کوشل ایک ہی وقت میں اس کے قریب ہوئے تو خود اس کی کیا حالت ہوگی یا ان دونوں کے احساسات کا کیا عالم ہوگا۔ اس کے لئے اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ایک روز جب رجوئی سر جو کے ساتھ سی ندی کے کنارے پر نہایت محبت سے پھولیوں وغیرہ کے متعلق گفتگو کر رہی تھی کوشل بھی آگیا، سر جو نے تو اُسی روز کہہ دیا " رجوئی، تمہاری بات میرے ساتھ ہو چکی ہے اب تم کسی اور سے اس طرح نہ ملو نہیں تو لوگ کیا کہیں گے " یہ سنا کر رجوئی چونک پڑی۔ اور دوسرے روز جب کوشل نے اُسے تنہا پا کر سر جو سے نہ ملنے کے لئے کہا تو رجوئی کے دل پر جو سی لگی، اُسے محبت کرنا تو آتا تھا لیکن محبت کی ان پیچیدگیوں سے واقف تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں کو خوش نہیں رکھ سکتی، اس احساس نے اُسے تڑپا دیا لیکن مجبور تھی، دونوں کا دل رکھنے کے لئے اُس نے دونوں سے وعدہ کر لیا

سیٹل کی بیماری نے طول پکڑا اُس نے شکر کو بلا بھیجا اور رجوئی کی شادی جلد کر دینے پر زور دیا، رجوئی کو سوا اس کے کہ کوشل کو اس خبر سے تکلیف ہوگی اور کوئی رنج نہ تھا، سر جو کے ساتھ شادی ہونا اس کی دیرینہ تمنا تھی، شادی ہوگی اور رجوئی قریب قریب ایک مہینے تک رسول آباد نہ جاسکی، کوشل اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھا اُسے معلوم تھا کہ رجوئی کی شادی سر جو ہی کے ساتھ ہوگی لیکن اس کے اس قدر جلد ہو جانے کا یقین نہ تھا۔ ایک مہینہ بعد رجوئی کشتی لے کر رسول آباد آئی کوشل سے ملاقات ہونے پر رجوئی نے نہایت مصحوبیت سے اس کا اقرار کر لیا کہ وہ اب سر جو کی ہو گئی ہے، لیکن کوشل کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں۔ کوشل اسے اپنی محبت کی ناکامی سمجھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چلنے لگے۔ . . . . یکلک اس نے رجوئی کا ہاتھ مضبوط پکڑ لیا اور اُسے گھور کر دیکھنے لگا رجوئی سم گئی اور اُس نے مترجم بنکا ہوں سے کوشل کو دیکھا، ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور آنسوؤں کے وہ قطرے جو اب تک پلکوں پر آکر تھر تھرا رہے تھے گر کر زمین میں جذب ہو گئے۔ ٹھیک اُسی وقت سر جو بھی آگیا اُس نے دونوں کو خوفناک نظروں سے دیکھا لیکن رجوئی کی حالت ہی کچھ عجیب تھی، جس طرح دو موٹر ایک ہی رفتار سے مخالف سمتوں میں گزر جائیں تو دونوں کے درمیان کی گرد اور سوکھی ہوئی پتیاں اپنی جگہ پر کانپ کر ساکت رہ جائیں گی اسی طرح رجوئی دونوں طرف کھینچ رہی تھی۔ لیکن اُس کا سر بچے سے ادب نہ ہوتا تھا۔ سر جو نے برعکس اس کا بازو تھام لیا اور ندی کی طرف کھینچ لے گیا، کوشل اپنی جگہ پر ایک جسدِ بے روح کی طرح کھرا رہ گیا، دور ہو چ کر رجوئی نے ایک دفعہ مکر اُسے دیکھا اور پھر ایک وفا شعار بیوی کی طرح سر جو کے قدموں میں گر کر رونے لگی

سیتل کا انتقال ہو گیا، باپ کی موت نے رجونتی پر بڑا اثر کیا وہ سست رہنے لگی، سرجو اب خودکشی سے کر جاتا تھا اس نے رجونتی کو بہت کم تکلیف دی، دونوں کی ازدواجی زندگی نہایت پرسترت تھی، اسی اشار میں کوشل پر مرض کا سخت غلبہ ہو گیا، اس کی کمزوری بہت بڑھ گئی اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے وہ کچھ دنوں کے لئے پہاڑ چلا گیا، جب سردی ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ واپس آیا اور دو چار مہینے ادھر ادھر رہ کر پھر منصوری چلا گیا، رسول آباد میں اس کا کوئی ایسا رازدار دوست نہ تھا جس سے رجونتی کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں وہ ادھر سے بالکل بے خبر تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ کبھی رجونتی کے خیال سے غافل نہیں رہا

کشن پر میں سخت طاعون پھیلا، موت کا شکار ہونے والی ہستیوں میں سب سے زیادہ عبرتناک سرجو کی ذات تھی، اس کی جوانی کی موت نے سارے گاؤں کو صدمہ پہونچایا، رجونتی پر سخت اثر ہوا، اس کا دماغ ماذت ہو گیا اس نے گاؤں میں رہنا ترک کر دیا اور دن رات سڑی کے کنارے گزارنے لگی، وہ گیت جن سے کسی وقت سرجو پر صدمہ کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور بعض اوقات وہ جو شش محبت میں رجونتی کو سینے سے لگایا کرتا تھا۔۔۔۔۔ وہی گیت اب اس کے جنون کو کچھ دیر کے لئے پس پشت ڈال دیتی۔ اور وہ تصور میں سرجو کے گلے میں باہیں ڈال دیتی جب تھک جاتی تو آہستہ آہستہ کسی سے باتیں کرتی، یہی اس کا دن بھر کا مشغلہ تھا، سرجو کے چھوٹے بھائی بسن کبھی کبھی کھانے پینے کے لئے کچھ لاتے تھے۔ اور وہ دوسرے دوسرے دن کچھ کھا لیتی تھی، جب لوگوں نے اُسے گھر میں آکر رہنے پر مجبور کیا تو ایک روز وہ کہیں غائب ہو گئی

کوشل تندرست ہو کر رسول آباد آیا اور سب سے پہلی فرصت میں کشن پر پہونچا۔ رجونتی کے متعلق تو کچھ دریافت نہ کر سکتا تھا لیکن اُس نے لوگوں سے سرجو کا حال دریافت کیا، اُسے مفصل کیفیت معلوم ہوئی، رجونتی کے باگل ہو کر کہیں غائب ہو جانے کے خیال سے وہ کانپ اٹھا، محبت کی پہلی توہین بھول چکا تھا۔ اور وہ تمنائیں جو کوہستان کی محبت آمیز فضا میں اس کے سینہ میں بیدار ہوئی تھیں یک بیک مُردہ ہو گئیں اُسے خوب معلوم تھا کہ رجونتی سرجو کی ہے لیکن اُس چہرہ پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی تھا

گرمی بھی گزر گئی اور کوشل پھر بنارس واپس ہوا کہ اپنی تعلیم مکمل کر لے۔ اُسے محبت کی دنیا میں سناٹا نظر آ رہا تھا، اُس کی آنکھیں ہر وقت کسی کی جستجو میں سرگرداں رہتی تھیں، جس روز طبیعت زیادہ اُداس ہوتی تھی اُس دن وہ گنگا کے کنارے بیٹھ کر اپنا وقت اُن دنوں کی یادیں کاٹ دیتا جن میں رجونتی اس کے احساسات محبت کو لطیف سے لطیف تر بنایا کرتی تھی، دریا خوب بڑھا ہوا تھا، کوشل کو اس کی موجوں کی طرح سکون نہ

تھا، وہ کنا سے ہی کنارے پر دُر تک چلا گیا، واپس ہونا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم آگے ہی کی طرف اٹھ رہے تھے، . . . . . دُور سے اُسے بالسرری کی آواز سنائی دی، وہ دیوانوں کی طرح بڑھتا چلا گیا اور آواز اُس کے وجود کے ہر ذرے میں سرایت کر گئی، اب وہ غلطی نہ کر سکتا تھا، یہ رجونئی کی آواز تھی اور اُس کے گیت! کوشل درختوں اور بھاریوں کی آواز سے نکل کر رجونئی کے پیچھے آگیا، رجونئی نے مرکز دیکھا اور بھراپے گیتوں میں منہمک ہو گئی، دو چار آدمی قریب کے کھیتوں میں کام کر رہے تھے لیکن کوئی بھی خاص طور پر رجونئی کی طرف متوجہ نہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عرصہ سے اس کو اسی حال میں دیکھ رہے ہیں۔ کوشل نے خوشی اور تعجب سے ملی ہوئی آواز میں ”رجونئی“ کو آواز دی رجونئی پر کوئی اثر نہ ہوا، کوشل بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا ”مجھ کو نہیں پہچانتی ہو؟“ رجونئی میں نے تجھ کو کہاں کہاں دھونڈھا“ رجونئی نے کہا ”پہچانتی کیوں نہیں“ کوشل کی اُمیدیں بیدار ہونے لگیں اُس نے پوچھا ”اچھا بتاؤ میرا نام کیا ہے؟“

”میں نہیں جانتی، نہیں، میں نہیں جانتی“ رجونئی نے چیخ کر کہا کوشل گھبرا گیا اور کہنے لگا ”رجونئی کیا کوشل کو بھلا دیا؟“ رجونئی بہت زور سے ہنسی اُس کے قہقہے میں دردناک ترنم تھا۔ اس نے کہا ”کوشل! کوشل! کوشل بھی مر گیا اور سرجو بھی۔۔۔۔۔ دونوں۔۔۔۔۔ ہاں کوشل بھی سرجو بھی۔ کوشل اور سرجو“

”رجونئی مجھے پہچان میں کوشل ہوں!“

”نہیں نہیں جھوٹ ہے۔ کوشل اور سرجو دونوں وہ ہیں“ اُس نے پانی کی طرف اشارہ کیا۔ اور فوراً دیا کی موجوں سے ہم آغوش ہو گئی، کوشل بھی فوراً ہی کو دیرا لیکن گنگا کی لہریں اُسے دُور بدلے گئیں، لوگ دوڑے اور بڑی کوششوں سے دونوں کو نکالا رجونئی سرجو سے مل چکی تھی اور کوشل بیہوش تھا کوشل اب بیمار اور سست رہتا ہے اور گنگا کی پریشش صرف اس لئے کرتا ہے کہ رجونئی اُس کی گود میں ہے

احتشام (رضوی)

## گلمائے جعفری

یعنی مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے کلام کا انتخاب از نیاز فقیری۔ ابتدا میں جناب نیاز نے مختصر لکھنوی شاعری پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ ہر کے ٹکٹ بیچ کر حاصل کیجئے

مینجر نگار لکھنؤ

# انسان کی لازوال عظمت

”جب میں اسکا شش پر غور کرتا ہوں جو تیری قدرت کی کارگیری ہے، اور جب چاند اور ستاروں پر نظر ڈالتا ہوں جو تو نے منظم کئے ہیں، تو سوچتا ہوں کہ انسان کیا ہے جو تجھے اس کا خیال ہو، اور ابن آدم کیا ہے جو تو اس کو باریابی بخشے، تاہم تو نے اس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز فرمایا ہے“ (انجیل، حمد ۵: ۳)

قدیم عبرانی حمد کی یہ پاکیزہ شاعرانہ عبارت انسان کی بے بضاعتی اور نیز اُس کی عظمت کا خیال نہایت واضح الفاظ میں ظاہر کر رہی ہے۔ جب انسان رات کے وقت عالم بالا کی حیرت انگیز اور لامتناہی وسعت پر نظر ڈالتا ہے اور اس فضا کے بسیط میں چاند اور ستاروں کو اس شان و شوکت کے ساتھ درخشاں دیکھتا ہے تو اس پر اپنی بے بضاعتی اور مناظر فطرت کے رعب و جلال کی ایسی کیفیت ... طاری ہو جاتی ہے کہ بے ساختہ اپنے عجز و نیاز کا اس طرح اقرار کرتا ہے۔ ”انسان جو ایک ذرہ بے مقدار ہے اس کا تجلو کیوں خیال ہو، اور تو کیوں ابن آدم کو باریابی بخشے“ یہ اُس کا جذبہ اولین ہے، لیکن اس کے بعد ہی کوئی چیز اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے جس سے اس کی یہ ظاہری بے بضاعتی اور کم لگی ستاروں کی عظمت سے بھی زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ اس طرح اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے ”تاہم تو نے اُس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز فرمایا ہے“

قدرت کی عظمت اور بالخصوص عالم بالا کی غیر محدود وسعت اور شان و شوکت کے مقابلہ میں انسان کی بے بضاعتی کا خیال ہر زمانہ میں زبان زد خلائق رہا ہے اور آج بھی ہے۔ آج جبکہ فلکیات کے متعلق جدید انکشافات نے فضا کے بسیط کی وسعت و عظمت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس کا حمد عتیق کے مفکرین تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اس وقت سے انسان کی بے بضاعتی اور زیادہ متوقع ہو گئی ہے

جس وقت قدیم عبرانی مصنف نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو کیا دیکھا؟ ایک وسیع فضا جس کو وہ آسمان کہتا تھا، جو خیمہ کی طرح زمین پر چھایا ہوا تھا جس میں سورج، چاند اور ستارے کسی پُر اسرار طریقہ سے جڑے ہوئے تھے، جن کی



علت خالی صرف یہ تھی کہ وہ انسان کو موسموں کی تبدیلی کے نشانات بتلائیں اور زمین کو روشنی دیں، سب زمین کے چاروں طرف گھومتے تھے، اور زمین کے مقابلہ میں بہت ہی چھوٹے تھے اور عبرانی مفکر کے علم میں زمین کائنات کی سب سے بڑی چیز تھی اور وہ بھی اس کے تصور کے مطابق ہماری آج کی زمین کے مقابلہ میں بہت ہی محدود تھی علم ہیئت کی جدید ترقی نے ان تمام خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کیونکہ نہ تو وہ اجرام فلکی کا مرکز ہے اور نہ کائنات میں سب سے بڑی چیز ہے بلکہ برعکس اس کے جسامت کے اعتبار سے موجودات میں اس کی نسبت حیثیت ایک ذرہ سے زیادہ نہیں۔ خاموش پراسرار اور تغیر پذیر چاند ایک زرد آسمانی چراغ کے بجائے کرہ میں تبدیل ہو گیا، سورج زمین کے چاروں طرف گردش کرنے کی بجائے قائم ہو گیا اور زمین معد دیگر ستاروں کے اُس کے گرد گھومنے لگی، ستارے خلعل شب کی بجائے عظیم الجثہ کرؤں میں منتقل ہو گئے جن کے گرد بڑی بڑی دنیاؤں چکر لگاری ہیں۔ اگرچہ خود ہمارے نظام شمسی کی وسعت بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن وہ بھی غلا کے ایک قلیں ترین گوشہ میں واقع ہے جبکہ اُس کے گرد و پیش لاکھوں اور لاکھوں نظام شمسی پھیلے ہوئے ہیں

پھر اگر دنیائے قدیم کے انسان کو اپنی اُس قلیں کائنات کے مقابلہ میں اپنی بے بضاعتی اور عجز کا اقرار تھا تو دنیا کے جدید کے انسان کے بارہ میں کیا کہا جاسکتا ہے جو جدید علم ہیئت کی ظاہر کردہ کائنات کے درمیان رہتا ہے اور جس کو قدیم عبرانی کائنات سے وہی نسبت ہے جو آفتاب کو ذرہ سے ہے

پھر جس طرح اس عہد میں انسان اپنی بے بضاعتی کا احساس کرتا تھا بالکل اسی طرح آج بھی وہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا لاکھوں کائنات خالق اور ان تمام ستاروں اور کہکشاؤں کا تعمیر کنندہ انسان کی پرواہ کرتا ہے؟ کیا اس بات کے فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک ہماری ننھی ننھی جانیں قطرہ شبنم یا حباب دریا سے زیادہ وقیع اہم اور مفید ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس قسم کا تجربہ ہوا ہو گا۔ آپ آدمیوں کی ایک بڑی جماعت کے درمیان سے گزرتے ہیں جن میں سے آپ نے نہ تو پہلے کسی کو دیکھا ہے اور نہ آئندہ دیکھنے کی توقع ہے۔ آپ اپنے سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے اور یہ کھیتوں پر اڑنے والے پرندوں کے گروہ سے یا دھوپ میں مجتمع ہونے والے جراثیم سے کس بات میں ممتاز ہیں؟ اگر کرہ قمر سے جو دوسرے کرؤں کے مقابلہ میں دنیا سے سب سے زیادہ نزدیک ہے خواہ کتنی ہی طاقت کی دور بین لگا کر باشندگان زمین کو دیکھا جائے۔ تو کوئی بھی نظر نہیں آسکتا اور یہ فاصلہ پرند، جراثیم اور انسان سب کو مساوی القامت بنا دیتا ہے

آپ کسی شہر میں ایک بلند مقام سے جہاں تک آپ کی نظر جائے اُن ہزار آدمیوں کو دیکھے جو چاروں طرف پھر رہے ہیں تو وہ آپ کو فرش پر بیٹھے والی جیٹیوں سے زیادہ بڑے نظر نہ آئیں گے۔ اور وہ شہر آپ کو دیکھ کا ٹیلہ ملے گا

ہوگا۔ اسی طرح سے آپ دوسرے تمام شہروں، قصبوں، اور دیہات کو قیاس کر سکتے ہیں کہ ان میں مختلف الاقسام جیٹیاں کیا دیں جو کسی دوسرے گڑھ سے نہیں بلکہ اسی گڑھ پر صرف چند میل کے فاصلہ سے ناقابل امتیاز ہیں نسل انسانی کو اپنے ان کارناموں پر بہت بڑا فخر ہے جو اس نے اس دنیا میں کئے ہیں۔ اس کو اپنی زراعت پر تجارت پر، بڑے غظموں کا احاطہ کرنے والی ریلوں پر، سمندروں کو عبور کرنے والے عظیم الشان جہازوں پر، سرنگوں کشیدہ عمارتوں والے شہروں پر، چشم زدن میں گرد زین خبریں پہنچانے والے لاسکی پیغامبروں پر اور بلند پرواز طیاروں پر ناز ہے۔ لیکن اگر مریم اور ذہرہ پر آبادی ہے تو وہاں کے کسی باشندہ کو ان تمام باتوں میں سے ایک بات کا بھی علم نہیں۔ پس اس طرح سے ہماری دنیا کے اہم ترین واقعات صرف ہم ہی تک محدود معلوم ہوتے ہیں اور نقصان بسیط میں ہمارے قریب ترین ہمسایوں کو ان کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی

پھر اگر ہم ایک ہی نظام کے دیگر اراکین سے اس قدر بے تعلق ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ نہ تو ان کو معلوم ہوتا ہے اور نہ ان کے واسطے کوئی اہمیت رکھتا ہے، تو ان تمام دیگر نظاموں کے بارہ میں کیا کہا جاسکتا ہے جو ہمارے مختصر نظام شمسی کے حد سے باہر یا غیر محدود فاصلوں پر واقع ہیں اور شب تاریک میں اقصائے عالم کو منور کر دیتے ہیں اور پھر اس بے نیاز ہستی کے متعلق کیا خیال کیا جاسکتا ہے جو ان سب کا خالق اور حاکم ہے؟ ایسے ایسے اہم اور غیر مختتم انتظام کی موجودگی میں اس خالق اکبر کو انسان جیسی بے ثبات مخلوق کا کیا خیال ہو سکتا ہے جو اس خاکریز پر آباد ہے جس کو دنیا کہتے ہیں اور جو آفرینش کے ایک دور افتادہ اور حیرت کو مشہ میں ایک دھندلے نشان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی؟ کیا یہ فرض کر لینا حقیقت میں ایک نامناسب خود ستائی نہ ہوگی کہ ہم اُس کی توجہ کو اپنی طرف منطقت کرنے کی توقع کر سکتے ہیں! علاوہ بریں کیا ایک ہم جیسی بے وقت مخلوق کے لئے موت کے بعد ایک حیات ابدی کا خواب دیکھنا ایک بہت بڑا گستاخانہ قیاس نہ ہوگا،

اسی طرح سے علم ہیئت کے جدید انکشافات بہت سے دماغوں پر انسان کی ذلت و حقارت کا نقش جمادیتے ہیں اور اس سے قبل انسان کا ثبات جس جو کچھ اپنی وقت اور اہمیت سمجھتا تھا اس کا استیصال کر کے اس کی بے بضاعتی اور بالوسی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہے یہ مسئلہ محض قیاسی نہیں ہے بلکہ ہمہ وجہ علی ہے۔ دنیا میں اس قسم کے سوالات آج ہزاروں جگہ پوچھے جاتے ہیں اور ہمارے چاروں طرف پوچھے جا رہے ہیں اور بہت سے ذی فہم اور سنجیدہ لوگ ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی زندگیوں حقیقتاً تاریک ہو جاتی ہیں۔ اور کیا اور حقیقت خود ہم میں سے بعض لوگوں پر ایسے لمحے نہ گزرے ہوں گے۔ جب اس قسم کے خیالات ان پر مسلط ہوئے ہوں۔ اس لئے ہمیں اس تاریک پردہ کو اٹھا کر حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

اس مسئلہ پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ اول یہ کہ کسی چیز کی اہمیت کا دار مدار محض جسامت پر نہیں ہوتا۔ ہماری دنیا کسی دوسری لاکھوں گنی بڑی دنیا سے لازمی طور پر اہمیت میں کسی طرح کم خیال نہیں کی جاسکتی اور انسان بھی محض اپنی جسمانی قلت کے باعث مادی حیثیت سے بھی لازمی طور پر غیر اہم تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسی انسان سے بہ لحاظ جسامت کے بہت بڑا ہے لیکن اس کی جسمانی حیثیت اس کی اہمیت اور وقت کو نہیں بڑھاتی دنیا کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ممالک اپنے سے سیکڑوں گنا بڑے ملکوں سے اہمیت اور وقت میں کہیں زیادہ ہیں ہزار ہا ریگستانوں کے مقابلہ میں یونان کا چھوٹا سا ملک زیادہ وسیع ہے۔ اور لندن جو دس زمین پر ایک خال کی مانند ہے قطبین کے ایک درجن براعظموں سے افضل ہے۔ ایک تنہا افلاطون، یا شکیتیر، یا ستر، یا بودھ دنیا کی تاریخ میں افریقہ کی تمام وحشی نسلوں سے اسی طرح زیادہ قابل قدر ہے جس طرح ایک ہیرے کا ٹکڑا ایک کوہ پیکر تو دھاک سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسی طرح مختلف دنیاؤں کا موازنہ کرتے ہیں یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ چھوٹی دنیا بڑی دنیا سے بدرجہا زیادہ ترقی یافتہ ہو۔ ہمارا سورج باعتبار مادیت زمین سے تین لاکھ سولہ ہزار گنا زیادہ ہے اور لحاظ جسامت کے بارہ لاکھ بچا س ہزار گنا بڑا ہے تاہم زمین پر اسے قسم کی زندگی پائی جاتی ہے جبکہ سورج میں غالباً کسی قسم کی حیات موجود نہیں ہے اور گمان غالب ہے کہ فضا کے بیضا میں جس قدر بڑے ثوابت ہیں۔ وہ عام طور پر اپنے ستاروں سے بہت کم ترقی یافتہ ہیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نسل انسانی محض ایک ناچیز کرہ پر آباد ہونے کے باعث لازمی طور پر ناچیز اور غیر اہم نہیں ہے۔ کیونکہ ایک ایٹمز جیسے چھوٹے مقام پر رہنے والا انسان محض اس وجہ سے حقیر نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ ناچار جیسے وسیع ملک میں رہنے کی بجائے ایٹمز جیسی چھوٹی جگہ میں رہتا ہے۔ اعلیٰ فطرت والی ممتاز ہستیاں چھوٹے جسم میں بھی اس خوبصورت چھوٹی سی دنیا پر اسی احسن پیرایہ میں بسر کر سکتی ہیں جس طرح کہ چھ ہزار فٹ کے جسم میں کائنات کے بڑے سے بڑے کرہ پر کر سکتی ہیں

بہر حال اگر ایک طرف یہ بات مسلم ہے کہ علم حیثیت کی موجودہ تحقیقات انسان کو ایک موضعیف ثابت کر رہی ہے تو دوسری طرف اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ طبیعیات کے دیگر اکتشافات کا فیصلہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ سطح انسانی سے بچے ایک اور مکمل اور منظم کائنات معرض ظہور میں آ رہی ہے۔ جو کائنات بالائی سے کسی طرح کم حیرت انگیز نہیں ہے، اسلئے اگر ایک علمی تحقیقات نے انسان کا تہہ کم کر دیا ہے تو دوسری علمی تحقیقات نے اسکو ای قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ کر دیا ہے۔ پس اس طرح سے دور بین نے انسان کی قدر و منزلت میں جو کچھ کمی پیدا کر دی تھی خود بین نے اسکا ہزار گنا نقصان دہ نقصان کی ترتیب و عظمت کے متعلق بعض حقائق کا انکشاف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر موسم گرما میں ایک تیرتری کو بکڑ لیں تو اس کے پروں سے ایسے ذرات چھوٹ کر ہمارے ہاتھ پر لگے رہ جائیں گے

جن کو ہم معمولی خاکریزوں سے تعبیر کریں گے اور چشم عریاں سے نہایت غور کے ساتھ مشاہدہ کرنے کے بعد بھی ہم ان کو مائی ذرات سے متمیز نہ کر سکیں گے۔ لیکن اگر ہم ایک خوردبین سے اُن کا معائنہ کریں تو عجیب و غریب مناظر دکھائی دیں گے اب ہم کو یہ معلوم ہو گا کہ وہی خاکریز سے مختلف لادوں و ادماغ پروں سے ایسے مکمل نظام کے ساتھ منظم ہیں جیسے کسی زندہ کبر ہوئے ہیں اور اس قدر چھوٹے.... کہ ایک مربع انچ میں ایک لاکھ آسکتے ہیں

ایک قطرہ آب کی کیا بضاعت ہے لیکن یہی قطرہ آب ایک جداگانہ دنیا ہے۔ ایک کمب انچ آب ساکن میں قریب ۱۰۰ ارب کے متحرک اور زندہ مخلوق پائی جاتی ہے۔ نیویارک کے ایک ممتاز ماہر علم الحیات کا بیان ہے کہ "میں نے تھوڑا سا ارڈنی کا صاف اور جو شیدہ پانی ایک شفاف شیشی میں بھر کر کپڑے کے برش کے چند بال توڑ کر اُس میں ال دیے، چار روز کے بعد شیشی بے شمار اور ناقابل تجزیہ زندہ مخلوق سے بھر گئی اور بلاخوف تردید یہ دعوے کیا جاسکتا ہے کہ دو ڈانس کی شیشی میں اُن کا شمار اُن تمام انسانوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھا جو زمانہ آدم سے اس وقت تک پیدا ہو چکے ہیں"

اگرچہ ایک مشہور جرمن ماہر حیاتیات کا قول ہے کہ بوہیمیا میں آٹھ فٹ کی گہرائی تک چالیس مربع میل میں سلیٹ کا ذخیرہ موجود ہے جس کے ہر ایک کمب فٹ میں خوردبینی پیالیش کے ذریعہ سے اکتالیس ارب کا پسماندہ ریافت کیا گیا ہے۔ جہاں چشم عریاں کو حیات کے آثار تک نظر نہیں آتے وہاں خوردبین کے ذریعہ سے نئی نئی دنیا بے آباد معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں کل تک ایک ذی حیات بھی موجود نہ مانا جاتا تھا وہاں آج جدید سائنس نے ایسے حیرت انگیز عالم حیات پیش نظر کر دیے جیسے دُور بین کے ذریعہ سے فضا کے بسیط میں نظر آتے ہیں، اور جن میں انسان سے اسی قدر چھوٹی مخلوق آباد ہے جس قدر انسان ان اجرام فلکی سے چھوٹا ہے

درخت ایک کائنات ہے اور برگ درخت اس کی ایک دنیا ہے۔ آپ کی عریاں اور غیر مانوس آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی، لیکن اگر آپ ایک خوردبین بیکر کسی ماہر طبیعیات کو اپنا رہبر بنائیں تو وہ آپ کی آنکھوں سے حجاب اٹھا کر ایسے عجیب و غریب راز ہائے سرسبز کو بے نقاب کر دے گا کہ آپ کو اپنے گرد و پیش کھلے ہوئے دروازے نظر آئیں گے جن میں داخل ہو کر آپ قدم قدم پر ایسی ہی لانتہا اور تعجب خیز چھوٹی چھوٹی دنیا میں مشاہدہ کریں گے جیسی کہ دور بین کے ذریعہ سے فضا کے بسیط میں نظر آتی ہیں

خود انسان کا جسم بھی ایک کائنات ہے۔ انسانی خون کے ہر قطرہ میں دو کروڑ سے زیادہ جراثیم حیات پائی جاتی ہیں۔ اس طرح سے تمام قطرہ ہائے خون ملا کر انسان ایک کائنات ہے اور اس کی شرائط کمکشاں ہیں جن کے حلقوں میں ان سیارہائے احمر کے گردہ اپنے غیر مختتم ہر لگا رہے ہیں

الغرض اگر ہم انسان کی روحانی حقیقت سے بھی کوئی سروکار نہ رکھیں اور اس کو محض ایک کرم ماوی ہی تصور

کریں تب بھی وہ خدا کی مخلوق میں درجہ متوسط کا مستحق ہے۔ اگر بالائے انسان اُس سے بدرجہا بڑے عالم، نظام اور کمکشاں موجود ہیں تو زیریں انسان اور اندرونی انسان میرے بھی اسے بدرجہا چھوٹے عالم، نظام اور کمکشاں موجود ہیں اگر ایک طرف فضائے بسیط کی بے پایانی اس کی وقت کو گھٹاتی ہے تو دوسری طرف برگ درخت، قطرہ خون اور خود اس کے مادہ ترکیبی کی لا انتہائی اس کی منزلت کو بڑھاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی جسامت کی بنا پر ہماری تحقیر کرے اور انجم دار آسمان کی طرف اشارہ کر کے یوں طعنہ دن ہو کہ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ ان بعید از شمار دنیاؤں کا خدا آپ کی پرہیزگار ہے تو ہم اس کو ایک قطرہ آب کے گرد و درون کیڑوں کی طرف اشارہ کر کے یہ جواب دے سکتے ہیں کہ وہ خدا جو ان کو فراموش نہیں کرتا ہم کو کیونکر فراموش کر سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ انسان کی حقیقی عظمت مادی لحاظ سے نہیں ہے بلکہ روحانی اعتبار سے ہے۔ انسان کی جو کچھ وقت ہے۔ وہ اس کے دماغ کی وجہ سے ہے نہ کہ جسم کی وجہ سے، اس لئے اگر اس کے بہنے کی دنیا چھوٹی ہے تو کیا اور بڑی ہے تو کیا۔ کیا ایک مادی عرض و طول سے محدود کوہ تمثال تو دھواک ایک عرض و طول سے مبرا اور مادی حدود سے منزہ نفس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ کیا مادہ کے ایک سر بفلک کشیدہ ڈھیر کے مقابل میں روح عجوب و سرنگوں ہو سکتی ہے؟ کیا ایک پہاڑ کو خیال سے بڑا کہہ سکتے ہیں؟ کیا ایک بڑے سے بڑا سمندر اس انسانی دماغ پر تفوق حاصل کر سکتا ہے جو اس کو اپنے تصور میں محصور کر لیتا ہے، اس کو شاہروں میں منتقل کر دیتا ہے، اس کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر اس طرح پر گفتگو کر سکتا ہے گویا کہ اس کے ہزار ہا میل محض چند انچوں کے برابر ہیں، اور اس کی خوفناک ترین لہروں کو اپنا فلام بنا لیتا ہے؟ اور کیا وہ تمام دور بین سے ظاہر کی ہوئی غیر شعوری دنیا میں ایک شعوری دماغ کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھ سکتی ہیں؟

فلکیات جدیدہ کے انکشافات اجرام فلکی کے درمیان اس دنیا کی قدیم اہمیت کو خواہ کتنا ہی گھٹا دیں لیکن وہ اس وقت تک انسان کی عظمت کو کوئی ٹھیس نہیں لگا سکتے جب تک اُس میں قوت شعور موجود ہے۔ انسان کی عظمت اس کی فطرت میں ودیعت کی ہوئی طاقت کی بدولت ہے۔ اس لئے وہ سائنس کی تمام امکانی مادی تحقیقاتوں سے غیر متاثر ہو وہ محض اس لئے بڑا ہے کہ وہ جان سکتا ہے، استنباط کر سکتا ہے، حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے، امید کر سکتا ہے محبت کر سکتا ہے عبادت کر سکتا ہے اور یہ چیزیں وہ اس لئے کر سکتا ہے کہ وہ روح ہے۔ لیکن دُور بین کی ظاہر کی ہوئی بڑی سے بڑی دنیا محض ایک تو دہ مادی ہونے کے باعث ان میں سے ایک کام بھی کرنے سے ایسی ہی معذور ہے جیسے کہ ایک ہوا میں اُڑنے والا حیرت کپڑا یا خاکریزہ معذور ہے اور اسی سے انسان کی اُس لاتحد و دور اور لازوال فضیلت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس کو فضائے بسیط میں عظمت و شان سے چمکنے والے تمام لاتعداد اور عظیم الجثہ کرؤں پر حاصل ہے

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انسان کا فضائے بسیط میں منتشر ستاروں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جانا اس کی حقارت کی

ملا مت نہیں ہے بلکہ بزرگی کا نشان ہے۔ ایک سنگریزہ یا ایک میٹھا ڈھیلا کیا حیرت زدہ ہو سکتا ہے محفلِ ثوابت و ہم سیار گاہ کو دیکھ کر ایک وحشی درندہ میں کوئی جس تک پیدا نہ ہوگی۔ وحشی درندہ اس لئے بے جس ہے کہ اس میں قوتِ خصور نہیں ہے اور انسان اس لئے حمد و ثنا کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے، سمجھتا ہے، محسوس کرتا ہے، اور اس کی لطیف روح عالمِ قدس کے ساتھ التزام رکھتی ہے۔ دنیا کا تصور دنیا سے بہتر ہے اور ستاروں کا علم ستاروں سے برتر سورج جسامت میں بہت بڑا ہے اور اُس کی جسامت کے مقابلہ میں زمین بالکل بے حقیقت شے ہے، لیکن اس سے انسان کی حقیقی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیا سورج باوجود اس قد و قامت کے خود اپنی بیابا لیش کر سکتا ہے اپنا وزن جان سکتا ہے، فضائے بسیط میں اپنے دائرۃ البروج کا اندازہ کر سکتا ہے یا اُن قوانینِ قدرت میں سے جن کی وہ کورانہ پابندی کر رہا ہے ایک قانون کو بھی سمجھ سکتا ہے، لیکن انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اس لئے وہ باوجودِ ند و قامت میں چھٹ ہونے کے سورج سے بڑا ہے

علمِ ہیئت ہم کو ستاروں کا بہت کچھ حال بتاتا ہے لیکن کیا ہم کبھی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ ہم کو اسی قدر انسان کا حال بھی بتلا سکتا ہے۔ انسان کا دماغ ہی نہیں کہ علمِ الافلاک کی روز افزوں ترقی کا ساتھ دینے کی قابلیت رکھتا ہے بلکہ وہ اس کی ترقی کا سبب ہے۔ اگر سموات خداوند تعالیٰ کی قدرت کے مظاہرات ہیں تو وہ اسی قدر انسانی روح کی عظمت کے بھی نشانات ہیں کیونکہ انسان محض اپنی روحانی فضیلت ہی کے باعث کائنات کے ذرہ ذرہ میں قدرت کے جلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے

کائنات کی تخلیقی طاقتیں خیال اور محبت ہیں اور چونکہ انسان ان دونوں صفات سے متصف ہے اس لئے وہ خالق ہے

چینگ کا قول ہے کہ تمام انفس ایک ہی سلسلے سے ملتی ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو میرا وجود بھی وجودِ حقیقی سے متصل ہے۔ اس کا مطلق نے میری ہستی کو محض پیدا ہی نہیں کیا ہے بلکہ میرا اس کے ساتھ رشتہٴ قرابت ہے کیونکہ میری روح روحِ حقیقی سے مشتق ہے۔ میں بھی اسی طرح جانتا ہوں جس طرح سے وہ جانتا ہے اور اسی طرح سے محبت کرتا ہوں جس طرح سے وہ محبت کرتا ہے، اس لئے مجھے جس طرح اُس "خودِ سموات والارضی" کے مشابہہ جلال کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح یہ کہنے کا بھی حق حاصل ہے کہ تو میرا حقیقی باپ ہے اور میں کوئی تیری از دست افتادہ چیز نہیں ہوں بلکہ تیرا بچہ ہوں اور تیری برگزیدہ فطرت مجھ میں موجود ہے

انسانی عظمت کے مستحکم ترین ثبوتوں میں سے ایک ثبوت قطعی اور نئے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے اور وہ ذریعہ "جدید نظریہ ارتقاء" ہے۔ اس سے قبل انسان کا خیال بالکل مختلف تھا اور "ارتقاء" ایک خوفناک شے معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ انسان کی پیدائش کو عملِ فطرت سے منسلک کرتا تھا اور اس کی موجودہ نئیافتہ ہیئت کذالی

کو ادنیٰ قسم کی حیات سے مستلزم کرتا تھا اور اس لئے وہ تذلیل انسانیت کا باعث سمجھا جاتا تھا، لیکن اب یہ سب باتیں بدل گئی ہیں اور بڑے بڑے ارباب فکر اس حقیقت کو تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ نظریہ ارتقاء نے انسان کی عظمت میں غیر محدود اضافہ کر دیا ہے۔ چونکہ انسان لاریب تمام سابقہ مدارج ارتقاء کی حد کمال ہے اس لئے وہ اس تمام عمل فطرت کی معقول ترین اور مناسب ترین نوع پر پیش کرتا ہے۔ عمل ارتقاء اپنی اتنی حالت کی ابتدا سے دور دراز راستے طے کر کے اس منزل پر پہنچا ہے جو آج ہماری پیش نظر ہے لیکن اس نے ہمیشہ آگے ہی کو قدم بڑھایا جو جس کی معراج انسان ہے۔ غیر ذی حیات سے ذی حیات تک، ادنیٰ قسم کی حیات سے اعلیٰ قسم کی حیات تک اور حیوان سے انسان تک سلسلہ سلسلہ گامزن ہوا ہے اور اس طرح انسان آفرینش کی بلند ترین منزل پر پہنچ گیا ہے جو آفرینش کا نصب العین اور منزل مقصود ہے۔ جس وقت مادی جسم اپنی اسکانی حد تک پہنچ گیا اس وقت نفس کی ابتدا ہوئی جس نے اسی وقت سے حکمرانی شروع کر دی اور مڈرک انسان کو وہ شرف حاصل ہوا جو صرف مدرک مطلق کی عظمت سے دوسرے درجہ پر ہے

ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ کائنات کی دوسری کتنی دنیاؤں میں عمل ارتقاء ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے جس پر کہ وہ ہمارے یہاں پہنچا ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ ایسا ہوا ہے تو وہاں بھی اُس نے کسی نہ کسی شکل میں انسان ہی کا روحانی منہی پیش کیا ہو گا یعنی کوئی اس قسم کی ہستی پیدا کی ہو گی جس میں انسان کی طرح ایسی قوت ادراک و شعور پائی جاتی ہو جو ”الہی خیالات کو اسی کی طرح خیال کر سکے“ جیسا کہ انسان کر سکتا ہے، جو اس جہان میں ”عمل ارتقاء“ کا ویسا ہی شائد اتمکملہ ہو جیسا اس جہان میں انسان ہے اور جو بدیں سبب کسی صحیح مفہوم میں وہاں پر خدا کا ایسا ہی ہمشکل اور ہم رشتہ ہو جیسا انسان یہاں پر ہے

اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ مادہ اولین کی پہلی حرکت سے لیکر اس وقت تک کائنات کا تمام ”عمل ارتقاء“ اس دنیا میں اور نہ معلوم کتنی اور دنیاؤں میں اسی اذھیڑ میں مصروف رہا کہ انسان یا اُس کا مائل پیدا کرے پھر اگر کائنات اس تمام ”عمل ارتقاء“ کے مصائب و مصارف برداشت کرنے کے بعد ایسی اعلیٰ فطرت کا انسان بنانے میں کامیاب ہوئی ہے تو کیا اس کا انجام بھی اسی مناسبت سے اعلیٰ اور افضل نہ ہونا چاہئے اور کیا اس کی حیات بعد المات عارضی مکان و زمان کی قید سے آزاد نہ ہونی چاہئے؟ کیا ان تمام موجودات کا خالق اکبر اور صانع حقیقی ایسا غیر معقول ہے کہ وہ اپنی کامل ترین مخلوق کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہی نیست دنا بود کرے گا؟ اگر انسان الہی الاصل ہے اور اعلیٰ الہی صفات سے مشرف ہوا ہے تو کیا وہ فنا ہو سکتا ہے اور کیا اس کو ایک ایسی ہی بقا کا وارث نہ ہونا چاہئے جو بقائے الہی کے متوازی ہو؟

لوگ دوسری دنیاؤں، نظاموں اور ہجوم سیارگان کو انسان کی تذلیل و تحقیر کے لئے بطور دلیل کے پیش

کرتے ہیں، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ پر سبقت لے جائے؟ کیا کوئی مادی شے، خواہ وہ جسامت میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، روح پر فائق یا نفس پر غالب ہو سکتی ہے؟

کائنات خدا کا ایک نادر محل ہے۔ لیکن کیا محل اولاد سے زیادہ قیمتی ہے؟ کیا کوئی باپ ایسا ہے جس کے پاس ایک ایسا محل ہو جس کی وسعت شمال سے جنوب تک ہو، جس کی پھٹ لکھشانی نقش و نگار سے منقش ہو اور جس میں لاکھوں آفتاب جگمگا رہے ہوں، اور بے ساختہ نہ پکار اٹھے کہ جگہ اپنا بچہ ان تمام چیزوں سے زیادہ عزیز ہے؟

اس لئے جب میں تنہا رات کے وقت آسمان کے نیچے چلتا ہوں اور اس جبرخ نیلوفری کے محیر العقول اور غیر محدود نقش و نگار کو دیکھتا ہوں تو میں عرش دوام سے آواز آتی ہوئی سنتا ہوں کہ اے وہ انسان جس کو میں نے اپنی ہی خلل پر بنایا ہے۔ تو میری نظروں میں تمام موجودات سے زیادہ عزیز ہو سورج اور ستاروں کی پیدائش سے بھی قبل میں تجھ سے محبت کرنا تھا، جبکہ تو دور افتادہ مقامات پر آتشی کروں کے ٹوارہ میں کھلتا تھا۔ میں اس وقت بھی تیرا نگر تھا، تیرا اور میرا انجام ایک ہے، کبھی تجھ کو کوئی چیز مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ اور جب عالم بالا کی آواز خاموش ہو جاتی تو میں ویسی ہی ایک اور صدا لہوئی اپنی روح کے تنگناہ و جدائی سے آتی ہوئی سنتا ہوں۔ کہ اے میری زندگی کے مالک خدا میں تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں اور میں جس وقت تیرے اس نگار خانہ قدرت کے خوبصورت دیوی محل میں داخل ہوا تو تیرے ہی پاس سے آیا، یہاں نوئے مجھ کو صرف چند سال قیام کی اجازت دی ہے تاکہ میں تیرے ساتھ رہ کر اور تیری امداد سے قدرت کی ان صنعتوں اور نیز اپنی روح... کے عجائبات کا مطالعہ کروں، تجربات زندگی حاصل کروں، حتیٰ الوسع اپنے ہم جنسوں کی مدد کروں اور اپنے دیگر فریض منصبی کو انجام دوں۔ میں ایسی زمین پر عارضی قیام کے واسطے تیرا شکر گزار ہوں۔ میں بہت جلد یہاں سے کسی نامعلوم مقام کو روانہ ہو جاؤں گا جس کا تجھ کو علم ہے۔ مگر میرے لئے یہی امر باعث تسکین ہے کہ میں جہاں کہیں رہوں گا تیرے ہی ساتھ رہوں گا۔ موت صرف تیرے غیر محدود مکان کے دوسرے (دروازے) کھول دے گی۔ اس لئے مجھ کو کوئی ہراس نہیں جہاں تو ہے وہ جگہ خوبصورت ہے حتیٰ کہ دوزخ بھی تیرے ساتھ۔ میرے لئے بہت محفوظ مقام ہے

عبدالکھلیفہ (علیگ) میرٹھ

(رج۔ ٹی سنڈر لینڈ)

## دوادبی شاہکار

(غلاوہ محمول)

شہنشاہ۔ فلسفہ اشوہنہار پر ایک بے مثل تبصرہ میر  
شہنوشی زہر عشق۔ مجلد مع رنگین تصاویر و مین مقامات قیمت میر (غلاوہ محمول)

منیجر نگار لکھنؤ



# مکتوبات نیاز

آرام جاں

کل میاں نثار کا خط ملا اور اس صحبت کا حال معلوم ہوا جو وہاں برپا ہوئی تھی۔ جلیل صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ اصولاً صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن چونکہ حسب حال ہے اس لئے بہت پسند آیا، میاں ذکر کرنے جن الفاظ میں میرا ذکر کیا، ان پر مجھے فخر ہو یا نہ ہو، لیکن رسمِ شکر ادا کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ تم لاکھ کہو کہ مجھے علم نہیں میرا کوئی اشارہ شامل نہیں، لیکن میں تو جانتا ہوں کہ

کار زلفِ تست مشک افشانی امانتِ حال

مصلحتِ راستہ برآہوئے حبیبِ بستہ اند

بہر حال یہ حقیقت نہ ہو۔ تو بھی منسلکاً یا رعایتاً سر جھکا لو۔ اور مجھ سے یہ پندار نہ چھینو کہ دنیا میں جو کوئی مجھے اچھے نام سے پکارتا ہے، وہ حقیقتاً تمھاری ہی آواز ہے

خاں صاحب

حیران ہوں کہ آپ کی وضع عاشقانہ کی داد دوں، یا آپ کے اخلاق کریمانہ کی، یعنی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا وہ صرف برائے محبت تھا جو میرے لئے مخصوص ہے یا یہ کہ اس نوع کا لطف فرمانا آپ کی فطرت ہے، تعین و تخصیص سے بے نیاز !

نونی مجرم کو بھی ایک بار اظہارِ حال کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ نہ کہ میں جس کا جرم اس سے زیادہ نہیں کہ رات کو دن نہیں کتا اور دن کو دن سمجھتا ہوں۔ بہر حال مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے میری طرف سے اپنی بیزاریوں کا اعلان کر کے برسوں کی پڑی ہوئی گتھی کو سلجھا دیا اور اب میرے لئے وہ الجھن باقی نہ رہی، کہ آپ کو کس صفت میں جگہ دوں

اٹا کہ مجھے آپ کے جذبات پر اقتدار حاصل نہیں، لیکن خدا را، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں اپنے جذبات

کا خون صرف اس لئے کہہ دوں کہ آپ اُن سے متفق نہیں  
میں غریب ہوں اور غریب الذیابھی، جاہل بھی ہوں اور لاجابھی، لیکن کیا کروں، یہ بات کبھی سمجھ میں  
نہیں آتی کہ عقل آپ کی اور اعتماد میرا! جینے کا آخر یہ کونسا طریقہ ہے۔ بہر حال اگر جنس ناکارہ سمجھ کر میرے وجود  
کو نظر انداز کرنا آپ کے لئے ممکن نہیں تو  
سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

حبیب مکرم  
پھلوں کے بھینکنے کی زحمت نہ اختیار کیجئے۔ کیونکہ اول تو میں اتنا شائق نہیں، دوسرے یہ کہ بغیر آپ کی  
میت کے وہ ہضم بھی نہ ہوں گے۔ ہاں ایک صورت مفاہمت کی ہے اور وہ یہ کہ پہلے میں آپ کو یہاں سے  
شریعے بھجوں اور جب آپ اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے میرا شکر یہ ادا کریں تو میں جواب میں لکھوں کہ حضرت  
محض شکر یہ سے کام نہیں چلتا، سفیدہ اور دسہری بھیجئے۔ ہر چند میں پھر بھی زیر بار احسان رہوں گا،  
لیکن کم از کم یہ اطمینان تو مجھے رہے گا کہ جو کچھ کھا رہا ہوں اس کے حصول میں تھوڑی بہت قوت بازو میں نے بھی  
صرف کی ہے۔ آپ باور کیجئے کہ یوں مجھے خاک مرانا آئے گا  
اس لئے کہ فضول خط و کتابت میں وقت نہ ضائع ہو۔ اس عریضہ کے ساتھ ۳۰ سیر شریفوں کی بلیٹی لفوف  
کرتا ہوں۔ اس جوار کا یہ پھل اتنا ہی مشہور و لذیذ ہے جتنا اودھ کا سفیدہ، گو مزہ کے نوعیت کو دیکھتے ہوئے دوڑ  
کا تقابل درست نہ ہو۔ اور ہاں، یہ کہنا بھول گیا کہ یہ پھل آپ کے لئے نہیں بھیجتا۔ بلکہ اپنے بھتیجوں  
اور بھتیجیوں کے لئے بھیج رہا ہوں۔ بھابھی کو بھی چکھنے کی اجازت نہیں

کرم گُسترا

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا

کہ بائے سخن بھی درمیان ہے اور سر چارہ فرمائی بھی! — یعنی خود بھی لطف فرماتے ہیں اور دوسروں  
کو بھی آمادہ کرتے ہیں۔ حیران ہوں کہ وہ خدا جس کے بندے اس قدر بندہ نواز ہوں، وہ خود اتنا بے نیاز ہوا  
بے نیازی سے میری مراد مستغنی اور بے پرواہ ہونا ہے کہ میں مر رہا ہوں اور اسے فکر نہیں، میں ایڑیاں رگڑ رہا ہوں  
اور اوپر سے کوئی تسکین نہیں۔ شاید خدا اور خداوند میں یہی فرق ہوگا اور اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ  
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور کسی

یہ تو خیر سب کچھ ہو گیا، لیکن یہ فرما لے کہ میری طبع اندہ گئیں۔ " کا کیا علاج ہے۔ اگر باوجود ان تمام لطافت و منایات کے میری سوگواریاں بدستور قائم رہیں تو پھر میں کیا کروں گا۔ اس لئے خدا کے لئے کوئی ٹھکانہ تو ایسی رہنے دیجئے کہ میں آپ کو صورت دکھا سکوں۔ — باور کیجئے میں ہرگز سخت نوازش نہیں، مجھ پر احسان کرنا مجھے لانا کہنا ہے۔ — نرد کی خدائی میں رہتا ہوں اور اسی میں جان دینا پسند کرتا ہوں۔ آپ کیوں اپنا دل دکھائیں

جانِ نیاز

قاصد پہونچا، اور دفتہ آپ کا باندہ چلا آنا معلوم ہوا۔ اتنی بڑی قربانی اور میرے لئے ! اُف آپ کی جس محبت سے جان بچا کر میں یہاں چلا آیا تھا، وہ اب اس خطرناک حد تک پہونچ گئی !  
 دے دارم خراب اذا التفات چشم بہارت  
 ہمہ از جور می ترسند و من از لطف بسیار

میری مجبوریاں آپ سے مخفی نہیں، اس لئے اب آپ ہی بتائے کہ ان حالات میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں وہاں آکر آپ پر سے قربان ہو جاؤں، لیکن یہاں آپ کو بلانا امکان سے باہر ہے، اگر آپ کا بے گدھ سے چلانا نیز اجازت کے ہوا ہے تو بھی واپسی میں حرج نہیں، زیادہ سے زیادہ دو چار اشکِ ندامت کافی ہوں گے۔ اور اگر اجازت حاصل کر لی گئی ہے تو پھر کوئی بھگڑا ہی نہیں۔

اول تو مجھے یقین نہیں کہ مہاراج کی حقیقت کا علم ہو گیا ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو صبح باور کر لیا جائے تو بھی حقیقت سے انکار " آپ کے لئے چنداں مشکل نہیں۔ آنسو بہا کر نہ سہی، پھر کر، بگڑ کر، تیوریوں پر بل ڈال کر سہی

میں خود باندہ آکر آپ سے زبانی گفتگو کرتا، لیکن وہاں میرا نامناسب نہیں اس لئے اب چارہ کار بجز اس کے کیا ہے کہ پھر وہیں واپس جائے، اور مجھے اطلاع دیجئے کہ کیا رنگ ہے۔ ممکن ہے زحمت ختم ہونے پر میں بھی حاضر ہو جاؤں گو بظاہر اس کی امید کوئی نہیں

ظالم، اب کیا پوچھتے ہو کہ یہ سب کیونکر ہوا۔ —

شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی خشک ہوا چل رہی ہے، محل کے پائیں باغ میں روشوں پر نسل رہا ہوں، مہاراج کی طلبی کا انتظار ہے۔ — دفتہ سامنے ایک مجسمہ حسن و رعنائی نظر آتا ہے۔ — ذی حیات، متحرک، نگراں،

خنداں ! ٹھیک اس وقت چوہدار آتا ہے اور میں چلا جاتا ہوں — لیکن یہ دو چیزیں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ ہلکے سانولے رنگ میں خفقت کا انکاس، اور طاؤس کی سی رختار!

اے جمال تو بہ تاراج نظر ہاگستاخ

اے خرام تو بہ پامالی سراگستاخ

بست کی صبح ہے، دربار میں رسم گلابازی کی طیاریاں ہو رہی ہیں، گلاب اور گیندے کے سُرخ و زرد پھولوں سے آئینِ ممور ہیں، مہاراج برآمد ہوتے ہیں اور درباری راگنی کے ساتھ ہی یہ رسم شروع ہو جاتی ہے۔ تم کبھی آؤ گے تو دکھاؤں گا کہ اُس بھول کی بکھر مٹی اب تک میرے پاس محفوظ ہے جو میرے سینہ پر پڑ کر ہمیشہ کے لئے ایک زخم چھوڑ گیا — آہ،

کتانِ خولیش می شوم بہ متاب

خیر یہ تو وہ باتیں تھیں جن کا ذکر کچھ افسانوں ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن قمر تو یہ ہے کہ میں اس سے زیادہ کچھ لکھ بھی تو نہیں سکتا

رگ سنگم شرارے می نویسم

کفت خاکم غبارے می نویسم

رہا انجامِ نتیجہ سواب اس کے متعلق کیا عرض کروں

غالب نے ایک جگہ بنارس کا حال بیان کرتے ہوئے وہاں کی ”قیامتِ قامتیں مڑنگاں درازاں“ کا ذکر اس طرح کیا ہے

زرنگیں جلو ہا غارِ تگر ہوش

بہارِ بستر و نور و آغوش

سواگر مجھے یہ ڈرنہ ہوتا کہ تم رشک و حسد سے مر جاؤ گے تو میں بھی اس شہر کا دوسرا مہرِ مہرہ کرنا خوش ہو جاتا — لا حول و لا قوہ، میں بھی کس قدر نود و مل ہوں کہ ایک جھوٹ ختم نہیں ہوتا اور دوسرا شروع کر دیتا ہوں یقین کرو کہ یہ سب افسانہ نوازی کے سوا کچھ نہیں — تم میری ”سازگاریِ بخت“ سے ابھی طرح واقف ہو، اگر حقیقتاً ایسا ہو بھی تو یقین کرنے کی بات نہیں

لا حول و لا قوہ، تم بھی کس درجہ پست ہمت واقع ہوئے ہو۔ صبح بہار میر نہیں، تو شب ماہ میں کیا بُرائی ہے، جلوہ سیرت کا فقدان ہے تو ہونے دو۔

خیم دلف و شکن طرف کلا ہے دریاب

نعت ہے تمکاری جوانی پر اور حیف ہے تمہارے شباب پر۔ گفتگو اصولی شروع ہو جائے گی اور غالباً ذاتاً تک پہنچ جائے، اس لئے خاموش رہتا ہوں، ورنہ کتنا میرے خفیب و انحطاط سے اپنا شباب و عروج بدل لو، یا پھر اپنا نسب مجھے دید، کہ کوئی ایک تو مکمل ہو جائے۔ مجھے فرصت نہیں ورنہ وہاں پہنچ کر بجائے مقال کے عمل سے اس نظریہ کی اہمیت ثابت کر دیتا

ہمارے ”سیلم چشتی“ کیسے ہیں۔ اگر ملاقات ہو تو کہدینا کہ ”نغمات“ کا نسخہ میرے پاس سے کہیں گم ہو گیا، مولانا جامی کے دستخط اگر اس پر ثبت نہ ہوتے تو بھی افسوس کرنا چاہئے تھا، لیکن اگر آج ملک الموت میری ہی روح قبض کرنے آجائیں تو کیا وہ مجھے بچا سکتے ہیں

بھالند، میں صبح و تندرست ہوں اور اسی لئے آپ کی صحت و عافیت کا طالب، ورنہ یوں بیمار پڑ جائے

تو میں چاہتا ہوں کہ ساری دنیا میری طرح کراہنے لگے

آپ کی پرسش حال کا شکریہ، لیکن یہ آپ سے کہ کس نے دیا کہ میری حالت اس قدر سقیم ہے، اور پھر یہ کہ آپ کو میرا اتنا بڑا ہمدرد کیونکر جان لیا کہ ساری دنیا میں آپ ہی پر اس کی نظر انتخاب پڑی

اگر یہ صرف بہانہ ہے اجراء مراسلت کے لئے، تو خیر، ورنہ میں اس شخص کا نام معلوم کرنے پر اصرار کروں گا، جس نے یہ شگون بد منہ سے نکالا

مزید یہاں نہیں ہیں، برسوں اجیر گئے ہیں۔ اگر جلد واپس آگئے تو آپ کا پیام پہنچا دوں گا، اور گوشش کروں گا کہ وہ آپ کو یلوس نہ کریں۔ لیکن اگر ان کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مجھے معذرت سمجھئے کیونکہ میں خود آئندہ ماہ کی ابتدا میں بہاں سے باہر چلا جاؤں گا اور غالباً دو ماہ کے بعد واپسی ہو

منظومات کا مجموعہ نہ چھپا ہے اور نہ اس کے چھاپنے کا ارادہ۔ شعر کہنے سے قبل شعر سمجھنے کا سلیقہ نہ تھا اور جب یہ سلیقہ پیدا ہو تو وہ زمانہ گزر گیا۔ میرے بعد لوگوں کو اختیار ہے

مذاکرات نیاز۔ یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کرنا اخیر تک پڑھ لیتا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں قیمت ۱۲ (معاذہ محمول)

فلاسفہ قدیم۔ اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روجوں کیساتھ ۲) ملوین کا خرباب (۳) حرکت کے گزرنے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت ۵ (معاذہ محمول)

شیخ ننگار لکھنؤ

# بیراگ کا بروگ

(۱)

راجپارہی آئینہ کے سامنے ہلکے بنفشی رنگ کی ساری پہنے بیٹھی ہوئی تھی، کنیزیں اسے سنوار رہی تھیں۔  
لبے لبے بال سچائے جا رہے تھے اور ان کی باتوں پر جو وہ کبھی ہنس پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئینہ کے اندر بجلی  
کی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس وقت محل کے اس حصہ میں تھی جو اس کی خلوت و آدادی خلوت کے لئے مخصوص تھا  
اس کا نام کلا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کنول ہی کی طرح — اُس کنول کی طرح جو سطح  
آب سے اوجھڑا ہو کر پتلی سی شاخ پر کھلتا ہے۔ نازک اور بچلی تھی

اس نے پشت کی طرف کرسی پر اپنی ہنس کی سی گردن ڈال دی، موتیوں سے مانگ بھرے کسے کنیز نے اپنا  
زریں طرف سنبھالا اور راجپارہی گنگنائے گی۔ اس کی آوازیں ایسی بھنکار تھیں جیسے چاندی کے برتن پر کوئی  
ضرب لگا دی جائے۔ کچے موتیوں کے باریک باریک ڈرتے اور مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے بالوں  
کے اندر ایسے نظر آتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں —

اس نے ایک آہ کے ساتھ گردن اٹھائی اور آئینہ کے سامنے بکھرے ہوئے بالوں کو سینٹی ہوئی، سینہ کے ہار  
کو سنبھالتی ہوئی بولی: — ”تم نے تو آج مجھے تھکا دیا“ کنیزیں پیچھے خاموش کھڑی ہوئی  
مسکرا رہی تھیں — راجپارہی نے دفتہ پلٹ کر دیکھا اور ان سب کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر خود بھی ہنس  
پڑی۔ کسی نے جلدی سے ساری کا آئینل سنبھال کر اس کے شانہ پر ڈالا، کسی نے ماتھے پر سرخ بندی لگا دی اور  
کسی نے زرکار اٹلس کی جوتی پاؤں میں پہنائی اور کلا آئینہ میں ایک اچھٹی ہوئی نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی  
کلا راجہ جلدیس پور کی لڑکی تھی اور راجپوتانہ بھر میں کوئی راجپارہی اس کے حسن و جمال کو نہ پہنچتی تھی  
کما کرتے تھے کہ راجپارہی کلا کے اندر تو سر سونی دہوی نے جنم لیا ہے۔ اوزلا ہر ہے کہ ملک کے نوجوان جو کوئی توقع  
اس کی طرف سے قائم نہ کر سکتے تھے یہ نہ کہنے کو کیا کرتے

(۲)

بلداؤچی کا مندر رتن گڑھ کا تاریخی مندر ہے اور اپنی وسعت تعمیر کے لحاظ سے بھی خاص شہرت رکھتا ہے۔ ہر سال یہاں پھاگن کی پورنماشی کو بڑا میلہ لگتا ہے اور دور دور سے لوگ جاترا کرنے آیا کرتے ہیں۔ مندر کے چاروں طرف فقیروں اور سادھوؤں کے قیام کے لئے مسلسل کوٹھریاں ہیں۔ اور ان کے سامنے چاروں طرف برآمدہ بنا ہوا ہے، جہاں تہنیا کرنے والے اور دنیا کو حج دینے والے سادھو گین دھیان میں مصروف نظر آتے ہیں صبح کا وقت ہے اور سیکڑوں عورتیں تھالیوں میں رنگ برنگ کے پھول رکھے ہوئے پوجا کے لئے آ جا رہی ہیں۔ مندر کی پشت پر جہاں نسبتاً بہت کم ہجوم ہے، راجکاری کھلا اپنی دو کنیزوں کے ساتھ کھڑی ہوئی آئے جانے والوں کو دیکھ رہی ہے، متعدد تھالیاں پھولوں سے بھری ہوئی صحن کے گوشہ میں رکھی ہوئی ہیں۔ اور اس بات کا انتظار ہو رہا ہے کہ ہجوم کم ہو تو یہ پھول بھی شیوجی کے استھان پر چڑھا دئے جائیں۔ کھلا کا معمول تھا کہ وہ کبھی کبھی شہر کی دوسری عورتوں کی طرح یہاں آتی اور آدادی کے چند لمحے بسر کر کے چلی جاتی۔ ہر چند بعض بچاریوں اور پتہ توں کو اس کا علم تھا، لیکن آج تک وہ کبھی یہ نہ معلوم کر سکے تھے کہ وہ کب آتی ہے اور کب چلی جاتی ہے راجکاری کھلا تھک کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور رکنی اور لیلا وٹی سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی۔ راجکاری کھلا لے مسکراتے ہوئے کہا ”لیلا، سچ بتا جس وقت تو شیوجی پر بھول چڑھاتی ہے تو تیرے دل میں کتنا آرزو ہوتی ہے“

لیلا — ”راجکاری، میں کیا اور میری آرزو کیا“  
رکنی — ”اور آرزو ہو بھی تو کیا، کبھی پوری ہونے تو دیکھی نہیں“  
کھلا — ”دہنتے ہوئے“ رکنی، خوب کہا۔ لیکن کیا میں سن سکتی ہوں کہ تیری کیا آرزو ہے جو شیوجی نے آج تک پوری نہیں کی“  
رکنی — ”افسردگی کے ساتھ“ راجکاری، کچھ نہیں، میں نے تو یونہی ایک بات کہی۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ بغیر بھول چڑھائے بھی ہو جاتا ہے اور جو بات ہونے والی نہیں، وہ کسی طرح نہیں ہوتی، چاہے کوئی لاکھ سرگڑا کرے“  
لیلا — ”پیشانی پر تہودیاں ڈال کر“ کیوں ایسی بات زبان سے نکالتی ہے، پر میٹر اگر سن لے تو نہ جانے کیا کرے“

اسی وقت دو عورتیں قریب سے گزریں۔ ایک دوسری سے کہہ رہی تھی۔ ”بڑے گہائی سادھو ہیں، چرن چھو ہی میرا سب دکھ جاتا رہا، یہ معلوم ہوتا تھا گویا آنکھوں میں نیند سی بھری جا رہی ہے۔ تم بھی جلو کل صبح جل کر دشن

کر لو، وہیں تم سے قریب ہی رام گوپھا میں رہتے ہیں۔“  
کلمارانی دیر تک خاموش کچھ سوچتی رہی اور بغیر بھول جڑھائے ہوئے واپس چلی گئی  
(۳)

ہمارا جہ — ”مجھے سوامی جی کا حال بالکل نہیں معلوم، لیکن تم ان سے ملنا چاہتی ہو تو میں انہیں بیس بلاتا ہوں  
اچھا ہے میں بھی مل لوں گا۔“  
کلمار — ”ہمارا جہ، جو لوگ دنیا چھوڑ چکے ہیں ان سے دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ ملنا مناسب نہیں میں  
ان پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی کہ میں کون ہوں۔“

ہمارا جہ — ”مسکرا کر،“ تمہاری اس آواز طبیعت سے جگدیس پور والے بھی کچھ واقف ہو چکے ہیں۔ اور تمہیں  
معلوم ہے کہ وہ کیسے پڑائے خیال کے لوگ ہیں۔ صرف ایک مہینہ بانی ہے کہ تم انہیں کے بس میں مل گئی  
اس لئے مناسب نہیں کہ ان کو تمہاری طرف سے کسی بُرے خیال قائم کرنے کا موقع ملے۔ محلوں کی ذرا  
سی بات بھی کوٹھوں کو ٹھوں پھرتی ہے۔“

یہ سنکر راجکمار کی کلمار کے چہرہ پر انفعال و برہمی کی ملی ہوئی کیفیت کا ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا۔ اور  
تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد حقیقتاً اس کے انتہائی ضبط و تامل کو ظاہر کر رہا تھا  
بولی — ”سچ ہے ہمارا جہ، لڑکی ہر جگہ لڑکی ہے، خواہ وہ راجہ کے گھر میں پیدا ہو، یا کسان کے بھوپڑے  
میں، عورت کی کمزوری، قدرت کی وہ بے اعتمادی ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں،  
بہتر ہے میں نہ جاؤں گی، لیکن سوامی جی کو بھی یہاں آنے کی تکلیف نہ دیجئے اور تن گڈھ کو جگدیس پور  
نہ بنائیے۔“

یہ کہکر راجکمار کی کلمار جانے ہی والی تھی کہ اس کے باپ نے اس کو روک لیا اور بولا کہ ”کلمار میرا مطلب  
یہ نہ تھا کہ تم وہاں نہ جاؤ، میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی، تم آزرہ نہ ہو۔ میں تمہاری خوشی کے لئے  
دنیا کی ہر مصلحت کو قربان کر سکتا ہوں بشرطیکہ رتن گڈھ کی عزت پر حرف نہ آئے۔“

(۴)

یوں تو رتن گڈھ کو ہستان بندھا چل کے دامن میں واقع ہے لیکن اس کی آبادی پہاڑ کی بلندی تک  
پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں قلعہ اور رنواس کی عمارتیں بھی نظر آتی ہیں۔ سب سے بلند مقام رام گوپھا کے نام سے مشہور  
ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سری رام جی نے لنکا پر فوج کشی کی تھی تو اسی راستہ سے گزرے تھے اور یہاں ایک  
رات دن قیام کیا تھا



صبح کا وقت ہے، اور گو آفتاب کافی بلند ہو گیا ہے، لیکن موسم کی خشکی کی وجہ سے ابھی تک زیادہ چل سہل کیں نظر نہیں آتی

رام گو پچا ایک وسیع کھوہ ہے جس نے ایک وسیع کوٹھری کی صورت اختیار کر لی ہے اور قدرت نے اس کے آگے ایک بڑی چٹان کی جھت قائم کر کے اچھا خاصہ برآمدہ بھی بنا دیا ہے، جگہ نہایت صاف، ستھری ہے اور چاروں طرف سبز چھاڑیوں کی وجہ سے گرمی میں بھی یہ جگہ کافی خنک رہتی ہے۔ قریب ہی ایک سنگستانی چشمہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے اور بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ گو پچا عرصہ سے غیر آباد تھا، لیکن چند دن سے سوامی رام ناتھ، بنگال کے مشہور سنیا سی فقیر ہاں آکر ٹھہر گئے ہیں

سوامی رام ایک دولتمند باپ کے بیٹے اور تعلیم یافتہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ایسے محل میں بسر ہوئی تھی جسے نہ مذہب سے کوئی سروکار تھا اور نہ سنیا س سے، لیکن چونکہ وہ فطرت کی طرف سے نہایت سنجیدہ اور سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے۔ اس لئے وہ اپنے ماحول اور عیش و تنعم کی فضا سے بہت کم متاثر ہوئے تھے اور ان کی زندگی کافی سادہ بسر ہوئی تھی، جب ان کا مطالعہ وسیع ہوا تو ان کی یہ فطری سادگی اور زیادہ ظاہر ہونے لگی، یہاں تک کہ آخر کار ایک گیر وے رنگ کی چادر کے سوا ان کے جسم پر کوئی کپڑا نہ رہ گیا ہر چند ان کے باپ جو رنگ پور کے مشہور سربراہ اور درویشدار تھے، اپنے بیٹے کی اس زندگی سے خوش نہ تھے اور انھوں نے بار بار اس موضوع پر گفتگو بھی کی، لیکن رام ناتھ کا وہ گہرا سکوت جس میں عجیب طرح کی کیفیت مقادست پنہاں تھی، ایک ایسا فیصلہ کن جواب ہوا کرتا تھا کہ آخر کار یہ تعرض چھوڑ دیا گیا اور وہ اپنی عمر کے چوتھوں سال تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دفعہ گھر سے غائب ہو گئے

رام ناتھ گھر سے نکلنے کے بعد کہاں گئے، کہاں کہاں کی خاک چھانی، اور کس کس جگہ گیان دھیان میں مہر دے رہے، یہ ان کی زندگی کی وہ باتیں ہیں جن کا علم صرف انھیں کو حاصل تھا، جس وقت وہ رتن گدھو آئے ہیں ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی اور سوائے کتابوں کے انبار کے کوئی اور سامان ان کے ساتھ نہ تھا

صورت و شکل کے لحاظ سے ان میں کوئی غیر معمولی بات نہ پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ ابھی شباب کا زمانہ تھا اور شباب بھی ایک سنیا سی کا، اس لئے ان کی صورت میں ایک عجیب قسم کی کشش پائی جاتی تھی، اور آنکھوں کی کشش کا تو یہ عالم تھا کہ آٹھ میں آٹھ ڈال کر ان کا بائیں کرلیٹا بڑے بڑوں کے قدم اکھاڑ دیتا تھا ان کا رنگ کھٹکا ہوا گندمی تھا، اور قامت و اعضاء کے لحاظ سے ایک چھپرے سڈول جسم کے انسان تھے کھلا جس وقت رگنی کے ساتھ وہاں پہنچی تو سوامی جی اپنے مطالعہ میں مشغول تھے اور کوٹھری کے اندر بیٹھے ہوئے تھے

رکنی نے دستک دی اور تھوڑی دیر میں وہ باہر نکلے، لیکن اس شان سے کہ ہاتھ میں کوئی کتاب تھی اور ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ کھلانے ان کو دیکھتے ہی نگاہیں نیچی کر لیں اور وہ اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئے۔ سوامی جی عورتوں کی آمد و رفت کبھی پسند نہ کرتے تھے اور حتی الامکان اس سے ہمت گزرتے۔ لڑتے تھے کہ عورتوں سے انہیں خطاب کرنا پڑے، اس لئے دستک سننے کے بعد جب وہ باہر نکلے اور انھوں نے دو عورتوں کو کھڑا ہوا دیکھا تو وہ گھبرائے گئے۔ لیکن چونکہ وہ باہر آگئے تھے اس لئے اب واپس بھی نہ جاسکتے تھے۔ لہذا لونہ میں ایک جگہ بیٹھ گئے اور ان کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا

رکنی نے بڑھ کر ان کے پاؤں چھونا چاہے، لیکن انھوں نے روک دیا اور بولے کہ ”دیو، میرے چرنوں میں کیا رکھا ہے، ہندو دھرم میں غیر کی پوجا حرام ہے“

رکنی — ”سوامی جی، یہ تو برہمن کی پوجا ہے آپ کے چرنوں کی نہیں“

سوامی جی — ”برہمن کہاں ہے جس کی پوجا کرتی ہو، انسان خود برہمن ہے، اور اس کو خواہی ہی پوجا کرنا چاہے“  
 کھلا سوامی جی کے منہ سے یہ باتیں سنکر حیران رہ گئی اور اس نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے اس آواد لو سنا جو زمانہ نامعلوم سے اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی لیکن لب تک نہ آسکتی تھی۔

اس نے کہا — ”سوامی جی، اپنی پوجا کا کیا طریقہ ہے“

سوامی جی — ”مسکراتے ہوئے، ”تم نے اپنی صورت کبھی آئینہ میں دیکھی ہے؟“

کھلا — ”انفعال کے ہلکے رنگ کے ساتھ“ جی ہاں، روز ہی دیکھتی ہوں“

سوامی جی — ”تمہیں وہاں کیا نظر آتا ہے“

کھلا — ”ایک صورت نظر آتی ہے“

سوامی — ”کس کی“

کھلا — ”اپنی“

سوامی — ”وہ چیز جسے تم ”اپنی“ کہتے ہو کیا ہے، کہاں ہے، کیا ”میں“ نام خوبصورت چہرہ کا ہے، بڑی بڑی آنکھوں اور گورے گورے رنگ کا ہے؟ یہ تمام باتیں تو چند دن میں مٹ جانے والی

ہیں، تو کیا ”میں“ بھی ان کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے“

کھلا — ”بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے، گو ہونا تو نہ چاہئے“

سوامی — ”کبھی سمندر تم نے دیکھا ہے“

کھلا — ”جی ہاں، دیکھا ہے“

سوامی — ”کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ قطروں کا مجموعہ نہیں، لیکن سمندر نام قطرہ کا تو نہیں۔ قطرہ جب تک سمندر میں شامل ہے خود بھی سمندر ہے، اور جب اس سے علیحدہ ہو گیا تو وہ ایک فانی قطرہ ہے، دریا خالی کے سمندر بدستور اسی طرح قائم ہے۔ اسی طرح ”میں“ نام نہ تمھاری صورت کا ہے اور نہ میری صورت کا، نہ تمھاری ایک ذات کا، نہ میری تنہا ہستی کا، بلکہ اس کل کا جو ”ہم سب“ کے پردہ میں ظاہر ہوا ہے، دریا خالی کے وہ ”ہم“ نہیں ہے۔ اسی کل کا دوسرا نام ”پریشور“ ہے اور جب تک ہم اس میں شامل ہیں، خود بھی ”پریشور“ ہیں اور اس لئے اپنی پوجا کرنا پریشور کی پوجا کرنا ہے۔“

سوامی — ”تم نے کبھی آدمی ذات کو جنگل کا ستانا دیکھا ہے، جبکہ کہیں کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی“

سوامی — ”پھر تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اس انتہائی سکوت کی بھی ایک آواز ہوتی ہے، اس گہری خاموشی میں بھی ایک خاص قسم کی سرگوشی سی پائی جاتی ہے۔ انسان بھی اگر دھیان سے کام لے کر خود اپنی خلوت میں ڈوب جائے، تو وہ بھی خاص قسم کی آواز اپنے اندر سے پیدا ہوتے ہوئے سن سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ کائنات میں وسیع ہوتا جا رہا ہے اور پریشور کی طرح سب پر چھایا جا رہا ہے“

سوامی — ”اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس سے نتیجہ کیا ہے“

سوامی — ”نتیجہ کا سوال، منزل کا سوال ہے، اور منزل کا سوال قطع جستجو کا“

سوامی جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور سر جھٹکا کر خاموش ہو گئے۔ کلا بھی اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی جھرجھری محسوس کر رہی تھی اور جس وقت رخصت ہوتے وقت سوامی جی نے اس کو اپنی اشک آلود آنکھوں سے دیکھا تو وہ کانپنے لگی اور اس طرح گھر کی طرف لوٹی گویا اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے اور وہ سمجھنا چاہتی ہے کہ وہ کیا چیز ہے (باقی)

نیز

فراست التحریر مکمل یعنی اردو، انگریزی رسم الخط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، ہال جین مستقل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸۰ (اعلاہ محصول)

منہج نگار لکھنؤ

# میکدہ اسلام

اور

## ادیر سہیل مین کی ہکی ہکی باتیں

کھوٹے ایک شیعی رسالہ "سہیل مین" جناب ظفر ممدی صاحب کی ادارت میں برسوں سے شائع ہو رہا ہے اور اسی ذہنیت کے ماتحت جو اخبار "البحر" کی ہے۔ یعنی مسیحیہ سنیوں کے درمیان تفریق و اختلاف کی خلیج کو وسیع کرتے رہنا اور کبھی کوئی ایک بات بھی سمجھ کی ایسی نہ کرنا جسے صحیح معنی میں دینی یا انسانی خدمت کہا جائے۔ "میکدہ اسلام" ایک مختصر سار سالہ ہے جو انھیں کی قوت فکر و اجتہاد کا نتیجہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ میرے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس میں جابجا میرا اور نگار کا بھی ذکر آیا ہے

اس رسالہ کا مقصود اس مسئلہ پر گفتگو کرنا ہے جو جناب امیر کی شراب نوشی سے متعلق ہے اور جس کا ذکر مولانا شبلی نے بھی کیا ہے۔ مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نے بھی اس کی تائید کی

میکدہ اسلام میں شبلی کی تحقیق کو غلط ثابت کرتے ہوئے جن جن دورا ذکر مباحث و مسائل پر خامہ فرسائی کر کے ذوق سب و شتم کو پورا کیا گیا ہے، اُن سے اعتناء کرتا میرا فرض نہیں، کیونکہ وہ سب شیعہ و سنی کی اُس دربر بہ نزاع سے متعلق ہیں جس کا خیال بھی میرے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے چہ جائیکہ اس کی حمایت یا مخالفت میں قلم اٹھانا لیکن چونکہ صاحب رسالہ نے میرے خلاف ایک نہایت לנו و غلط الزام مولانا شبلی کی تائید کا قائم کیا ہے اس لئے اس کو دفع کر دینا ضروری سمجھتا ہوں

مسئلہ ۶ میں ایک صاحب نے استفسار کیا کہ رسالہ سہیل مین میں جناب عمر کے متعلق شراب صلب کا مینا کتب اہل سنت سے ثابت کیا گیا ہے، سو اس کی کیا اصلیت ہے " میں نے اس کا جواب دیتے ہوئے ایک جگہ

یہ ظاہر کیا تھا کہ

”سہیل بن کے اس مضمون کا اخذ عقد الفرید ہے یا عقد الفرید کے حوالہ سے ”ابن قتیہ“  
لیکن مقالہ نگار نے دیانت سے کام لے کر نہ عقد الفرید کی پوری بحث پیش کی اور نہ ابن قتیہ  
کی عبارت نقل کی، کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اصل مقصود فوت ہو جاتا اور حضرت عمرؓ پر بادہ جاری  
کا الزام اس قدر صفائی سے عائد نہ ہو سکتا“

اسی سلسلہ میں میں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا

”یہ بالکل صحیح ہے کہ آیت ”یسئلونک عن الخمر“ نازل ہونے سے پہلے

عام طور پر لوگ شراب کے عادی تھے اور اس آیت کے نازل ہونے پر بھی سب نے اسے ترک  
نہیں کیا تھا، لیکن ایک مرتبہ جب یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی صحابی نے (اور بعض کے نزدیک خود  
حضرت علیؓ نے) نماز مغرب بہ حالت سُکر پڑھائی اور قرأت میں غلطی ہو گئی تو آیت  
”لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم مسکرا“ نازل ہوئی۔ . . . .“

میرے اس جواب میں (جو مئی ۱۹۳۷ء کے نگار میں درج ہوا ہے) ایک بات تو مدیر سہیل بن کو یہ ناگوار ہوئی  
کہ میں نے اُن پر مناظرانہ دیانت سے انحراف کرنے کا الزام قائم کیا تھا اور دوسری یہ کہ بہ حالت سُکر نماز پڑھانے  
والے صحابی کا ذکر کرتے ہوئے۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ بعض کے نزدیک یہ صحابی خود حضرت علیؓ تھے

اب کامل سات سال گزرنے کے بعد ظفر ممدی صاحب ”میکدہ اسلام“ شائع کرتے ہیں اور اس میں اپنی  
دیانت کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف جناب امیر کے واقعہ شراب نوشی کو لے کر مجھے بھی مولانا شبلی کی طرح  
مورہ الزام قرار دیتے ہیں، درانحالیکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے

میں نے صرف اتنا لکھا تھا کہ بعض کے نزدیک خود حضرت علیؓ نے بہ حالت سُکر نماز مغرب پڑھائی تھی، لیکن  
اس سے میرا مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں بھی اُن ”بعض“ سے متفق ہوں، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ  
اس سے قبل میں صراحتاً اس باب میں مولانا شبلی کے خلاف اظہار خیال کر چکا تھا۔

اگست و ستمبر ۱۹۳۷ء کے مسلسل دو اشاعتوں میں جناب سید وحی احمد صاحب بلگرامی کا ایک مضمون ”ملک خطا  
کے شہزادے“ کے عنوان سے نگار میں شائع ہوا تھا اور پہلا اعتراض مولانا شبلی پر انھوں نے یہی کیا تھا کہ

”آیت لا تقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول میں ابوداؤد سے جو روایت انھوں نے نقل

کی ہے اور حضرت علیؓ کے واقعہ بادہ نوشی کا ذکر کیا ہے، حد درجہ قابل ملامت ہے۔ اور وہ حدیث

اس قابل نہ تھی کہ اس سے استدلال کیا جاتا۔ . . . .“

میں نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

” اس سلسلہ میں کئی باتیں غور طلب ہیں

(۱) ابوداؤد کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے بھی یہ حدیث روایت ہوئی یا نہیں

(۲) اس کے راوی مجروح ہیں یا نہیں

(۳) آیا لاتقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول یہی واقعہ ہے یا کوئی اور

(۴) مفسرین کی اس باب میں کیا رائے ہے

ابوداؤد کے علاوہ ترمذی میں بھی یہی واقعہ موجود ہے۔ لیکن ذرا اختلاف کے ساتھ۔ ابوداؤد کے الفاظ یہ ہیں

” عن علی بن ابی طالب ان رجلاً من انصار دہاء (علی، وعبد الرحمن بن عوف قسما قبل ان

تحمرا انخرقا مسم علی بن المنزب وقرا، قل یا ایہا الکفرون، فخلط فیہا، فنزلت لاتقربوا الصلوٰۃ الخ ”

یعنی شراب حرام ہونے سے قبل حضرت علی اور عبد الرحمن بن عوف کو کسی انصاری نے مدعو کیا۔ اور ان کو شراب

پلائی۔ پھر مغرب کی نماز میں حضرت علی نے آمست کی اور اشارہ قرأت میں ” قل یا ایہا الکفرون “ غلط پڑھ گئے کہ جس

پر آئیہ ” لاتقربوا الصلوٰۃ “ نازل ہوئی (ابوداؤد کتاب الاشرار صفحہ ۱۶۱ جلد دوم مطبوعہ نوکلشور)

ترمذی کے الفاظ یہ ہیں :-

” عن ابن ابی طالب صنع لنا عبد الرحمن بن عوف طعاما ودعا ناسا من انحر فاختد انحرنا وحدث

الصلوٰۃ فقدمونی فقرأت قل یا ایہا الکفرون ولا اعبدا تعبدا ونحن نعبد ما تعبدا ون قال فانزل اللہ

تعالیٰ یا ایہا الدین آمنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری الخ ”

(ترمذی جلد دوم صفحہ ۱۸۷ مطبوعہ مصر)

ابوداؤد نے یہ واقعہ مسند سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے سدید سے۔ ابوداؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ

کسی انصاری نے حضرت علی اور عبد الرحمن بن عوف کی دعوت کی تھی۔ اور ترمذی کی روایت سے عبد الرحمن بن عوف

کا دعوت کرنا پایا جاتا ہے۔ ابوداؤد میں مغرب کے وقت کی تصریح ہے۔ اور ترمذی میں کسی وقت کا ذکر نہیں

بخاری اور ابن ماجہ میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ نسائی میں اس آیت کی شان نزول کے متعلق ایک اور

واقعہ نقل کیا ہے جو ابوداؤد میں بھی ہے لیکن حضرت علی کی شراب نوشی اور دعوت کا کوئی ذکر نہیں ہے

الذہبی التقریل میں ” لاتقربوا الصلوٰۃ “ کی جو شان نزول بیان کی ہے۔ وہاں بھی حضرت علی کا کوئی ذکر نہیں ہے

اس میں لکھا ہے کہ :-

” عبد الرحمن بن عوف نے جس زمانہ میں شراب حرام نہیں ہوئی تھی کسی صحابی کو مدعو کیا اور بیٹے



کے جو متعصب مولویوں کی طرف سے اکثر و بیشتر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی ایک بات بھی لائق اعتناء پریش نہ کر سکے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا مجموعہ

# جماستان

(نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۵۰۰ صفحات)

علامہ محصول

غیر مجلد لکچر

قیمت فی کاپی مجلد للبر

خریداران نگار سے ایک روپیہ کی رعایت

کتب فروشوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست مضامین حسب ذیل ہے:-

دنیا کا اولین بت ساز	فریب خیال	صدائے شگفت	دو گھنٹہ جہنم میں
ایک شاعر کی محبت	میر بیداد	تایخ عرب کی ایک دایت جلیل	ایضار
شہید آزادی	بعد المشرقین	ولے بخیر گزشت	شیلی فون ۶۷
دو خطا	جان عالم اور ملکہ مہر نگار	چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	شہنشاہان کا خطرہ گوہر میں
سودائے خام	درس محبت	ادد واج مکرر	انتظام عملی صاحب
۲۵ء کا ایک صوتی	ایک شاعر کا انجام	آدم و حوا سے پہلے	شہزادہ خرم اور ابابیل
زہرہ کا ایک پجاری	رادھا	سرزمین کن کی ایک لنواڑ شام	نوجوان شہزادہ
مطر بے فلک	پنگاری	محلہ کی رونق	داستان حسن عشق کا ورق خونی

منیر نگار لکھنؤ



# باب الاستعداد

**غلیات قرآن** | اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جسے مولانا اسلم جبراج پوری نے مرتب کر کے ان لوگوں کے لئے جو قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنا چاہتے ہیں بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ قرآن کی تعلیم کا اسلوب زمانہ دراز سے اس وقت تک ہی چلا آ رہا ہے کہ چند مخصوص تفاسیر کو سامنے رکھ کر اس کے مطالب سمجھائے جاتے ہیں۔ نہ مدرس خود غور و تامل سے کام لیتا ہے، نہ طلبہ کو اس طرف مایل کیا جاتا ہے و یا قرآن سے پہلے تفاسیر پر ایمان لے آنا ضروری ہوتا ہے اور چونکہ تفاسیر کا ماخذ بالعموم کتب احادیث ہیں جن میں شریعت سے موضوع روایات پائی جاتی ہیں، اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن سمجھنے کی صحیح اہلیت طلبہ میں پیدا ہی نہیں ہوتی اور کورانہ تقلید ان کی قوت فکر و اجتہاد کو یکسر محو کر دیتی ہے

عام طور پر مسلمانوں میں یہ غلط خیال پیدا ہو گیا ہے (جو یقیناً مولویوں ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے) کہ قرآن کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں اور اسلاف جو کچھ بتا گئے ہیں اس سے انحراف کرنا قرآن و رسول سے مغرور ہو جانا ہے۔ یہ خیال خود قرآنی تعلیم کے منافی ہے، کیونکہ وہاں تو ہر جگہ ہر انسان کو غور و فکر تدبر و تامل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن مولوی کہتا ہے کہ نہیں تفکر و تعقل کا دور گزر چکا اور اب ہمارے لئے چارہ کار سوائے اس کے کچھ نہیں ہے جو کچھ ہمارے اسلاف لکھ گئے ہیں ان پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آیا جائے

اس تعلیم نے یہ نقصان پہونچایا کہ مسلمانوں میں ذہنی غلامی پوری طرح سرایت کر گئی اور وہ اس دورِ علم و حکمت میں ناکارہ محض ہو کر رہ گئے

مولانا اسلم ملک کے ان چند روشن خیال مولویوں میں سے ہیں، جو کورانہ تقلید کے مخالف ہیں اور قرآن میں غور و فکر کرنا ہر شخص کا فطری حق خیال کرتے ہیں،

اور اسی کوشش نظر رکھ کر انھوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس جلد میں اللہ اور اس کے صفات، مخلوق، دین، رسالت، کتاب، اور معاد کے متعلق جو کھلی ہوئی آیات قرآن میں پائی جاتی ہیں ان کو صحیحاً

کر دیا ہے اور اس اسلوب سے لکھا گیا ہے کہ ایک آیت خود دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے  
 ہر چند اعظم گدھ کا قدامت پرست شبلی اسکول جس کی "سیرۃ نبوی" پر مولانا اسلم نے آزادانہ تنقید  
 کر کے اس کے نقائص ظاہر کئے ہیں، اور مولویوں کی دوسری جماعتیں جو اسی کو ردِ ہنیت کی مالک ہیں مولانا اسلم  
 کے اس اقدام کو پسند نہ کریں گی اور ممکن ہے کہ وہ اس کے خلاف کافی پروپاگنڈا کریں لیکن مولانا اسلم باور کریں  
 کہ ان کی اس خدمت کی قدر کرنے والے اب ملک میں کافی پیدا ہو گئے ہیں اور انھیں اس تالیف کے دوسرے  
 حصوں کو بھی جلد از جلد مکمل کر دینا چاہئے

نہ نوری فتاند و سگ بانگ می زند

یہ کتاب نہایت اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ ۲۲۸ صفحات پر شائع ہوئی ہے اور مولانا سے جامد  
 تمیہ قریل باغ دہلی کے پتہ پر دور و بیہ میں مل سکتی ہے

یہ کتاب ڈاکٹر کرنل بھولانا تھ آئی۔ ام۔ اس۔ نے لکھی ہے  
**جنسی امراض اور ان کا علاج** اور تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصہ تعلقات جنسی اور امراض و  
 علاج سے متعلق ہے جسے خود کرنل صاحب نے لکھا ہے۔ دوسرا حصہ حکیم مظفر حسین صاحب کا مرتب کیا ہے اور  
 اس میں ویدک دیوناتی نسخے درج کئے گئے ہیں۔ تیسرا حصہ برتھ کنٹرول کے لئے وقف ہے۔ کتاب بہ حقیقت  
 مجموعی مفید ہے اور بہت ایسی معلومات کی حامل ہے جن سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہئے

اس دور میں دیگر علوم و فنون کے ساتھ ساتھ "جنیات" پر بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے اور کوشش  
 ہو رہی ہے کہ اس فن کی معلومات عام کر دی جائیں۔ اس لئے ملک کو کرنل صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں  
 نے اردو میں اپنے تجربات کو قلمبند کر کے عوام کو ان کے سمجھنے کا موقعہ دیا  
 ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے رسائل کے بعد یہ دوسری تحسن کوشش ہے۔ جس کی قدر ملک  
 کو کرنا چاہئے

یہ کتاب تین ردیہ (۷۷) میں کتب خانہ لطیف زندگی اعوان منزل لاہور سے مل سکتی ہے

اس کے مولف کوئی صاحب سرکوب الہ آبادی ہیں اس تالیف  
**اصغر گوندوی کی شاعری** کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اصغر مطلقاً شعر کہنا نہیں جانتے اور جب

ان کو چیلنج دیا گیا کہ وہ کسی صحبت میں سب کے سامنے کسی طرح پر غزل کہیں، وہ جان بچائے  
 ہر چند اس کتاب میں اصغر صاحب کے خلاف و موافق دونوں مفاہیم جمع کئے گئے ہیں۔ لیکن مولف  
 نے نتیجہ یہی نکالا ہے کہ وہ فن شعر سے بالکل نا بلد ہیں

اس نوع کی تالیفات میرے نزدیک سنجیدہ طبائع کو متاثر کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ان کا تعلق یکسر ذاتیات سے ہوتا ہے اور دیکھنے والا بہ ادل نظر خراب رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے محض یہ امر کہ اصغر صاحب نے چیلنج کو قبول نہیں کیا، اس امر کا ثبوت نہیں کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے، اور ہر سنجیدہ شخص کو وہی طرز عمل اختیار کرنا چاہئے تھا جو اصغر صاحب نے اختیار کیا۔ اگر اس کے بجائے اصغر کی شاعری پر تبصرہ کر کے اس کے نقائص کو ظاہر کیا جاتا۔ تو بھی خیر کوئی بات ہوتی، گو ایسی اہم دہ بھی نہیں — معلوم نہیں اصغر صاحب اپنے شاعر ہونے پر فخر کرتے ہیں یا نہیں، لیکن میرے نزدیک ایک انسان کو سب سے پہلے اپنے انسان ہونے پر فخر کرنا چاہئے

اگر اصغر صاحب اپنے اخلاق کے لحاظ سے صرف انسان ہیں اور شاعر نہیں تو بھی ان کے لئے یہی پس ہے اور شاعر نہ ہونا ان کی عظمت کو کم نہیں کر سکتا

مجھے یہ کتاب دیکھ کر تکلیف ہوئی اور میں سرکوب صاحب کو مشورہ دوں گا کہ وہ آئندہ ایسی کوشش سے باز رہیں کیونکہ اصغر کو غیر شاعر ثابت کرنے کے سلسلہ میں اپنے حسن اخلاق کا پھونہ وہ پیش کر رہے ہیں، وہ حد درجہ قابل نفرت ہے

یہ کتاب ۸ میں مہدی علی خاں بک سید جو کہ آباد سے مل سکتی ہے

جناب سید فرید جعفری کچھلی شہری کا دو سرفسانہ ہے جو علیحدہ رسالہ کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس کمائی کا مقصد زلزلہ ہمار کی تباہیوں کے متعلق لوگوں میں جذبہ

ہمدردی پیدا کرنا ہے

فرید صاحب نے جس مقصد کے ساتھ یہ تصنیف پیش کی ہے وہ ہر آئینہ قابل قدر ہے اور چونکہ اس کی آمدنی زلزلہ فنڈ میں جائے گی اس لئے لوگوں کو قدر کرنی چاہئے۔ قیمت دو روپے نہیں ہے

ملے کا پتہ سکریٹری ہمار سنٹرل ریلیف کمیٹی پٹنہ ہے

”افادیت“ میں تجارت یقیناً شامل ہے، لیکن صرف تجارت تو افادیت کا مقصد واحد نہیں

اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ملک کے موجودہ رسائل و جرائد پر نگاہ ڈالئے اور فیصلہ کیجئے کہ ان سے انسانی زندگی کا کون سا مفاد متعلق ہے۔ یعنی کیا تجارت کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے سامنے ہے۔ پھر تجارت تجارت میں بھی فرق ہے۔ امریکن و انگریزی مصنوعات کی مانگ چاہے کتنی ہی کم ہو۔ لیکن ان کی مضبوطی کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑے گا۔ برخلاف اس کے کہ جاپان کا نام آتے ہی جنس کے ناکارہ، و نامضبوط ہونے کی

طرف خود بہ خود خیال منتقل ہو جاتا ہے

بالکل یہی کیفیت ہمارے ملک کے رسائل کی ہے کہ وہ تجارت بھی کرتے ہیں تو بالکل جا پانی قسم کی کہ چیز بظاہر نہایت خوشنما و ارزداں ہے، لیکن اگر نقش و نگار متادبجے تو اندر سوائے ردی کا غذا اور بوسیدہ لکھومی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا

یہ وبا اول اول پنجاب سے شروع ہوئی۔ اور اب تمام ہندوستان اس میں مبتلا نظر آتا ہے۔ آپ کسی رسالہ کو اٹھا کر دیکھئے سرورق نہایت خوشنما و رنگین ہوگا، تصویروں کی بھرمار ہوگی۔ غرض لیس بھی ہوں گی فسانے و ڈرامے بھی نظر آئیں گے، ہنسنے ہنسانے والے مضامین بھی ہوں گے، لیکن آپ یہ چاہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ ہو یا کسی ذہنی و دماغی ترقی کی طرف خیال مایل ہو، تو آپ کو سخت یاس ہونا پڑے گا

سارقت اور سچ وغیرہ قدامت پرست مذہبی رسائل کا ذکر نہیں کہ وہ تو کوٹھو کا بیل ہیں۔ جن کے لئے آٹکھ پر پٹی باندھ کر ایک ہی حلقہ میں چکر لگانا مقصود ہو چکا ہے اس طرح نہ ان رسائل کا ذکر ہے جو مذہب کے پردہ میں لغو و مہمل کتابوں کی تجارت کرنا چاہتے ہیں اور جو آپ کے دماغ کو سال بھر تک ادنیٰ قسم کا مذہبی لٹریچر سے تباہ کرنے کا معاوضہ بارہ آنے ایک روپیہ سے زیادہ نہیں لیتے۔ بلکہ افسوس تو ان لوگوں پر ہے جو اپنے آپ کو روشن خیال و روشن دماغ کہتے ہیں اور پھر بھی ان کے سامنے افادیت کا مفہوم ارزداں تجارت کے علاوہ کچھ نہیں

پنجاب میں اس وقت بعض رسائل ایک خاص مرتبہ امتیاز کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کا عنصر غالب بھی افسانوں اور غزلوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، درانحالیکہ ان کے مالک ایسے ہیں جن کو کوئی مادی فائدہ اٹھانا مقصود نہیں ہے۔ اور اگر وہ چاہتے تو اپنے رسائل کو اقتصاد و سیاست اور معیشت و معاشرت کے ان رسائل کے لئے وقف کر سکتے ہیں جن کی تعلیم و اشاعت کی اس وقت سخت ضرورت ہے۔ البتہ اگر دہلی پنجاب میں شامل سمجھا جائے تو رسالہ جامعہ کوستہنی سمجھنا پڑے گا، جو واقعی سمجھ معنی میں ملک و قوم کی بر محل خدمت انجام دے رہا ہے

یو۔ پی کے رسائل اس سے زیادہ بدبختی میں مبتلا ہیں کہ ان کو تجارت کا لمبی سلیقہ نہیں اور کجمن و زبیدہ کی تصویریں شائع کرنے کے بعد بھی خریداروں میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس کا سبب یہ نہیں کہ مفید چیز کی مانگ نہیں ہے بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ پہلے رسائل کی ترتیب پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور اب ہر وہ شخص جو ایک بورڈ کی قیمت ادا کر سکتا ہے اڈیٹر بنا ہوا ہے

البتہ اب سے ۸ سال قبل نہیں لکھوئے اور رسالے صحیح امید اور معلومات ایسے جاری تھے جو واقعی مفید تھے۔ صحیح امید کے احیاء کی کو کوئی توقع نہیں، لیکن معلومات پھر جاری ہوا ہے

اس کے اڈیٹر مسٹر عبد الوالی۔ بی۔ اے نہایت روشن خیال اور وسیع المطالعہ انسان ہیں اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ملک و قوم کے سامنے کس قسم کا لٹریچر پیش کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ مارچ و اپریل کے رسالوں میں انھوں نے بعض بین الاقوامی مسائل پر نہایت مفید و جامع مضامین لکھے ہیں اور ایسی صاف و شگفتہ زبان میں کہ پڑھنے والے کے دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا

ہر چند افراد قوم جو ادنیٰ درجہ کا ارزاں لٹریچر اور صرف نقش و رنگ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اس طرف جلد متوجہ نہ ہوں گے۔ لیکن عبد الوالی صاحب کو مطمئن رہنا چاہئے ایک وقت آئے گا جب ان کے مساعی کی قدر کی جائے گی۔ اور اگر یہ نہ ہو تو بھی ان کے اطمینان ضمیر کے لئے یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے پبلک کے ذوق کو خراب کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا

## شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ہر کے مجلد کتاب صرف پانچ روپے ہیں۔ اور غیر مجلد غار میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ہر میں اور غیر مجلد ہر میں علاوہ محصول ہر کے ملے گی

انگریز

ارشاد ہو تو کتاب ذریعہ دی۔ بی۔ روانہ کی جائے حجم ۳، ۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی

حضرت ضروری ہے

منیجر نگار لکھنؤ

# باب المراسلہ والمناظرة

## دعوائے مہدویت

(جناب سید محمد مہدی صاحب۔ الہ آباد)

میں شروع سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور جو تدریجی انقلاب آپ کے خیالات میں ہوا جو وہ پوری سیل کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ پھر اس دوران میں کئی بار آپ کی تحریر نے وہ رنگ اختیار کیا کہ اس کے بعد سوائے اعلان مہدویت کے کسی اور منزل کی گنجائش نہ تھی لیکن انہوں نے کہ میرا یہ خیال غلط تھا اور آپ پھر ٹانگے دو تین سال ہوئے جو ہنگامہ کفر و الحاد کا آپ کے خلاف ہوا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے میں نے خیال کیا تھا کہ شاید نگار کی رکش بدل جائے گی اور اس طرح میری وہ تمام توقعات ختم ہو جائیں گی جو آپ کی طرف سے میں نے قائم کی تھیں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ نگار کا مشن بدستور وہی قائم ہے بلکہ سچ و چھپے تو اس ہنگامہ کے بعد آپ نے جو مضامین لکھے ہیں وہ بہت زیادہ سخت ہیں اور مذہب پر نہایت کاری ضرب لگانے والے ہیں۔ اس لیے صحت میں تمام دہی موجود ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ پنجاب تو اتنے مستعد دینی اس وقت تک پیش کر چکے۔ اور ہمارا یو۔ پی ایک مہدی آخر الزماں بھی نہ پیدا کر سکے۔ یہ بھی کر دیکھتے، شاید کوئی صورت فلاح و اصلاح کی پیدا ہو سکے

(نگار) آپ کے مشورہ کا شکریہ، لیکن میرے محترم دوست شاید آپ کو معلوم نہیں کہ جو آپ کا فہمائے نظر و خیال ہے، وہ میری پرواز کے لحاظ سے سنگِ بربود بال ہے، آپ کے نزدیک مہدی ہو جانا گویا اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے لئے کوئی خاص دعوائے و اہتمام درکار ہوتا ہے۔ اوساگر آپ کسی پر طعن کرنا چاہیں تو یہ نام لیکر اس خواہش کو پورا کر سکتے ہیں کا ش آپ سمجھ سکتے

کہ انسان ممدی دینی سے بھی گزر کر خدا بننے کے لئے عالم وجود میں آیا ہے اور اگر آپ مجھے مشورہ دینے پر مجبور ہی تھے تو میرے دست گستاخ کو دھین الوہیت کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتے، عرض و کرسی پر چھا جائے گا یا مافرانے تہ کہ دعوائے ممدویت جو میرے حوصلہ و عزم کے لحاظ سے کیسے فروتر ہے

مجھے نہیں معلوم کہ آپ دجال و ممدی وغیرہ کے ظہور کے قابل ہیں یا نہیں، لیکن اگر آپ آل رسول ہونے کے لحاظ سے واقعی ”امام مخفی“ کی آمد کے منتظر ہیں تو کیا دیر ہے

بال بکشا و صغیرا دشمن طوبے زن

آئے، اور اس دل خانہ خراب کے حلقہ ارادت میں شامل ہو جائے۔ آپ کی توقعات تو کسی طرح پوری ہوں ”امام منتظر“ کے لئے آپ کی یہ اختر شماریاں تو کسی طرح ختم ہونے میں آئیں

میرے عزیز دوست، باور کیجئے کہ آپ حضرات، اخلاق کی جس منزل سے گزر رہے ہیں، وہ میرے نزدیک خدا اور مذہب دونوں کے لئے باعثِ توبہ ہیں ہے۔ اگر خدا اتنی مدت کے بعد بھی انسان بنانے میں کامیاب نہیں اور اس کا بتایا ہوا مذہب ہزاروں سال کی عمر پانے کے بعد بھی ہنوز تکمیل انسانیت کی راہیں متعین نہیں کر سکا تو ایسے خدا مذہب کو لے کر ہم کیا کریں۔

کتنا اندھیر ہے کہ آپ اس روشن زمانہ میں بھی خدا اور نبی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور خود اپنی جستجو کی طرف سے غافل ہیں

سرروحانیاں داری دے خود را ندیستی  
بہ خواب خود در آتا قبلہ روحانیاں بینی

## دار المصنفین اور سیرۃ نبوی

(جناب عبد الحمید صاحب - حیدر آباد)

کسی گزشتہ پہچے میں آپ نے دار المصنفین سیرت نبوی پر تنقید کی تھی میں نے اس کتاب کو منکاکہ دیکھا تو آپ کی باتوں کی حروف بحرف تصدیق کرنی پڑی۔ قرآن تو کتنا ہے قل انما انابتہ شکمہ اور درحقیقت رسول اکرم کی عظمت کا راز یہی خالص بشریت ہے اور اسی قرآنی تعلیم نے مسلمانوں کو صحیح راستے پر قائم رکھا کہ انھوں نے اپنے اتنے بڑے رسول کو عیسائیوں کی طرح خدا نہیں بنایا لیکن یہ سیرت

ان کو خدا بنانا چاہتی ہے اس کی چوتھی جلد کے صفحہ ۸۷ میں ہے کہ رسول اللہ مافوق البشر ہیں قرآن کتاب ہے کہ قتل لا اقول لکھ انی ملائکہ۔ پھر جب مافوق البشر ہیں اور فرشتہ ہونے سے انکار ہے تو سولے الوہیت کے اور کیا صورت ہوگی۔ اس کے مؤلف کی قرآن ذاتی کا یہ حال ہے کہ اس میں صفحہ ۲۵ میں آیت وکلا فتشعرون الالہن انقضیٰ کو جو ملائکہ کے متعلق ہے انبیاء کے متعلق میں قرار دیا ہے صفحہ ۵۲۱ میں آیت وما افولنا علی قومہ من بعدک من جند من السماء کا عجیب ترجمہ لکھا ہے کہ ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس پیام کو دے کر اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری وہ سمجھتا ہے کہ فوجوں کا کام پیغام لے کر جانا ہے۔ غرض اسی قسم کی قرآن سے نادانہ کیفیت بلکہ عمیق جہالت اس کتاب میں نظر آتی ہے آپ حسب ذیل امور کا جواب ضرور لکھیں

(۱) دار المصنفین کا مالک کون ہے

(۲) اس میں کون کون لوگ کام کرتے ہیں اور ان کی علمی قابلیتیں کیا لیا ہیں

(۳) اس کو کون کن ریاستوں سے کتنی کتنی امداد ملتی ہے اور آج تک پبلک سے کس قدر چندہ لیا

(۴) کیا آپ کے خیال میں یہ جماعت کتابوں کی تجارتی کمپنی سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتی ہے

(۵) یہ جماعت قدیم ان خیال مولویوں کی نمائندہ ہے پھر اس کو کیا ترجیح دیو بند یا دیگر مدارس کے علماء

پر حاصل ہے جس کی وجہ سے یہ امداد کی مستحق ہے اور اس کے پاس وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں کے سامنے

پیش کرنا ضروری ہے

(نگار) آپ نے جس نوع کے اسقام و اغلاط کا ذکر کیا ہے اُن کی سیرۃ نبوی میں کمی نہیں آپ یا کوئی کہاں تک ڈھونڈ لے گا۔ اور تک تک سر پینے گا۔ افسوس ہے کہ تاریخ اسلام میں بھی ایک چیز ایسی تھی جو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی تھی۔ لیکن مولویوں نے اس کو بھی اس قابل نہ رکھا کہ خود اپنے ہی لوگ دیکھ سکیں، چہ جائیکہ انبیاء! سچ تو یہ ہے کہ دار المصنفین کی سیرۃ نبوی سے بدرجہا بہتر بعض مسئلہ قین مغرب کی وہ تصانیف ہیں جن میں کم از کم دس جگہ تو عقل و انصاف سے کام لیا گیا ہے، یہاں تو شرف ہی سے اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ سوائے مسلمان کے کوئی اور اسے بڑھ نہ سکے۔ اور اگر پڑھے تو محمدؐ کو دیوتا یا علم الاضام کا کوئی کیرٹر سمجھ کر خاموش ہو جائے۔ پھر نمائندہ یہ ہے کہ اس غلو کا نام محبت رسول رکھا جاتا ہے، سچ کہا ہے کسی نے کہ خدا مجھے میرے دوستوں سے بچائے آپ نے جو اور رسالات کئے ہیں۔ ان کا جواب آپ براہ راست دار المصنفین ہی سے طلب فرمائیں تو بہتر ہے



# باب الاستفسار

## کوثر

(جناب لطف الہی صاحب۔ بنگلور)

قرآن میں لفظ کوثر سے کیا مراد ہے کیا واقعی وہ کوئی حوض یا چشمہ ہے جو جنت میں پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے

(نگار) لفظ کوثر کلام مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے :-

إِنَّا عِطَيْنَاكَ الْكُوثِرَ یہاں لفظ کوثر بروزن "قَوْصِي" "کثر" سے مشتق ہے اور غیر کثر کے معنی میں آیا ہے، یعنی ہم نے تجکو بہت سے برکات بخشے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ عام مفسرین نے اس حقیقی معنی کی طرف بالکل اعتنا نہیں کیا اور احادیث پر اعتماد کر کے کسی جگہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کوثر ایک نہر ہے فردوس کی اور کہیں یہ کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ وہ پانی کا حوض ہے جو میرے لئے مخصوص ہے اور جو میرا حج کے وقت جھکودکھایا گیا کی سورتوں میں فردوس کی نہروں کا ذکر اجمال کے ساتھ اور مئی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے :-

مثل الجنة التي وعد المتقون۔ فيها انهار من ماء غير آسن وانهار من لبن لم يتغير طعمه وانهار من خمر لذات الشاربين وانهار من عسل مصفى

یعنی ان میں پانی، دودھ، شراب اور شہد کی نہروں کا ہونا ظاہر کیا گیا ہے — عیسائی کا اور یہودی روایات میں بھی جنت کی نہروں کا ذکر پایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ وہاں دودھ اور شہد کے علاوہ تیل کی نہر کا بھی ذکر ہے اور مسلمانوں میں تیل کے بجائے پانی ہے

رسول اللہ کی حیات میں تو لفظ کوثر خیر کثیر ہی کے مفہوم میں لیا جاتا تھا لیکن آپ کے بعد وہ چشمہ فردوس بن کر رہ گیا اور بقول طبری اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ پھر یہ بدعت اسی جگہ ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس میں شاعرانہ مبالغہ سے کام لے کر یہ بھی بتایا گیا کہ اس نہر کے ساحل سونے کے ہیں اور اس کی تہ میں موتی اور لعل پکھے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ اسی کے ساتھ یہ جعفری تحقیق بھی پیش کی گئی کہ جنت کی تمام نہریں اسی کوثر کے اندر آکر گرتی ہیں جس کا دوسرا نام ”نہر محمد“ بھی ہے

قرآن میں جابجا فردوس کی عشرتوں اور جہنم کے مصائب کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یقیناً وہ سب بیان تقبیہ و تنبیہ ہے جس کو مادی صورت سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن ہمارے مفسرین نے جسکے لئے موضوع احادیث کی کوئی کمی نہ تھی ان تمام باتوں کو دنیاوی لذت و الم کا مفہوم سامنے رکھ کر پیش کیا اور اس طرح ایک بڑا دفتر ”صنمیات“ کا مرتب ہو گیا۔۔۔۔۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں، یا تو وہ خود حقیقتاً ان تمام باتوں کو صحیح باور کرتے تھے یا یہ کہ صرف برائے مصلحت عوام کو ایسا سمجھاتے تھے تاکہ ان میں رغبت و شوق پیدا ہو جتھے اس کے سامنے میں تامل ہے کہ مقصود صرف ترغیب و تشویق تھی بلکہ وہ حقیقتاً جنت و دوزخ کو اسی مفہوم معنی میں لیتے تھے جو یہود و نصاریٰ یا قدیم ایرانی روایات میں پایا جاتا ہے اور چونکہ اسرائیلی حکایات بیان کرنے کی ممانعت نہ تھی اس لئے رفتہ رفتہ تمام وہ قصے کہانیاں جو اُس وقت رائج تھیں اور جن کو وہ لوگ اکثر سنتے رہتے تھے، اسلام میں شامل کر دی گئیں اور موضوع احادیث کے ذریعہ سے ان کی توثیق بھی ہوتی رہی تاکہ لوگوں کو چون و چرا کا موقع نہ ملے قرآن مجید میں دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم کو بھی جابجا ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی نہایت صاف الفاظ میں ان کو غیر مادی ظاہر کیے ہوئے ان کا مفہوم قوم کا زوال و عروج بتایا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ کلام مجید کو احادیث کے علحدہ کر کے ابھی سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ اور روایات موضوعہ سے ہٹ کر کبھی اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا ورنہ یہ حقیقت واضح ہو سکتی

پھر تماشہ یہ ہے کہ بدواً ہمہ پرستیاں کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہ تھیں بلکہ تقریباً ہر دور میں پائی جاتی تھیں اور رفتہ رفتہ برابر ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ خرافیات کا ایک انبار ہو گیا اور اسلام اس کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا

اس سے قبل نگار کے صفحات میں دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم پر کافی بحث کر چکا ہوں اس لئے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں اسے ملاحظہ فرمائے

اگر آپ چاہتے ہیں

میںہ نگار

کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل فوراً کر دی جائے تو تبرخہ خریداری ضرور رکھئے

لکھنؤ کی ماعری

اے زبانِ کھنڈ، اے کھنڈ کی شاعری  
اے تصنع پر خدا، اے صنعتوں کی تاجدار  
کچھ تجھے معلوم ہے تو نے لیا کیونکر جنم  
یعنی دلی جب جمالِ شعر کی دیوانہ تھی  
میں نہیں کتنا کہ اس جا کوئی آبادی تھی  
میں نہیں کتنا کہ اس جا صاحبِ دولت نہ تھے  
میں نہیں کتنا کہ انسان اس جگہ ملتے نہ تھے  
مالکِ سیف و قلم تھے صاحبِ ایجاد تھے،  
تھی یہی خاکی زمیں اور تھا یہی جسمِ رخِ کبود  
رمزِ داناںِ تخیل اس جگہ ملتے نہ تھے،  
ناگماں اتنے میں بدلائِ رنگِ فیضِ آباد کا  
اس طرف دلی کی قسمت میں ہوا اک انقلاب  
ٹھوکر میں کھاتے ہوئے پھرتے تھے اہل ہنر  
بنو اکچھ آئے اس جانب گدائی کے لئے  
میرزا سودا بھی تھے ان بیکسوں میں میر بھی  
اپنے اپنے رنگ میں کی شعر خوانی اس طرح  
جب بیاں کرتے تھے وہ فرقے ملائی پل  
جب وہ کہتے تھے کہ ہم نے یوں گزاری زندگی  
گوشہ گوشہ ہو رہا تھا مستِ صبا کے سخن

تیر کی خمیل نے دنیا کو حیراں کر دیا،  
 مصحفی نے سیکھنے والوں کو جو تعلیم دی  
 وہ ضمیر خوش بیاں، وہ آتش رنگیں نو  
 ایک پر کیا ایسے ایسے سیکڑوں دیوانے تھے  
 ایک اس کا دل نے دنیا بھر کو کا ل کر دیا،  
 دین شعر و شاعری یکسر مکمل ہو گیا،  
 سوز نے اک جوش دنیا میں نمایاں کر دیا  
 شعر خوانانِ ادب نے شوق سے تسلیم کی  
 وہ اسیر نکتہ داں، وہ غافل معنی سرا  
 شمع گو تھی ایک، لیکن ہر طرف برلنے تھے  
 معلقہ درس و ادب میں سب کو شامل کر دیا  
 کھٹو جو کچھ نہ تھا دی سے افضل ہو گیا

دور نیز نگِ فلک نے اک نیا دکھلا دیا  
 کون ناسخ جس نے کر دی شاعری بکسر تباہ  
 کون ناسخ جس کی ہے الفاظ پر نام و نمود  
 جس نے لفظوں سے بنایا اک گھر وند اشعر کا  
 جس نے ایہام و تناسب کو بنایا راہ برا  
 جس کو آتا ہی نہ تھا ہرگز تافر کا خیال  
 چند کی آواز کو سمجھا جو آواز ہزار،  
 مٹھ جگا شاعری کا اس کی سسئی تام سے  
 ہو گیا آخر اسی اک رنگ پر جب اجتماع  
 انتباہ ہے کہ پیو ہو گئے اس کے انیس  
 وہ انیس خوش بیاں جن کا جہاں میں نام  
 شاعری سے گو نہیں تھا ان کو کوئی واسطہ  
 اس میں جو آہ و بکا ہے شعر میں اخل نہیں  
 اور اگر ہم مان لیں اس کو کہ ہو وہ شاعری  
 یہ مناظر صبح کے، یہ شام رنگیں کا بیاں  
 تیزی شمشیر بریاں، صورت جوشیں دغا  
 وہ لغت، وہ صبا، وہ رند، وہ خوشگوا تیر  
 شعر کہنے کو تو لاکھوں ہں مگر کچھ بھی نہیں  
 شاعروں میں مبنی اک ناسخ کو بھی پیدا کیا  
 شعر کا دفتر کا دفتر کر دیا جس نے سیاہ  
 کون ناسخ ہے نفع جس کا سا بہت دہود  
 جس نے پائے خامہ سے میدان روندا شوکا  
 جس نے نضیع ہنر کا نام رکھا تھا ہنر،  
 تھا نمایاں جس کے شعروں میں سرا سر تندر  
 جس کا مرغِ دل تھا در و اندے کی ملی کا شکار  
 نفرت آئی اہل دل کو شاعری کے نام سے  
 آتش اور آتش کے شاگردوں نے بھی کی اتباع  
 جیسے وہ تھے ہو گئے ویسے ہی بھراں کے بلیں  
 شاعری جنگی جہاں کے واسطے پیغام ہے  
 کیونکہ داخل شعر میں ہرگز نہیں ہو مرنیہ  
 شعر ظاہر میں لیکن شعر میں شامل نہیں  
 بھر بھی وہ رنگ تغزل کی نہیں جلوہ گری  
 اور یہ گھوڑے کی روانی صورت برق تپاں  
 ہونے کو سب کچھ ہیں، لیکن ہن تغزل ہے جدا  
 سب کے سب تھے ایک ہی دام تعلق میں اسیر  
 نالہ بکار لاکھوں ہں اترا کچھ بھی نہیں

ایک کے ہاتھوں سے ہے دامانِ نہیں تار تار  
ایک نے نو چاچنوں میں جا کے دامانِ سحر  
ایک نے ڈھونڈ ہی کر لیکس کہیں پائی نہیں  
ایک کے ہاتھوں سے چھوٹا تو سن مگر دواں  
ایک نے دشتِ جنوں میں خاکِ لڑائی عمر بھر  
قعدہ کو نہ رنگ دیا بھر کا یکساں ہی رہا  
رفتہ رفتہ آگیا دنیا میں بھر دورِ صفتی  
تھے معاصران کے مرزا نقاب و آبر و ہتار  
باہمی کرتے تھے بل کر یہ ایجا سخن  
اول اول ان کا بھی لیکن قدیمی رنگ تھا  
نکتہ دانوں کے لئے وہ ایک سیدھی راہ تھی  
تھی وہی بھر مار دُور از عقل تشبیہات کی  
تھا وہی بادام کی صورت میں آنکھوں کا ظہور  
رفتہ رفتہ جب خرابی اس کی دکھلائی گئی  
چاہئے اب منعقد کرنا ہمیں اک انجمن  
اب قدیمی رنگ میں لازم ہے کچھ قطع و برید  
رنگِ تازہ کا نہیں ہے آجکل کچھ دل نہیں  
جادو غالب پر رکھنا چاہئے، ہم کو تدم  
الغرض قائم ہوئی اس وقت بعد سعی تمام  
اک طرف ناظم، صفتی، اور اک طرف محشر عزیز  
اس میں شدت بھی تھی، عالم بھی تھے اور فاضل بھی تھے  
مل کے ان سب نے کیا تبدیل رنگِ شاعری  
جب نہ ان سے ہو سکے مضمون غالب سے ہم  
جانکنی کے سب کے سب سامانِ ہم ہونے لگے  
نیک کی اینٹھی رگیں یعنی تشبیح ہو گیا

ایک کس قاتلوں میں ہو گیا جا کر شکار  
ایک تربت بر ہوا مجنوں کی جا کر نوحہ گر  
ایک مفلس ہو گیا ہے گھر میں اک پائی نہیں  
دوسرے نے نقدِ جاں دے کر کیا سودا گراں  
ایک نے سیلابِ گریہ سے بہایا اپنا گھر  
خمر کا دفتر پریشاں تھا پریشاں ہی رہا  
ان کی شہرت مٹ گئی اور ان کی اب شہرت گئی  
ناצל و نردت، عزیز نکتہ دانِ نامدار  
مخلوں میں خمر کی دیتے رہے دادِ سخن  
لکھنؤ کا بچہ بچہ جس کے اوپر دنگ تھا  
جس میں کچھ کچھ آہ شامل اور کچھ کچھ واہ تھی  
تھی وہی گیسوئے جاناں میں سیاہی لات کی  
تھا وہی عارض کی رنگینی میں پنہاں نورِ طور  
منفق ہو کر یہ ایک تجویز ٹھہرائی گئی،  
جس میں سب آپس کے شامل ہو کے دیں امین  
اب پڑائے غمزوں کے آخر ہیں کب تک شہید  
جو پڑائے بت ہیں وہ قابلِ پرستش کے نہیں  
اس سے ممکن ہے کہ بھر دیا میں عوں شہور ہم  
انجمنِ شعر و سخن کی جس کا تھا معیار نام  
اک طرف آبر و ہتار و ناقب والا تمیز،  
ماسوا ان استیوں کے اور اہل دل بھی تھے  
یعنی ٹھہری مرثیہ کے ساتھ جنگِ شاعری  
آخر شمس سب نے اٹھایا بل کے نوحہ پر قلم  
رفتہ رفتہ موت کے مضمون رقم ہونے لگے  
ایک کا منہ بھر بھرایا اور تہیج ہو گیا

ایک کو رتبانِ اصغر کی شکایت ہو گئی      ایک روئے اس قدر شدت سے وقت ہو گئی  
اُس نے گورستاں میں مُردوں کا کیا جاکر کلام      موت کی پہلی سے آیا دوست کا اس کچ پیام  
الغرض اس وقت سے یہ رنگ جاری ہو گیا      خون بن کر رگ و پے میں یہ ساری ہو گیا  
آج تک سب لہل دل ہیں اس بلا میں مبتلا      شاعری کا وہ کیا اچھا ملا ان کو مسلا  
وہ سراجِ نکتہ داں، اور وہ قدیرِ ذی ہنر      آرتہ و منظورِ آشفقۃ والا گھر،  
سب اسیرِ رنگ و بوئے باغِ پیشینہ ہوئے      سب قیقلِ خنجرِ معشوقِ دیرینہ ہوئے  
آج تک ان کا وہی ہے تار و بودِ شاعری  
شاعری کیوں کہے اُس کو بلکہ کہے "شاعری"

ہوش (لیج آبادی)

## صرفِ پین و پیہ

یا

پانچ روپے پیم ماہوار

میرے والد کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے اور میں مجبور ہوں کہ کسبِ معاش کے لئے خود ہاتھ پاؤں  
بلاؤں — میں نے الہ آباد کے زمانہ نازل اسکول میں داخلہ کا انتظام کر لیا ہے جس کا سشن یکم جولائی  
سے شروع ہوتا ہے اور گیارہ مہینے میں ختم ہو جاتا ہے  
میں اپنے بے شمار بھائیوں اور بہنوں سے اپیل کرتی ہوں کہ یا تو گیارہ ماہ کے لئے ایک مہنتِ مضاعفہ  
کی امداد فرمادیں یا پانچ روپے ماہوار کا وظیفہ مرحمت فرمادیں  
میں وعدہ کرتی ہوں کہ ملازمت کے بعد جس کا ملنا یقینی ہے۔ بہت جلد اس رستم کو واپس  
کردوں گی

الف۔ جمیم۔ ذریعہ دفتر نگار۔ لکھنؤ

# کلام اختر

ہیں وہی صبر آزمائے سرو سامانیاں      مسک نہ سکیں عمر بھر میری پریشانیاں  
طاہر مجروح ہوں، میرے لئے وقت ہیں      روح کی بیچینیاں، دل کی پریشانیاں  
نزع کی طاری ہے گو مستقل اک کیفیت      سانس نہیں ٹوٹتا، اُف لئے گراںیاں  
درد دوا ہو گیا عشق میں پایاں کار      راز سکوں بنگلیں، غم کی فراوانیاں  
میری نظر میں نہاں روح کی افسردگی      میری جبین پر عیاں قلب کی ویرانیاں  
کاش کبھی باسکیں راز سے بے خودی      عقل کی بے راہیاں، ہوش کی نادانیاں  
دوب چکی نبض دل، درد نہ کم ہو سکا      آج بھی اشکوں کی ہیں ویسی ہی طغیانیاں  
دل بے ترا آئینہ، دل سے نگاہوں کو ربط      تیری تنہا کا راز ہیں مری حیرانیاں  
اختر ناکام ہے اور وہی ہمت شکن      درد کی جانکاہیاں، غم کی فراوانیاں

میری مغل نہ ہوئی دہریں آساں کوئی      نہ بلا آہ، مرے درد کا درماں کوئی  
سوچتا ہوں کہ بایں غفلت و مجبوری باس      زندگی ہے مری یا خواب پریشاں کوئی  
اور کس کام کے ہیں قلب جگر کے ٹکڑے      زیب داماں ہو کوئی، زینت مڑگاں کوئی  
جان کیوں تن سے نکلے ہوئے گھیراتی ہے      عیشِ سرمد تو نہیں، عمر گر بڑاں کوئی  
لاکھ لبریز مئے رنگ ہو مینائے بہار !      دل میں بھٹتا ہے شرعِ نسیم پہناں کوئی  
ٹوٹتے ہیں کہیں بے مے بھی حجاباتِ نظر      مل چکا شہنشاہ ! تجھے رُتبہ عرفاں کوئی  
الاماں سوزِ محبت کہ یہ عالم کب تک !      جیسے ہو دل میں نہاں شعلہ لرزاں کوئی  
وقت پر آنے سکے، اور جب آئے نہ رُمکے      زندگانی پہ نہیں موت کا احساں کوئی

میں رہا صرف شبِ وادی وشتِ اختر

اختر (حیدر آباد دکن)

میرے عالم میں نہ تھی صبحِ گلستاں کوئی

# اشک بیتاب

جب پس کسا چھپ جاتا ہے مہر تیز گام اور سنہری بال بھراے ہوئے آتی ہے شام  
بھیر پتی ہے جب الم کے گیت جوئے خوشخرام آہ ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب سرورِ خواب میں مہر بخش ہو جاتا ہے دہر جب ردائے سیم کے دامن میں ہو جاتا ہے دہر  
جب سکوت و خاموشی کی لے میں کھو جاتا ہے دہر آہ ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

چاندنی میں گوبینے ہیں جب حدی خواہوں کے گیت رات کے یا آخری صبح میں ہفتاؤں کے گیت  
بہودی میں جبکہ سنتا ہوں یرد بوانوں کے گیت آہ ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب فضائے آسمان پر گھر کے آتے ہیں سحاب بجلیوں کی کوند میں ہوتا ہے بہیم اضطراب  
یاد آتے ہو مجھے تم اور وہ عابدِ شباب آہ ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

آم کا وہ پیر پڑ جو ہے بر لبِ آبِ رواں بچنے میں کھیلے رہتے تھے پہرہوں تک جہاں  
رات کو جب چاندنی میں جا نکلتا ہوں وہاں آہ ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

شیدا



## صدائے دل

آہِ عشق کی ناکامیوں میں مجھوں گم ہوں کہ میں سازِ شکستِ آرزو کا اک ترنم ہوں  
مجھے اب قید و بندِ زندگی سے واسطہ کیا ہو  
ہوئی مدت کہ اپنی روح سے مجھ تکلم ہوں  
حجابِ تیرگی کچھ اس طرح اٹھامے دل سے اُجالا دفتاً پیدا ہو جیسے ماہِ کامل سے  
حقیقت کی تجلی نے کیا ہے روح کو روشن مری ہستی نظر آتی ہے آگے مدِ باطل سے  
فریبِ زندگی سے اب مجھے نسبت نہیں کوئی  
نکل آیا ہوں آگے ہستی فانی کی منزل سے  
حقیقت کی طلب کرتی رہی بید حزنیں مجھ کو ملی تسکین کیں مجھ کو نہ چین آبا کیں مجھ کو  
حیات و موت کی تھی کشمکش اور روح گریباں تھی حقیقت خود ہی آئی دیکھ کر اندواگیں مجھ کو  
اب اپنی روح سے اکثر کیا کرتا ہوں میں باتیں  
کہ جیسے ہستی فانی سے مطلب ہی نہیں مجھ کو

نبی احمد دریلوی

## مطالبات

نگاہِ محبت فرا چاہتا ہوں مسافر ہوں اک ہٹا چاہتا ہوں  
تجلی نظر آٹھنا چاہتا ہوں تجھے جلوہ گرد دیکھنا چاہتا ہوں  
ابھی خام ہے کچھ، مذاقِ تمنا کر مہائے صبر آدما چاہتا ہوں  
مجھے کوئی کافر سلمان کرے مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں  
دلادے کوئی یاد، بھولا ہوں کسکو بتائے کوئی، ہائے کیا چاہتا ہوں  
خیردار ہے کون دنیا میں دل کا کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں  
خطا پرندامت خطا در خطا ہے خطا کر کے دادِ خطا چاہتا ہوں  
کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں  
ہوس چاہتی ہے تجلی تیریاں مگر میں نگاہِ رسا چاہتا ہوں  
جو قید مجاز و حقیقت اٹھا دے وہ کیفیتِ دل کتنا چاہتا ہوں

تمنائے دل اور محدود! کو کتب

کو کتب (شاہجہانپوری)

مقام و را، الور چاہتا ہوں

# آئندہ جنوری ۱۳۵۶ء کے رسالہ نگار کیلئے

## مخصوص علمی و ادبی دعوت

مکرمی - تسلیم -

یہ حقیقت غالباً جناب سے مخفی نہ ہوگی کہ گزشتہ چند سال سے نگار کا جنوری نمبر کسی یکمی مخصوص موضوع کے

وقف ہوتا ہے چنانچہ اس وقت تک مومن نمبر، نظر نمبر اور غالب نمبر شائع ہو کر ملک میں کافی مقبول ہو چکے ہیں جنوری ۱۳۵۶ء کے نگار کو میں لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کی تنقید کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں۔ اور متمنی ہوں کہ آپ بھی قہوراً وقت نکال کر اس خدمت میں میری اعانت فرمائے۔ اور اگر رحمت نہ ہو تو ابھی سے مطلع فرما دیجئے کہ آپ کس مخصوص پر اپنا مقالہ بت فرمائیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی استدعا ہے کہ اپنے افکار عالیہ کے ہمراہ اپنا فوٹو یا بلاک اگر ہو تو وہ، مرحمت فرمائیں تاکہ مقالہ ساتھ وہ بھی شائع کیا جائے۔ آپ کے ایماء کے بعد آپ کا اہم گرامی عام اطلاع کے لئے نگار میں شائع کر دیا جائے گا ذیل میں مختلف مباحث کی فہرست آپ کو نظر آئے گی، لیکن ہر موضوع سے متعلق آپ کسی اور مسئلہ پر تحریر فرمنا چاہیں تو لو اختیار کئی حاصل ہے، لیکن بہتر ہو اگر عنوان سے آپ آگاہ فرمادیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مضمون طویل ہو، لیکن جتنا ہو بہتر بنی لحاظ فرصت کا نتیجہ فکر ہونا چاہئے

خاتم

نیاز فتحپوری

## عنوانات جن پر مقالے درکار ہیں

- (۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر مورخانہ نظر اور ادبی خصوصیات
- (۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج
- (۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ
- (۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر
- (۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر
- (۶) دونوں اسکولوں کی غزل گوئی پر تفصیلی تبصرہ
- (۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
- (۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
- (۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں
- (۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں
- (۱۱) دکن اور اردو شاعری (اس وقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
- (۱۲) پنجاب اور اردو شاعری (اس وقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
- (۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کے خدمات
- (۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات، مرثیہ، قصیدہ، نعتیں
- (۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر
- (۱۶) شان ادوہ اور لکھنوی شاعری
- (۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر
- (۱۸) شاعری۔ محاظ سے لکھنؤ کا دور زرتیں
- (۱۹) شاعری کے محاظ سے دہلی کا دور زرتیں
- (۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے دہلی کا متبع کیا
- (۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا متبع کیا
- (۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعرا جنہوں نے ملک قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا
- (۲۳) کیا دہلی اسکول رو بہ انحطاط ہے اور کیوں
- (۲۴) کیا لکھنؤ اسکول رو بہ انحطاط ہے ؟ اور کیوں
- (۲۵) نام پور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے
- (۲۶) حیدر آباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق
- (۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا ؟
- (۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے ؟ اگر ہے تو کیا
- (۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے ؟ اگر ہے تو کیا
- (۳۰) مستقبل میں آپ کو اردو شاعری سے کیا توقعات ہیں ؟
- (۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعرا جنہوں نے قدامت کو ترک کر کے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا
- (۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے۔ یختی اور ہزل گو
- (۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنہوں نے شاعری میں نیا ر حصہ لیا
- (۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
- (۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
- (۳۶) اگر وہ دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ :- لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعرا ہیں۔ جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے

